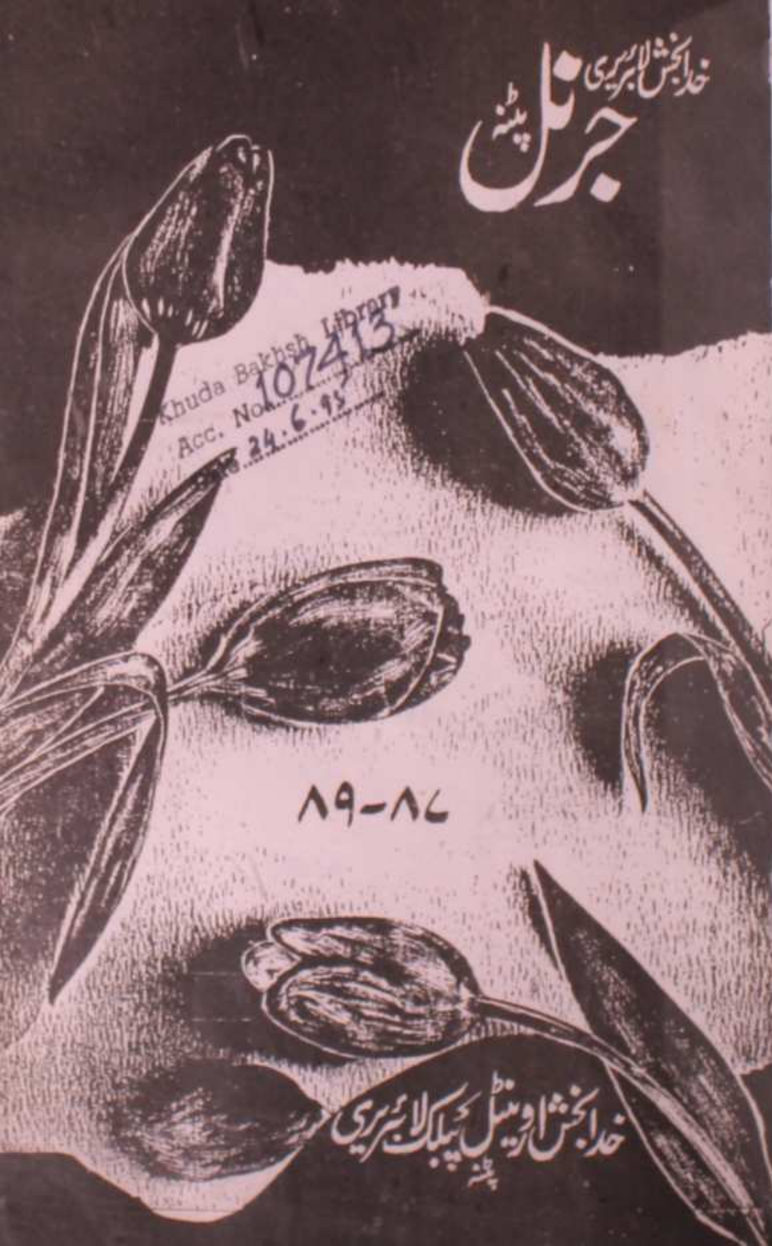
خدا بخش لائبریری

جرنل

۸۷ — ۸۹

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

خدابخش لائبریری جرنل پٹنہ



۸۷-۸۹

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

رجسٹریشن نمبر: ۲۲۴۲۴/۷۷

شمارہ: ستاسی تا نواسی

سالانہ: ۳۰۰ روپے

۶۰ ڈالر ایشیا، ۱۲۰ ڈالر دیگر ممالک

اس شمارہ کی قیمت پچھتر روپے

۱۹۹۴ء

مصطفیٰ کمال ہاشمی نے لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دہلی میں چھپوا کر خدا بخش لائبریری، پٹنہ سے شائع کیا

فہرست

جلیل مانکپوری

کے

چند قصیدے

مرتبہ

جناب علی احمد جلیلی

مقدمہ

اردو زبان کو پروان چڑھانے میں شاہوں اور شاہی دربار نے جو حصّہ لیا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سخنور سلاطین نے نہ صرف اپنی شاعری اور شعری تخلیقات سے زبان کی خدمت کی بلکہ اپنے دور کے شاعروں کی سرپرستی بھی کی اور جن شاعروں کو اپنا استاد بنایا، اپنے دربار میں جگہ دی انھوں نے اپنے محسن بادشاہوں اور امرائے دولت کی تعریف و تحسین میں جو کچھ لکھا وہ اردو کلاسکس کا بڑا سرمایہ ہیں۔

یہ سلسلہ دکن کے قطب شاہی سلاطین سے شروع ہو کر شاہانِ مغلیہ نوابانِ اودھ، تاجداران رامپور اور نواب میر عثمان علی خاں کے دربار پر ختم ہوتا ہے۔ بقول مولانا سلیمان ندوی :

"ہنرور شاعر اور ہنر پرور بادشاہ میں جو تلازم عہد عباسیہ سے شروع ہوا تھا اس کو حضرت جلیل اور میر عثمان علی خاں پر اب تمام سمجھیے۔"

فصاحت جنگ جلیل مانکپوری اپنے دور کے بہت بڑے غزل گو تھے مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ ایک باکمال قصیدہ گو بھی تھے۔ جلیل نے دو حکمرانوں میر محبوب علی خاں آصف اور میر عثمان علی خاں والیان دکن کے دور کو دیکھا اور دونوں بادشاہوں کے استاد رہے جیسا کہ شاہ عثمان کے ایک فرمان سے ظاہر ہوتا ہے۔

"فصاحت جنگ جلیل میرے استاد ہیں جن کو میں فی زمانہ امام الفن سمجھتا ہوں۔ ان سے میرے والد مرحوم نے بھی اصلاح لی تھی بعد وفات فصیح الملک داغ دہلوی۔"

استاد شاہ بننے سے پہلے ہی جلیل مانکپوری کی قصیدہ گوئی کا آغاز ہو چکا تھا۔ ۱۳۱۸ھ میں جب امیر مینائی نے حیدر آباد کا قصد کیا تو ان کے ہمراہ ان کے فرزند لطیف احمد اختر مینائی اور جلیل حسن جلیل بھی تھے۔ جناب امیر نے قبلاً ایک گلدستہ بنام "سنظم امیری" میر محبوب علی خاں آصف کو پیش کرنے کے لیے مرتب کیا تھا۔ جو امیر، اختر اور جلیل کے تین مدحیہ قصیدوں پر مشتمل تھا۔ اسے جلیل کا پہلا قصیدہ سمجھنا چاہیے:

آنکھوں میں آج اک صنم خوش جمال ہے — کس سے مثال دوں کہ عدیم المثال ہے

۱۳۲۳ھ میں شاہ آصف کے جشن جوبلی کے موقع پہ مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد نے ایک قصیدہ کی محفل کا اہتمام کیا تھا۔ اس مشاعرہ میں مولانا حالی بھی موجود تھے اور خود اعلیحضرت رونق افروز تھے۔ اس مشاعرہ میں جلیل نے بڑے شان کا قصیدہ پیش کیا:

جشن شاہی میں عجب رنگ اچھلتے دیکھا　　　ساغر عیش کو بے پاؤں کے چلتے دیکھا

اس جشن کے سلسلے میں بعد ازاں ایک اور قصیدہ بھی موزوں کیا گیا:

مزے کی آج جشن آصفی میں مدح خوانی ہے　　　اِدھر ہے گلفشانی ہے اُدھر سے زرفشانی ہے

یہ زمانہ جلیل کی امیدواری کا زمانہ تھا کیونکہ جناب داغ کا انتقال ہو چکا تھا اور شاہ آصف کو اپنے لیے کسی استاد سخن کا انتخاب کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جلیل نے یکے بعد دیگرے کئی قصائد موزوں کیے:

کوئی شاہ دکن کا آج ہمتا ہو نہیں سکتا　　　یہ شوکت ہو نہیں سکتی یہ شہرا ہو نہیں سکتا

۱۳۲۶ھ میں جناب جلیل نے اپنی پہلی ادبی تصنیف تذکیر و تانیث گزرانی تو شاہ آصف نے کتاب کو ملاحظہ فرما کر یہ مصرع ارشاد فرمایا:

جلیل القدر ہو صاحب تمہاری بات کیا کہنا

اس لقب کی سرفرازی پر جلیل نے اسی زمین میں ایک طویل قصیدہ لکھ کر گزرانا:

جلیل القدر ہو صاحب تمہاری بات کیا کہنا　　　یہ وہ مصرع ہے جس پر چاہیے صد مرحبا کہنا

اسی زمانے کا ایک اور قابل ذکر قصیدہ دربار دہلی کے موقع پر کہا گیا جب جناب جلیل ملک معظم ایڈورڈ ہفتم کے دربار تاجپوشی کے جشن میں شرکت کے لیے مہاراجہ شاد کی سرپرستی میں شاہی اسٹاف کے ساتھ دہلی گئے تھے۔ اس طویل قصیدہ کا آغاز یوں ہوتا ہے:

دے رہی ہے کیا مزہ آنکھوں میں نیند آئی ہوئی　　　واہ رے ہم وہ بے پے مستی سی ہے چھائی ہوئی

۱۳۲۷ھ سے حقیقی درباری شاعری کا آغاز ہوتا ہے جب شاہ آصف نے ایک فرمان کے ذریعہ جلیل حسن جلیل کو اپنے مصاحبین میں داخل کیا اور استاد شاہ کا منصب عطا کیا:

اس سرفرازی کے موقع پر جلیل نے وہ زبردست قصیدہ پیش کیا جو قصائد کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے:

جو دن پھرتے ہیں تو سامان پیدا ہو ہی جاتا ہے　　　شب غم لاکھ طولانی ہو تڑکا ہو ہی جاتا ہے

حضرت جلیل کی قصیدہ نگاری کا پہلا دور یہاں ختم ہوتا ہے کیونکہ ۱۳۲۹ھ میں جب شاہ آصف نے رحلت فرمائی اور نواب میر عثمان علی خاں تخت نشین ہوئے تو انھوں نے بھی جلیل کے منصب استادی کو اسی طرح برقرار رکھا۔

تخت نشینی کے موقع پر جلیل نے آصف سابع شاہ عثمان کی بارگاہ میں اپنا پہلا قصیدہ گزرانا۔

بزم عشرت میں نئے رنگ کا ساماں دیکھا　　حالتِ وجد میں ساغر کو بھی رقصاں دیکھا

اس کے ساتھ ہی ایک اور مدحیہ قصیدہ موزوں کیا گیا۔

مدح گوئی فخر ہے طبع رسا کے واسطے　　دل دعا کے واسطے، لب ہیں ثنا کے واسطے

۱۹۱۱ء میں ملک معظم جارج پنجم کے جشن تاجپوشی کا دربار دہلی میں منعقد ہوا تو شاہی اسٹاف کے ساتھ جلیل بھی دہلی گئے۔ اس موقع پر "دربارِ دربار" کے نام سے ایک طویل قصیدہ لکھا۔

غلغلہ آج ہے دربار کا دنیا بھر میں　　یہی چرچا ہے زباں پر یہی سودا سر میں

بعد میں ان قصائد کی جگہ قطعاتِ تہنیت نے لے لی۔ اُن کے اشعار کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ قصائد کے اس مجموعے کے آخر میں یہ دیکھے جا سکتے ہیں۔ انھیں مختصر قصیدہ کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

ان قصائد پر بحیثیت مجموعی جب ہم تنقیدی نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں جلیل نے روایتی طور پر اپنی قصیدہ نگاری کا اسلوب وہی رکھا جو اساتذۂ سخن کا تھا لیکن ان میں اجتہاد سے بھی کام لیا۔ لوازمات قصیدہ کی پابندی ملتی ہے۔ تشبیب کے موضوعات عام رواج کے مطابق موسم بہار، وارداتِ حسن و عشق، خواب کا بیان اور آمد صبح و شام وغیرہ ہیں۔ گریز کے لیے کہیں ایک شعر اور کہیں ایک سے زیادہ اشعار استعمال کیے ہیں۔ مدح میں حسب توقعات ممدوح کے رتبہ کی مناسبت سے جاہ و حشم، مال و دولت، عدل و انصاف، جود و سخا اور خلق و مروت کے اوصاف کو جگہ دی ہے جس کا اختتام دعائیہ اشعار پر ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک قصیدہ کے کچھ اشعار اختصار کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں۔ اس قصیدہ کی تشبیب کا آغاز وارداتِ حسن و عشق سے ہوتا ہے۔ ان لوازمات کی پابندی کے باوجود اجتہاد یہ ہے کہ تفصیلات و جزئیات سے گریز کیا ہے۔

تشبیب۔ آنکھوں میں آج اک صنم خوش جمال ہے　　کس سے مثال دوں کہ عدیم المثال ہے

صانع کی یاد آتی ہے صنعت کو دیکھ کر　　اللہ کیا جمال ہے، کیا خط و خال ہے

ہے وہ گلاب جس سے تراوت نگاہ میں　　ہے وہ نہال جس سے کلیجا نہال ہے

زلفوں کے دام پر تو ہے صیاد کا گماں — آنکھیں یہ کہتی ہیں کوئی رعنا غزال ہے
اس سادگی پہ لاکھ تکلف نثار ہوں — مہندی نہیں لگائی مگر ہاتھ لال ہے
گریز۔ تو کون ہے خدا کے لیے اے بتِ حسیں — جاتے رہے حواس یہ کیسا جمال ہے
جنت کی حور ہے کہ پرستان کی پری — سچ سچ بتا تجھے قسمِ ذوالجلال ہے
نام و نشاں سے تیرے مجھے بھی ہو آگہی — خواہش مری یہی ہے یہی دل کا سوال ہے
دیکھا جو اضطراب مرا اس نے یہ کہا — اتنی سی بات کے لیے تیرا یہ حال ہے
میں سلطنت ہوں اس شہِ گردوں سریر کی — جو نیرِ منورِ اوجِ کمال ہے
باغِ دکن میں جلوہ نما وہ بہارِ عیش — باغِ سخن میں طوطیٔ شیریں مقال ہے
محبوب ہے علی کا وہ مطلوب جان و دل — ظلِ خدائے ذوالکرم و ذوالجلال ہے
مدح۔ تیرا جلال شان جمالی لیے ہوئے — تیرا جمال تیری جلالت پہ دال ہے
عادل وہ ہے کہ آب و ہوا میں ہے اعتدال — باذل وہ ہے کہ داد و دہش لاجواب ہے
دکھلا رہی ہے شان تری بندہ پروری — اک دل ہے اور سارے جہاں کا خیال ہے
وصفِ حضور کیا ہو رقم کیا بیاں ہو — خامہ مرا قلم ہے زباں میری لال ہے
دعا۔ افزوں ہو عمر و جاہ، بڑھے حشمت و سپاہ — جب تک شمارِ روز و شب و ماہ و سال ہے

آخری دور کے قصائد میں یہ پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ قصیدے بغیر تمہید کے راست مدحیہ اشعار سے شروع ہونے لگے۔ مثلاً

کوئی شاہِ دکن کا آج ہمتا ہو نہیں سکتا — یہ شوکت ہو نہیں سکتی یہ شہرا ہو نہیں سکتا
خدا شاہد حکومت شاہ کی ہے کشورِ دل میں — یہ وہ رتبہ ہے جس سے بڑھ کے رتبا ہو نہیں سکتا
شہِ والا کے ہیں احسان اتنے جاں نثاروں پر — کہ سر بھی نذر دے کر کوئی ہلکا ہو نہیں سکتا

یا ایک اور قصیدہ یوں شروع ہوتا ہے:

مدح گوئی فخر ہے طبعِ رسا کے واسطے — دل دعا کے واسطے لب ہیں ثنا کے واسطے
کون وہ بحرِ عطا، کانِ سخا، حاجت روا — جو خدا کا فضل ہے خلقِ خدا کے واسطے
میر عثمان علی خاں خسروِ ملکِ دکن — مایۂ ناز و طرب ارض و سما کے واسطے

دوسرے الفاظ میں تمہیدی قصیدوں کی جگہ خطابیہ قصیدوں نے لے لی۔

بحیثیت مجموعی حضرت جلیل نے اجتہاد سے کام لے کر روایتی انداز کو بدلا۔ بلاغت کی جگہ سادگی و صفائی نے لے لی۔ انھوں نے نہ تو اپنی علمیت کا اظہار کیا، نہ صنعت گری کی، نہ مختلف علوم کی اصطلاحات کو اپنے قصیدوں میں سمویا، تاہم مضمون آفرینی اور نازک خیالی کے دامن کو نہیں چھوڑا۔ انھوں نے قصیدہ نگاری کی خاطر شعریت کا خون نہیں کیا بلکہ قصیدہ نگاری میں شعریت کو داخل کیا۔ یہ قصائد تغزل اور قصیدہ کا ایک ایسا سنگم ہیں جہاں طویل قصائد کی بوریت خوشگوار شعریت میں ڈھل جاتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ درباری رنگ بھی یہی تھا۔

ان قصائد کے مسودات والد مرحوم کے چھوڑے ہوئے ذخیرہ میں جا بجا بکھرے پڑے تھے۔ میں نے ان کو سنہ وار ترتیب دے کر یکجا کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے ایک دو قصائد اس دور کے جرائد میں چھپے ہوں لیکن ان معنوں میں غیر مطبوعہ ہیں کہ پہلی مرتبہ مجموعۂ قصائد کی صورت میں منظر عام پر آرہے ہیں۔

علی احمد جلیلی

در مدح اعلیٰحضرت میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس سُلطانِ دکن

آنکھوں میں آج اک صنمِ خوش جمال ہے — کیسے مثال دوں کہ عدیم المثال ہے
صانع کی یاد آتی ہے صنعت کو دیکھ کر — اللہ کیا جمال ہے کیا خط و خال ہے
ہے وہ گلاب جس سے تراوٹ نگاہ میں — ہے وہ نہال جس سے کلیجا نہال ہے
زلفوں کے دام پر تو ہے صیاد کا گمان — آنکھیں یہ کہتی ہیں کوئی رعنا غزال ہے
پانی میں جیسے پھول کنول کا کھلا ہوا — یوں دیدۂ پرآب میں وہ نونہال ہے
معشوق پن لیے ہوئے شرمیلی چتونیں — دل جس پہ لوٹ پوٹ ہو وہ چال ڈھال ہے
آنکھوں کے ڈورے دیکھیے پھندے بلا کے ہیں — قدرت کا جال ہے یہ محبت کا جال ہے
اس سادگی پہ لاکھ تکلف نثار ہوں — مہندی نہیں لگائی مگر ہاتھ لال ہے
بڑھ بڑھ کے کہ رہا ہے یہ عالم شباب کا — بچپن سے مجھ کو حسن میں حاصل کمال ہے
کیا چودھویں کا چاند کرے گا برابری — دو روز میں ہلال کا پھر وہ ہلال ہے
قدرت خدا کی ایک کلی سے چمن کھلے — جھڑتے ہیں پھول منھ سے عجب بول چال ہے
آنکھیں لڑا کے ہم تو مصیبت میں پڑ گئے — پلکوں کی ہر زبان پہ دل کا سوال ہے
تو کون ہے خدا کے لیے اے بتِ حسیں — جاتے رہے حواس یہ کیسا جمال ہے
جنت کی حور ہے کہ پرستان کی پری — سچ مچ بتا تجھے قسمِ ذوالجلال ہے
یہ نازِ دلفریب یہ اندازِ دلربا — تیری ثنا بشر سے ادا ہو محال ہے
نام و نشاں سے تیرے مجھے بھی ہو آگہی — خواہش یہی مری یہی میرا سوال ہے
دیکھا جو اضطراب مرا اس نے یہ کہا — اتنی سی بات کے لیے تیرا یہ حال ہے
آگاہ ہو کہ میں نہ پری ہوں نہ حور ہوں — بیجا ہے یہ گمان غلط احتمال ہے

کہتے ہیں جس کو حور وہ ہے اک ادا مری — جس کا پری ہے نام مری ایک چال ہے
میں سلطنت ہوں اس شہِ گردوں سریر کی — جو نیّرِ منورِ اوجِ کمال ہے
سلطان شیر صولت و خاقان کجکلاہ — جمشید اقتدار و سلیماں جلال ہے
عنوانِ سروری و نشانِ دلاوری — ابرِ کرم ہے خسرو دریا نوال ہے
رفعت میں آسمان، شرافت میں آفتاب — صورت جو اس کی دیکھیے یوسف جمال ہے
دیباچہ مروت و سرِ دفترِ وقار — پایا ہے وہ مزاج کہ قدسی خصال ہے
فہم و ذکا میں کہتے ہیں لقماں صفت اسے — جود و سخا میں آپ ہی اپنی مثال ہے
باغِ دکن میں جلوہ نما وہ بہارِ عیش — باغِ سخن میں طوطیِ شیریں مقال ہے
محبوب ہے علی کا وہ مطلوب جان و دل — ظلِ خدائے ذو الکرم ذو الجلال ہے
آصف لقب ہے اس شہِ والا شکوہ کا — فیاض ہے، کریم ہے، عالی خیال ہے
نامِ حضور سن کے مجھے وجد آگیا — مطلع کہا جو ہدیۂ اربابِ حال ہے

مطلع

ساقی پیے بغیر مرا غیر حال ہے — اب کیوں ہے کال مے کا ارے برشگال ہے
فتویٰ دیا ہے مفتیِ ابرِ بہار نے — توبہ کا خون بادہ کشوں کو حلال ہے
کیا لطف دے رہا ہے یہ برسات کا سماں — کالی گھٹا ہے اس پہ دھنک لال لال ہے
سبزے کا فرش چار طرف ہے بچھا ہوا — مرغِ نگاہ کے لیے یہ سبز جال ہے
عکسِ شفق سے ابر کا عالم نہ پوچھیے — گویا صنم کے ہوئے منہ پہ گلال ہے
نکلے ہیں سبزہ روند کے گل پیرہن حسیں — کوئی ہے مہ لقا کوئی زہرہ جمال ہے
تولے ہوئے ہے تیغِ ادا کوئی حور زاد — کھولے ہوئے پری کوئی چوٹی کے بال ہے
تانیں جو لے رہے ہیں جوانانِ خوش گلو — پہلو میں اپنے دل کا ٹھہرنا محال ہے
چھیڑے ہوئے ملار کوئی ہے کوئی بہار — لب پر کسی کے یہ غزلِ بے مثال ہے

غزل

دیدار کی ہوس ہے نہ شوقِ وصال ہے — آزاد ہر خیال سے مست خیال ہے

جائے کبھی نہ دل سے وہ تیرا خیال ہے — آئے کبھی نہ دل میں وہ تیری مثال ہے
رسوائیوں کے خوف سے جینا وبال ہے — اپنا نہیں خیال تمہارا خیال ہے
تم خود نہ ہو اسیر کہیں مجھ کو پھانس کر — دل میں سما کے دل سے نکلنا محال ہے
کہدو یہ کوہکن سے کہ مرنا نہیں کمال — مر مر کے ہجرِ یار میں جینا کمال ہے
آنکھیں بتا رہی ہیں کہ جاگے ہو رات کو — ان ساغروں میں بوئے شرابِ وصال ہے
کیونکر نباہ تجھ سے ہو اے دشمن آشنا — تیرا خیال کچھ ہے مرا کچھ خیال ہے
یہ اشک خون نہیں جو ٹپکتے ہیں آنکھ سے — کچھ ماجرا جگر کا ہے کچھ دل کا حال ہے
رحمت کا جس نے حشر میں دریا بہا دیا — وہ ایک قطرۂ عرقِ انفعال ہے
ان گلرخوں سے مل کے ہوا کون سرخرو — ہم ہاتھ مل رہے ہیں حنا پائمال ہے
برساؤ مجھ پہ تیر مگر اتنا جان لو — پہلو میں دل ہے دل میں تمہارا خیال ہے
تم کو اٹھا کے رکھ لوں کلیجہ میں آنکھ میں — لیکن تمہارے ناز اٹھانا محال ہے
پھندوں میں وہ پھنسا گئی دیگر زبانِ وصل — اک دل ہے اور لاکھ طرح کا خیال ہے
بنتے ہیں اپنے منھ سے مسیحا بنا کریں — روشن ہے خلق پر جو مریضوں کا حال ہے
دنیا کی کیا خبر مجھے اپنی خبر نہیں — یہ بھی کمال ہے کہ تمہارا خیال ہے
میں دامنِ نیاز میں اشکِ چکیدہ ہوں — کوئی اٹھا کے دیکھ لے اٹھنا محال ہے
اچھا ہوا رقیب کو تم چاہنے لگے — اب جان لو گے خود مرے دل کا جو حال ہے
بت کہدیا جو میں نے تو اب بولتے نہیں — اتنی سی بات کا تمہیں اتنا ملال ہے
حاجت سوال کی نہیں مشتاقِ وصل کو — تم دیکھ لو فقیر کی صورت سوال ہے
کیا بیخودی ہے وصل میں قربان جائیے — اتنا نہیں خیال کہ کس کا خیال ہے
مدح حضور سے ہوئی شہرت جلیلؔ کی — کہتے ہیں سب کہ شاعرِ عالی خیال ہے
ساقی خدا کے واسطے لا جام جلد لا — یہ سین ہو جو سامنے تقوی محال ہے
اب سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں رہا — اک اک گھڑی مرے لیے ایک ایک سال ہے
ہوتی ہے لاگ آگ سے بڑھ کر خدا بچائے — دل کی لگی ہے ایسی کہ بچنا محال ہے

کیوں کر نہ مجھے گی دل کی لگی بے پیے ہوئے
ہاں جلد دے ڈھلے کہ طبیعت نڈھال ہے

مجھ کو پلا وہ بادۂ بے دُرد ساقیا
دھو جائے صاف دل میں جو گرد ملال ہے

فکرِ وطن سے چھوٹ کے فکرِ سخن کروں
مدحِ شہِ نظام کا مجھ کو خیال ہے

کہہ کر پڑھوں وہ نور کا مطلع حضور میں
سنکر کہیں سب اہلِ سخن بے مثال ہے

مطلع

شاہا ریاض دہر میں تو وہ نہال ہے
سائے میں جس کے سارا زمانہ نہال ہے

اچھا کیا ہے نرگسِ بیمار کا علاج
سنبھلا ہوا مزاج ہے چہرہ بحال ہے

سنبل نے بال کھولے ہیں زینت کے واسطے
افواہ یہ غلط ہے کہ آشفتہ حال ہے

سروِ چمن کو بے ثمری کا گلہ نہیں
وہ تازگی ملی کہ ہمیشہ نہال ہے

اس دور میں خزاں کو جو کھٹکا نہیں رہا
چہرہ گلوں کا جوشِ مسرت سے لال ہے

سبزہ کا ہے یہ حال کہ لاکھوں زبان ہے
تسبیح خوان بارگہِ ذوالجلال ہے

خارِ چمن ہے نوکِ پلک ہے بہار کی
لالے کا داغ روئے گلستاں کا خال ہے

آصف کو ہو نصیب سلیماں کا مرتبہ
دیتا صدا یہ ہدہدِ فرخندہ فال ہے

عمرت دراز باد کہ تیرے وجود سے
جو سال ہے جہان کے لیے نیک سال ہے

تو غمگسار امتِ مرحومۂ رسول
تو جاں نثار احمد و اصحاب و آل ہے

تیرا جلال شانِ جلالی لیے ہوئے
تیرا جمال تیری جلالت پہ دال ہے

گھر گھر ہو جن کا ذکر وہ اوصاف ہیں ترے
جس کو کہیں نہ پائیں وہ تیری مثال ہے

بیمار کے لیے ہے مسیحا تری نظر
مرہم ہے اس کے واسطے جو خستہ حال ہے

سایہ ترا ہے دامنِ رحمت ہر ایک کو
کمبل فقیر کا ہے امیروں کی شال ہے

حاکم کیا ہے جب سے تجھے کردگار نے
ظالم کی ہے پکار کہ جینا وبال ہے

اندازِ عزل و نصب زمانے سے ہے جدا
معزول ہے عتاب ترحم بحال ہے

عادل وہ ہے کہ آب و ہوا میں ہے اعتدال
بازل وہ ہے کہ داد و دہش کا حصول ہے

پھندے ستم کے کٹ گئے مقراضِ عدل سے
صیاد اسیر حلقۂ چشمِ غزال ہے

سب جانتے ہیں مایۂ نازش کمال کو
کامل وہ ہیں حضور کہ نازاں کمال ہے

یاں خلق شاہ نافہ کشا ہے جنوب میں
واں مشک میں بسی ہوئی بادِ شمال ہے

دکھلا رہی ہے شان تری بندہ پروری
اک دل ہے اور سارے جہاں کا خیال ہے

یوں اتحادِ ظاہر و باطن میں چاہیے
جو قال ہے زباں کا وہی دل کا حال ہے

حاسدوں کے دل پہ ہو قبضہ زہے نصیب
دولت وہ ہاتھ آئی ہے وہ لازوال ہے

وصف حضور کیا ہو رقم کیا بیاں ہو
خامہ مرا قلم ہے زباں میری لال ہے

افزوں ہو عز و جاہ بڑھے حشمت و سپاہ
جب تک شمار روز و شب و ماہ و سال ہے

۱۳۱۸ھ

در مدح اعلیٰحضرت میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس سلطانِ دکن

دے رہی ہے کیا مزہ آنکھوں میں نیند آئی ہوئی
واہ رے ہم بے پیے مستی سی ہے چھائی ہوئی

یار ہیں اغیار ہیں سب ہیں مگر اب ہم کہاں
نیند کے ہاتھوں بھری محفل میں تنہائی ہوئی

بند آنکھیں کیا ہوئیں کچھ اور آنکھیں کھل گئیں
ہو کے روشن چشمِ دل چشمِ تماشائی ہوئی

خواب میں ہم دیکھتے کیا ہیں کہ ہے وقتِ سحر
فرش سے تا عرش اک تنویر ہے چھائی ہوئی

پردۂ شب اٹھ رہا ہے بچھ رہا ہے فرشِ نور
دن کی آمد ہے صبا پھرتی ہے اترائی ہوئی

صبح نے چہرے سے اپنے کو الٹ دی ہے نقاب
پر ادا وہ ہے دلہن جیسے ہو شرمائی ہوئی

شکل و صورت زیب و زینت دیکھ کر کہتی ہے خلق
حورِ جنت ہے پری ہے قاف سے آئی ہوئی

سونے والے اٹھے ہیں انگڑائیاں لیتے ہوئے
زلفیں کچھ شانے پہ ہیں کچھ رخ پہ بل کھائی ہوئی

پاؤں کی آہٹ سے کھلتی جاتی ہے غنچوں کی آنکھ
ہے غضب بادِ سحر کی چال اٹھلائی ہوئی

طائرانِ صبح کے دلکش ترانے ہائے ہائے
وقت ٹھنڈا اور پھر آواز گرمائی ہوئی

جھونک کھا کھا کر سنبھلنا شاخِ گل کا بار بار
جس طرح نازک کمر سیدھی ہو بل کھائی ہوئی

برگِ گل پہ کیا بھلی لگتی ہیں بوندیں اوس کی
موتیوں سے دامنِ گلشن کی زیبائی ہوئی

گدگدایا ہے کسی نے پیاری کلیوں کو ابھی
کہہ رہی ہے صاف ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی

آمد آمد شاہِ خاور کی ہوئی غل مچ گیا
آنکھ سب کی محوِ رنگِ چرخِ مینائی ہوئی

چشمِ بد دور آج تو کچھ اور ہی سامان ہے
یہ نئی صورت نرالی جلوہ آرائی ہوئی

روز تو تنہا نکلتا تھا فلک پہ آفتاب
آج شانِ حسن برقِ جانِ تنہائی ہوئی

انجمن کا انجمن لشکر کا لشکر ساتھ ہے
شور عالم میں ہے ابھی عالم آرائی ہوئی

سیکڑوں روشن ستارے بزم افروز جمال
جن کی شانِ حسن پر قربان رعنائی ہوئی

چودھویں کا چاند بھی ہے اور ماہِ نو بھی ہے
پڑ رہی ہے آنکھ مشتاقوں کی للچائی ہوئی

لو ہوئے صحنِ چمن میں سب کے سب رونق فروز
حبذا کس شان کی دربار آرائی ہوئی

کیسے مل بیٹھے ہیں باہم چاند، تارے، آفتاب
اس سے اِس کی زینت اس سے اُس کی زیبائی ہوئی

شاہِ خاور بیچ میں سارے ستارے اُس پاس
پہلو دریں قمر کی رونق افزائی ہوئی

چاند ہے جس جا اسی جا چاند کا ٹکڑا بھی ہے
نور کے گلشن میں ہے دوہری بہار آئی ہوئی

لیں نگاہوں نے بلائیں خوشنما دربار کی
آنکھیں صدقے، دل فدائی، جان شیدائی ہوئی

یہ سماں پیشِ نظر تھا کھل گئی لیٹے میں آنکھ
ہوش کا آنا تھا بھاگی نیند گھبرائی ہوئی

جاگ کر دیکھا وہی دیکھا تھا جو کچھ خواب میں
جاگی کیونکر دولتِ بیدار ہاتھ آئی ہوئی

صبحدم کا خواب تھا فوراً ہوا اس کا ظہور
دیکھتے ہیں آج عالم میں بہار آئی ہوئی

آسماں دیکھا تھا جس کو وہ زمینِ ہند ہے
جس پہ ہے عیش و مسرت کی گھٹا چھائی ہوئی

انجمن دیکھا تھا جس کو قیصری دربار ہے
جس کے شوقِ دید میں مخلوق سودائی ہوئی

مہر دیکھا تھا جسے ہیں لارڈ کرزن ویسرائے
آج جس سے مسندِ شاہی کی زیبائی ہوئی

بدر دیکھا تھا جنہیں وہ ہیں دکن کے تاجدار
جن کی خاکِ آستاں وقفِ جبیں سائی ہوئی

ماہِ نو دیکھا تھا جن کو ہیں ولیعہد نظام
جن سے جاہ و تمکنت کی عزت افزائی ہوئی

جن کو دیکھا تھا ستارے والیانِ ملک ہیں
ہند میں ان سب کے دم سے ملک آرائی ہوئی

اے جلیلؔ خوش بیاں یہ ہے مقامِ امتحاں
ہاں دکھا اپنی طبیعت جوش پر آئی ہوئی

سنتے تھے بچپن سے یہ فقرہ کہ دلی دور ہے
آج دلی ہے کہ چشم و دل پہ ہے چھائی ہوئی

طبع کو لازم ہے کھل کھیلے کھلے میدان میں
ہاتھ سے جانے نہ پائے بات ہاتھ آئی ہوئی

لطف تو جب ہے کہ لڑ جائے طبیعت اس طرح
بزم آرا کو گماں ہو رزم آرائی ہوئی

ہوں وہی تیغِ زباں کے وار جو رکتے نہیں
ہوں وہی چوٹیں جو ہیں حساد کی کھائی ہوئی

شوخیِ معنی نگاہِ ناز کا عالم دکھائے
لوٹ جائے وہ طبیعت ہو جو تڑپائی ہوئی

فکرِ رنگیں سے کھلے ایسا تر و تازہ چمن
جس چمن میں ہو نہ اک پتی بھی مرجھائی ہوئی

وجد کرتے ہوں عنادل غنچہ و گل دیکھ کر
اور گلچیں کی نظر پڑتی ہو للچائی ہوئی

مطلع

اللہ اللہ ہند میں ہے کیا بہار آئی ہوئی
کھل گئی ہیں وہ بھی کلیاں تھیں جو مرجھائی ہوئی

شاہد گل ہی کی آرائش پہ کیا موقوف ہے
پتی پتی باغ کی محو خود آرائی ہوئی

سن کے جشن تاجپوشی مغتنم ایڈورڈ کا
عید بھی سب سے گلے ملنے کو ہے آئی ہوئی

یہ مرقع نقش دل ہو کر رہے گا یادگار
جس کی ہر شکل آفت جان شکیبائی ہوئی

ذکر برسوں کا یہاں کیا دیکھ لینا عمر بھر
دے گی لذت اس گلستاں کی ہوا کھائی ہوئی

کشور ہند آج نازاں ہو تو نازیبا نہیں
کب کسی اقلیم کو حاصل یہ زیبائی ہوئی

تجھ پہ اے دلی نئے سر سے چڑھا رنگ شباب
ہائے یہ صورت یہ رنگت نکھری نکھرائی ہوئی

ایک عالم ہے کہ آیا ہے وہ آنکھیں سینکنے
تیرے جلوے کی ہے ساری آگ بھڑکائی ہوئی

یہ دلھن آراستہ ہے یا چمن پیراستہ
وہ چمن ہر شاخ جس کی پھول پھل لائی ہوئی

جس طرح سینے میں دل آنکھوں میں تل ہے عزیز
ہند میں دلی کی یوں ہی قدر افزائی ہوئی

کیوں نہ ہو یہ تخت گاہ خسروان ہند ہے
عزت دربار ہے میراث میں آئی ہوئی

وہ زمیں جس پر ہوں محبوب الٰہی کے قدم
ہے بجا گر اپنے جوبن پر ہے اترائی ہوئی

آئیے اب سیر دربار معلّٰے کیجیے
مدتوں سے ہیں نگاہیں ترسی ترسائی ہوئی

لوٹ لیں آنکھیں مزے نظارۂ دربار کے
پھر کہاں پر ہیتی دولت کی گھٹا چھائی ہوئی

کیا سہانا وقت ہے کیا رنگ ہے کیا جشن ہے
اور کچھ کہتی ہے اب دل میں امنگ آئی ہوئی

کچھ غزل خوانی بھی اس موقع پہ ہونی چاہیے
سرد آہ ہونے نہ پائے طبع گرمائی ہوئی

ہو کسی کا شعر ہمکو تو مزے سے کام ہے
مے سے مطلب ہے وہ چاہے جس کی ہو لائی ہوئی

غــزل

کہ رہی ہے حشر میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی
ہائے کیسی اس بھری محفل میں رسوائی ہوئی — امیر مینائی

اک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی — داغ دہلوی

آرزوئے وصل سے ہے اک طرف بیتاب دل
اس طرف فرط حیا سے آنکھ شرمائی ہوئی — جلال بہ شاد

لائی ہے باد صبا شاید پیام وصل یار
کیوں مسرت آج دل پر ہے مرے چھائی ہوئی ۔ ۔

شورِ محشر نے کیا بے چین مجھ کو قبر میں
آنکھ اس دم کھل گئی جب نیند تھی آئی ہوئی — بہار لعل شاد

ہجر کی شب کوئی میرا پوچھنے والا نہ تھا
بیکسی میں میری مونس میری تنہائی ہوئی — ""

وصل کی شب دردِ دل لے شاد دُونا ہو گیا
چارہ سازی یہ ہوئی اور یہ مسیحائی ہوئی — ""

سادگی کی قدر کچھ عہدِ جوانی نے نہ کی
جو امنگ آئی طرفدارِ خود آرائی ہوئی — حسن کاکوروی

گھر گیا غم میں ہمارا دل تو وہ کہنے لگے
قبلہ رخ کیا لطف دیتی ہے گھٹا چھائی ہوئی — ""

میں نہیں قائل کہ تم جاگے کہیں شب بھر مگر
کچھ پتہ کی کہہ رہی ہے آنکھ شرمائی ہوئی — نسیم لکھنوی

پھانس ہوتی ہے دلِ عاشق کی کیا کمبخت یاس
رہ گئی تو جان لی، نکلی تو رسوائی ہوئی — جلال لکھنوی

آئی جب صبحِ شبِ وصلت مقدر نے کہا
رات بھر جاگا ہوں میں اب نیند ہے آئی ہوئی — حکیم خلف کبیر

آئینے میں دیر تک سیرِ بہارِ حسن کی
آنکھ اسکی آپ ہی اپنی تماشائی ہوئی — افضل خلف جگر

اس سے کہتی ہے نزاکت وقتِ آرائش قمر
جان پر یاں بن گئی اچھی خود آرائی ہوئی — قمر خلف امیر

دل شگفتہ ہو تو اختر سیرِ گلشن کیجیے
اک کلی قسمت سے پائی وہ بھی مرجھائی ہوئی — اختر خلف امیر

ہائے کیا جھٹ پٹ قفس میں بال و پر پیدا کیے
جب سنا ہم نے کہ جاتی ہے بہار آئی ہوئی — ریاض خیرآبادی

کہتی ہے شوخی نظر گہری پڑے عشاق پر
شرم سکھلاتی ہے چتون اور شرمائی ہوئی — آہ تلمیذ امیر

کیا غضب ہے آج بھی واعظ وہی ہجو شراب
دیکھ ظالم سبزہ زاروں میں گھٹا چھائی ہوئی — برہم تلمیذ امیر

دفن کرنے اپنے کشتے کو نہ آئے اور کہا
مٹی ہو جائے گی مہندی میری پسوائی ہوئی — وسیم تلمیذ امیر

دل لیے لیتی ہوں میں ہاں مسکرائے جاؤ تم
ان بھووں سے کہتی ہے وہ آنکھ شرمائی ہوئی — عابد تلمیذ امیر

خیر ہو یارب کہیں وہ خود نہ بن جائے رقیب
پڑ رہی ہے آئینہ پر آنکھ للچائی ہوئی — جلیل تلمیذ امیر

والیانِ ملک کے ٹھاٹھ آج دیکھا چاہیے
شان و شوکت بہرِ استقبال ہے آئی ہوئی

کیسے کیسے نیرِ تابندۂ اقبال ہیں
سرزمینِ ہند انھیں سب کی ہے چمکائی ہوئی

دیکھیے وہ ہیں خدا رکھے رئیسِ رامپور
نو عروسِ ارجمندی جن کی شیدائی ہوئی

آپ کا دم یادگارِ حضرتِ خلد آشیاں
آپکے ہاتھوں ریاست اوج پر آئی ہوئی

مرحبا عز و شرف فرمانروائے ٹونک کا
ساتھ رعنائی کے ان پر ختم دانائی ہوئی

حبذا بھوپال کی سرکار کا عز و وقار
ایک ہی ہے یہ ریاست منزلت پائی ہوئی

اے خوشا شان ریاست والیٔ اندور کی
بانکپن کی خاص ادا حصے میں ہے آئی ہوئی

آسماں رفعت مہاراجہ بہادر سندھیا
ان کے بل پہ ہے حکومت آج اترائی ہوئی

اور کتنے راجہ و مہراجہ و نواب ہیں
باعثِ تنویر جن کی جلوہ فرمائی ہوئی

ایک سے ہے ایک اعلیٰ ایک سے ایک آفتاب
جن کے آگے آسماں کی آنکھ شرمائی ہوئی

ہو کہاں تک سب کے اسمائے گرامی کا شمار
طول کا موقع نہیں محفل ہے اکتائی ہوئی

ہاں ذرا اب آنکھ اٹھا کر دیکھیے سوئے دکن
یہ سواری ہے کہ شوکت کی گھٹا چھائی ہوئی

آصفی لشکر کا اللہ رے شکوہ و کر و فر
چشمِ گردوں بھی تحیر سے تماشائی ہوئی

کثرتِ افواج نے باندھی ہے کچھ ایسی ہوا
ہوش اڑتے ہیں ہوا چلتی ہے کترائی ہوئی

حسن ترتیب اور سونے پر (کذا) سہاگہ ہو گیا
موتیوں کی اک لڑی ہے تازہ گندھوائی ہوئی

کون ہیں یہ غالب الملک انتخاب الملک ہیں
اہلِ دانش میں مسلّم ان کی دانائی ہوئی

کون ہیں یہ دیکھو راجہ رائے رایاں ہیں یہی
لائے ان کی مایۂ صد بزم آرائی ہوئی

کون ہیں یہ دیکھو ونپرتی کے راجہ ہیں یہی
خاص لطفِ شہ سے ان کی قدر افزائی ہوئی

کون ہیں یہ راجۂ مرلی منوہر خوش صفات
مال والوں میں ہے عزت ان کے ہاتھ آئی ہوئی

کون ہیں یہ ذی حشم نواب فخر الملک ہیں
آپ کے دم سے دکن میں ہے بہار آئی ہوئی

کون ہیں یہ خانخانانِ بہادر ذی وقار
آپ سے عزت کی گویا عزت افزائی ہوئی

کون ہیں یہ خوش سرِ بالی گہر خورشید ملک
آپ کے ہاتھوں امارت چمکی چمکائی ہوئی

کون ہیں یہ دیکھو آصف یاور الملک آپ ہیں
آپ سے بزمِ شرف کی جلوہ افزائی ہوئی

کون ہیں یہ سر مہاراجہ کشن پرشاد ہیں
شاہ آصف کی وزارت جن کی شیدائی ہوئی

ذی فراست ذی مروت باکمال و خوش خصال
ہر پسندیدہ صفت حصے میں ہے آئی ہوئی

لطفِ آصف جودِ آصف کے نہوں کیوں مستحق
حبِ آصف آپ کی رگ رگ میں ہے چھائی ہوئی

آپ کے اقبال سے چمکا نصیبا ملک کا
آپ کے دم سے حکومت کو توانائی ہوئی

شاد رکھ آباد رکھ یارب جناب شاد کو
تیری رحمت کی گھٹا سر پر ہے چھائی ہوئی

لیجیے وہ خاص سلطانی سواری آ گئی
تھی نظر جس کے لیے آنکھوں میں گھبرائی ہوئی

پڑ گئی ہے کیسی ہلچل مجمع گلزار میں — جس طرح دریا میں سطحِ آب لہرائی ہوئی
شور ہے ہر سو وہ دیکھو چاند نکلا عید کا — روشنی جس کی چراغ افروزِ بینائی ہوئی
سامنے ظلِ خدا ہے اس طرف خلقِ خدا — رعب ادھر چھایا ہوا سطوت ادھر چھائی ہوئی
داب شاہی نے پکارا ہاں مودب دور باش — دی سلامی فتح نے تعظیم مجرائی ہوئی
بخت نے چومے قدم اقبال نے تھامی رکاب — گرد پھر پھر کر تصدق شان یکتائی ہوئی
کیوں نہ ہو پھر کور ہیں یہ شاہ آصفجاہ ہیں — وہ سکندر ہیں کہ ان کے در سے دارائی ہوئی
میر محبوب علی خان بہادر ہیں یہی — ہے انھیں کے ساتھ تائید علیؑ آئی ہوئی
ہمتِ حاتم انھیں ہاتھوں سے حاجتمند فیض — دولت قاروں انھیں قدموں کی ٹھکرائی ہوئی
اس سرِ اقدس پہ افسر سربلندی کا کھلا — چست اس قد پر قبائے صدر آرائی ہوئی
رستم دوراں انھیں ان کی شجاعت نے کیا — نام سے ہے روح سام و زال تھرائی ہوئی
تیغ زن ناوک فگن ضیغم شکار وصف شکن — بازوؤں میں قوت خیبر شکن آئی ہوئی
رائے وہ صائب کہ جس کے سامنے خم چرخِ پیر — فکر وہ موزوں کہ دنیا جسکی شیدائی ہوئی
وہ ذکاوت جو فلاطون زماں کو چاہیے — وہ ذہانت جو سبق آموز دانائی ہوئی
یہ وہ سلطاں ہیں کہ انکے عہد دولت مہد میں — نام عزت کا ہوا ذلت کی رسوائی ہوئی
بارش ابر کرم سے کشتِ عالم ہے نہال — دامن دولت میں خلقت پرورش پائی ہوئی
ہے کمال شاہ آصف کا یہ ادنیٰ سا اثر — پوری ہو جاتی ہے قدموں کی قسم کھائی ہوئی
شاہ کے ہمراہ ہیں شہزادہ والا تبار — بارک اللہ نور میں کیا نور افزائی ہوئی
شاہزادے کی مددپر ہیں جو عثمانؓ و علیؓ — حشمت و اجلال کو دونی توانائی ہوئی
شاہ کے اسٹاف میں ہیں کیسے کیسے ذی کمال — فیضِ سلطانی سے جس کی قدر افزائی ہوئی
کوئی لقمانِ جہاں کوئی فصیح نکتہ داں — ذات جن کی عزت و نام آوری پائی ہوئی
یہ ہیں افضل وہ ہیں افسر یہ اسد وہ ہیں حکیم — مختلف اوصاف کی کیا خوب یکجائی ہوئی
قائم و دائم رہیں شہزادہ و شاہ نظام — بڑھتی ہی جائے حکومت اوج پر آئی ہوئی
بول بالا لارڈ کرزن کا جو ہیں بالا نشیں — مثل خورشید ان سے عالم کو شناسائی ہوئی

آپ نے اس سرزمین ہند کو زندہ کیا　　آپ سے اس جسم بیماں کی مسیحائی ہوئی
غیر ممکن ہے کہ ہو اوصاف عالی کا شمار　　آکے اس موقع پر عاجز اپنی گویائی ہوئی
ایک یہ مصرع ہی پڑھ لینا ہے کافی اس جگہ　　ساتھ دولہا کے ہے یہ ساری برات آئی ہوئی
عمر و دولت میں ترقی ہو شہِ ایڈورڈ کی　　تاجپوشی جن کی وجہ عالم آرائی ہوئی
یہ قصیدہ پڑھ کے تو نے کر دیا بیخود جلیل　　اے جزاک اللہ اچھی بادہ پیمائی ہوئی
رنگ وہ پیدا ہوا سب کو مزہ آ ہی گیا　　صرفِ محفل میں شراب جام مینائی ہوئی
اپنے ہم مشرب تھے جتنے ہو گئے اس کے پہ لوٹ　　داد دی جامی نے صدقے روح صہبائی ہوئی

۱۳۲۱ھ

در مدح اعلیٰحضرت میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس سلطان دکن

مزے کی آج جشن آصفی میں مدح خوانی ہے
ادھر سے گلفشانی ہے ادھر سے زرفشانی ہے

اِدھر جوشِ عقیدت سے مبارکباد ہے لب پر
اُدھر جوشِ عطا ہے مرحمت ہے قدر دانی ہے

اِدھر آثار خوشنودی اُدھر آثار خوش بختی
اِدھر بھی شادمانی ہے اُدھر بھی شادمانی ہے

اِدھر دستِ ادب میں نذر ہے اخلاص مندی کی
اُدھر کھولے ہوئے آغوش چشم مہربانی ہے

خدائی دین ہے خلقِ خدا کا مہرباں ہونا
یہ پابوسی کی عزت سرفرازی کی نشانی ہے

بھلا ہو جشن کا جس نے نکالے حوصلے دل کے
خوشی اس جشن کی سب سے سوا ہم کو منانی ہے

بہت سے جشن دیکھے ہیں بہت خوشیاں منائی ہیں
مگر اس جشن کے آگے وہ سب قصہ کہانی ہے

نہ کیوں لا بے مثل ہو یہ جشن ہے اس شاہ ذیشاں کا
جو اپنا آپ ہمسا ہے جو اپنا آپ ثانی ہے

یہ ہم بھی جانتے ہیں جشن کا دعویٰ ہے فارس کو
یہ ہم بھی جانتے ہیں جشن کا جمشید بانی ہے

مگر اس جشن کی غایت فقط ذاتی مسرت تھی
یہاں اقلیم کی اقلیم محوِ شادمانی ہے

وہاں یہ ربط روحانی کہاں تک ملک و مالک میں
یہاں ملکی خوشی کا نام شاہی کامرانی ہے

کہاں ہیں خسرو دارا کہاں ہیں قیصر و کسریٰ
کہاں وہ شوکتِ ساسانی و شانِ کیانی ہے

ادھر آئیں ذرا دیکھیں دکن کی شان و شوکت کو
یہی کہتے بنے گی ہاں یہ جشنِ خسروانی ہے

بہارِ باغِ جنت کی بڑی تعریف ہے لیکن
وہ جنت نقشِ اول ہے یہ جنت نقشِ ثانی ہے

زمانے کو سنوارا ہے کسی نے دستِ نازک سے
اگر دن ہے تو پیارا ہے اگر شب ہے سہانی ہے

فلک کہتا ہے میرے سر پہ سہرا ارجمندی کا
زمیں کہتی ہے میرے ہاتھ اوجِ آسمانی ہے

عدد لے طبع عالی الدد فکر فلک پیما
مجھے تصویر دربارِ معلیٰ کی دکھانی ہے

مطلع

یہ باغِ عام ہے یا نوعروسِ کامرانی ہے — وہ عالم ہے کہ ہر غنچہ کے لب پر لن ترانی ہے
جمایا ہے وہ نقشہ آج دربار ہمایوں نے — ادھر بہزاد کو سکتہ اُدھر تصویر مانی ہے
سجاوٹ منتظم ہے، خوشنمائی دوڑنے والی — سلیقہ افسرِ اعلیٰ ادب کی پاسبانی ہے
یہ فرماں ہے کہ رونق بڑھ کے لے ہر آنیوالے کو — بٹھانے پر مقرر دلکشی ہے دلستانی ہے
ہر اک درجہ نے وسعت پائی ہے اخلاقِ شاہی کی — ہر اک فانوس میں روشن چراغِ زندگانی ہے
مسلط صحن پر قربان ہو طالع کی ہمواری — در و دیوار پر چھائی خدا کی مہربانی ہے
بہشتی بن کے رحمت کرتی ہے چھڑکاؤ پانی کا — بجائے کس لیے دامن کوئی کوثر کا پانی ہے
جلوس خاص شاہی کا مکاں ہے دید کے قابل — یہ کوئی حور ہے یا جلوہ گاہِ خسروانی ہے
بلندی اس مکاں کی گھر کیے لیتی ہے آنکھوں میں — کسی مہ پارۂ نوخیز کی اٹھتی جوانی ہے
صفیں دربار والوں کی ہیں یا موتی کی لڑیاں ہیں — کوئی محوِ نظارہ کوئی گرمِ خوش بیانی ہے
مچا ہے شور سلطانِ زمن کی آمد آمد کا — وہ سلطاں جنکی مٹھی میں فتوحِ آسمانی ہے
سلامی سر ہوئی نوشاہ والا کے قدم آئے — جلو میں شان و شوکت سر پہ چترِ کامرانی ہے
امیرانِ دکن نکلے ہیں شہ کی پیشوائی کو — ہر اک کے حال پر مبذول لطفِ خسروانی ہے
وہ دیکھو سامنے شہزادۂ والا مناقب ہیں — خدا رکھے عیاں تیور سے شانِ کامرانی ہے
عزیز جان و دل ہیں یوسفِ مصرِ سعادت ہیں — نمو کے دن ہیں جوشِ حسن ہے چڑھتی جوانی ہے
وہ دیکھو رکن السلطنت دستورِ اعظم ہیں — یہ وہ ہیں جاں نثاری جنکی خود آصف ثانی ہے
وہ آصف یاورالملک انتخابِ اہلِ رفعت ہیں — وقار و تمکنت ہے آپ میں معجز بیانی ہے
وہ دیکھو رونق افزا خانخاناں بہادر ہیں — یہی صورت امیرانِ سلف کی اک نشانی ہے
وہ فخر الملک ہیں فخرِ امارت صاحبِ حشمت — یہ وہ ہیں ذات جنکی رنگ روئے حکمرانی ہے
وہ دیکھو ہیں ظفر جنگ آفتابِ اوجِ سرداری — ظفر قبضے میں ہے چہرے پہ رنگِ شادمانی ہے
وہ ہیں سلطانِ ملک اقبال کی تصویرِ لاثانی — جمال و دولت و اعزاز میں کون انکا ثانی ہے
وہ ہیں دیکھو ولی الدین خاں اقبال کے اختر — فدا ہے بانکپن ان پر گلے ملتی جوانی ہے

وہ دیکھو ہیں معین الدین خاں سرمایۂ نازش — نمایاں چشم و ابرو سے نشان کامرانی ہے
وہ ہیں سالار جنگ اوصاف آبائی ملے جنکو — شہ آصف کی ان پر بھی نگاہِ مہربانی ہے
شہ آصف سر کرسی زریں جلوہ فرما ہیں — جبیں سے نور افشاں کوکبِ صاحبقرانی ہے
جو کرسی دوسری ہے اسکو شہزادے نے دی عزت — تجلی آج مہر و ماہ کو مل کر دکھانی ہے
مناسب ہے کہ اس موقع پہ ہو مطلع نیا موزوں — طبیعت دیر سے آمادۂ گوہر فشانی ہے

مطلع

شہ آصف پہ کیا موزوں قبائے خسروانی ہے — بلائیں لیتی ہے دولت تصدق کامرانی ہے
تعالی اللہ ہیں دربار آرا ظلِ سبحانی — کہو سر سے قدم لیں جنکو قسمت آزمانی ہے
وہ چشم فیض ہے جس سے رواں ہیں سیکڑوں چشمے — وہ چشم غیظ ہے جس سے جگر شیر دکا پانی ہے
دکن کی سلطنت میں لطف دیکھا نہر جاری کا — یہی ہے وہ سمندر جس میں دریا کی روانی ہے
عروس سلطنت کا رنگ روپ اللہ کی قدرت — نہ طفلی ہے نہ پیری ہے جوانی ہی جوانی ہے
انھیں ہم صحبتوں میں رات دن شہ کو بسر کرنا — کرم ہے، خلق ہے، انصاف ہے، راحت رسانی ہے
فلک بھولا ہے اپنی چال پر اتنا سمجھ رکھے — کہ آصف جاہ والا منزلت کی حکمرانی ہے
عدو کے ساتھ ہیں کیا کیا کرشمے سیف آصف کے — جلا دینے کو شعلہ ہے ڈبو دینے کو پانی ہے
دکن کی شام کو دیکھا، دکن کی صبح بھی دیکھی — وہ شام نوجوانی ہے، یہ صبح زندگانی ہے
مکانوں کی ہو کیا توصیف چشم و دل کا ہے عالم — مکینوں کی ہو کیا تعریف گھر گھر شادمانی ہے
مساجد کے لیے انوار صرف زیب و زینت ہیں — مسافر کے لیے آرام وقف میزبانی ہے
وہ زنجیر عدالت جس میں کڑیاں ہیں شریعت کی — نیا نوشیرواں ہے اب نئی نوشیروانی ہے
جفا کاری گئی گذری ستمگاری پہ قہر آیا — وفاداری کا سکہ ہے وفا کی قدردانی ہے
مٹا رکھا ہے دور ظلم کو دور سیاست نے — اٹھے کیونکر کوئی فتنہ کہ مانع ناتوانی ہے
نہ ہے دریا دلی پیاسا کوئی رہنے نہیں پاتا — گلوئے خشک دشمن کے لیے خنجر کا پانی ہے
عقیدت نے یہ فتویٰ دیدیا ہے جان نثاروں کو — تصدق شاہ پر ہونا حیات جاودانی ہے
کوئی بھی سرزمیں چھوٹی نہیں سیراب ہونے سے — زمین شعر کو دیکھو وہاں بھی گلفشانی ہے

کلام ایسا کہ سنکر تشنہ لب سیراب ہو جائیں
زباں میں بارک اللہ موجِ کوثر کی روانی ہے

حلاوت وہ کہ جس پر جان دیتی ہے مسیحائی
حلاوت وہ کہ جس سے آبِ حیواں پانی پانی ہے

پری ہے طبعِ نازک اس پہ طرّہ شوخیِ مضموں
دلہن ہے فکرِ رنگیں اس پہ زیور خوش بیانی ہے

ادا ہر لفظِ دلکش میں حسینانِ سمن بر کی
فدا ہر مصرعِ موزوں پہ سروِ بوستانی ہے

سنا تھا ہم نے بلبل کو کہ منھ سے پھول جھڑتے ہیں
مگر آصفؔ کے آگے اعتراف بے زبانی ہے

دعا ہے اے جلیلؔ اپنی خدائے بندہ پرور سے
کہ جب تک بحر میں پانی ہے پانی میں روانی ہے

رہیں جاری شہِ آصف کے فیضِ وجود کی نہریں
کہیں سب کیا بھلا پھولا ریاضِ حکمرانی ہے

بڑھے دولت بڑھے پایہ بڑھے عمرِ گراں مایہ
کہیں سب کیا خدا کا فضل ہے کیا مہربانی ہے

لکھیں سب لکھنے والے ملک و مالک کی ستائش میں
نہ اس کا کوئی ہمسر ہے نہ اس کا کوئی ثانی ہے۔

۱۳۲۳ھ

در مدح اعلیٰحضرت میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس سلطانِ دکن

جشن شاہی میں عجب رنگ اچھلتے دیکھا
ساغرِ عیش کو بے پاؤں کے چلتے دیکھا

وہ چمن آج مقدر نے دکھایا ہمکو
نخلِ امید جہاں پھولتے پھلتے دیکھا

گھر سے نکلے سبھی اس جشن کے نظارے کو
ایک اک دل سے تمنا کو نکلتے دیکھا

رحمت اللہ کی آئی ہے حسن دربار
غازۂ نور ہر اک چہرے پہ ملتے دیکھا

رونق افروزیٔ سرکار کا مژدہ سُنکر
نگہِ شوق کو آنکھوں میں مچلتے دیکھا

اس خبر سے کہ سرِ شام سجے گا دربار
ہم نے ڈوبے ہوئے تاروں کو نکلتے دیکھا

بخت و دولت کو بھی آتی ہے خوشامد کیسی
ہم نے آنکھیں قدمِ شاہ پہ ملتے دیکھا

کون وہ شاہ خدا رکھے حضور آصفجاہ
نام سے جن کے مریضوں کو سنبھلتے دیکھا

ہوشمندی میں ارسطو سے فلاطوں سے سوا
فتمندی میں سکندر سے نکلتے دیکھا

ہمسری کرکے سزا مہرِ فلک نے پائی
وہ لگی آگ کہ دن بھر اسے جلتے دیکھا

شکر اکر جسے دیکھا وہ ہوا مالا مال
پھول جس نخل میں آئے اسے پھلتے دیکھا

لاکھوں دیتے ہیں خزانہ نہیں ہوتا خالی
یہ وہ چشمہ ہے سدا جس کو اُبلتے دیکھا

اور اللہ کرے دامنِ دولت ہو وسیع
ایک عالم کو اسی آغوش میں پلتے دیکھا

اے خوشا بخت کہ نظارہ ہوا قدموں کا
یہ قدم دیکھ کے ارماں کو نکلتے دیکھا

سیر گاہیں ہیں نرالی شہِ والا کے لیے
کبھی آنکھوں میں کبھی دل میں ٹہلتے دیکھا

تابعِ حکم ہے آصف کا زمانہ ایسا
کہ اشارے پہ شب و روز کو چلتے دیکھا

دستِ انصاف سے سرکش کی ہوئی پامالی
دستِ الطاف سے گرتے کو سنبھلتے دیکھا

واہ کیا آن ہے کیا شان ہے کیا سطوت ہے
شیر تھرا گئے تیور جو بدلتے دیکھا

جھتے دشمن ہیں گلے سے وہ لگا لیتے ہیں
تیغِ شہ کو عجب انداز سے چلتے دیکھا

نگہِ شاہ سے گرنا ہے غضب کا گرنا
ٹھوکریں کھا کے نہ دشمن کو سنبھلتے دیکھا

مطلعِ نور ہے یہ ملکِ دکن شام و سحر
چاند سورج کو اسی سانچے میں ڈھلتے دیکھا

اس زمانے میں وہ آرام کا ساماں ہوا
کہ زمانے کو بھی کروٹ نہ بدلتے دیکھا

فتنہ گر فتنہ و شر سے ہوئے تائب ایسے
عطرِ فتنہ بھی نہ پوشاک پہ ملتے دیکھا

دلِ معشوق میں بھی اب نہ رہی بیدردی
شمع کے سوگ میں پروانے کو جلتے دیکھا

یا خدا عمرِ خضر ہو شہِ آصف کو نصیب
اس دعا کو دلِ عالم سے نکلتے دیکھا

مدحِ آصف میں یہ رنگیں سخنی واہ جلیل
آج تو ہم نے تجھے لعل اگلتے دیکھا

۱۳۲۳ھ

در مدح میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس، سلطان دکن

کوئی شاہِ دکن کا آج ہمتا ہو نہیں سکتا
یہ شوکت ہو نہیں سکتی یہ شہرا ہو نہیں سکتا

یہ حضرت ہی کا پرتو ہے جو سب کے دل ہیں نورانی
اگر سورج نہ ہو گھر گھر اجالا ہو نہیں سکتا

بڑا اقبال سہی کوئی بہت کامل سہی کوئی
جسے اچھا نہ سمجھیں آپ اچھا ہو نہیں سکتا

خدا شاہد حکومت شاہ کی ہے کشورِ دل میں
یہ وہ رتبا ہے جس سے بڑھ کے رتبا ہو نہیں سکتا

لب جاں بخش آصف نے ہزاروں کو جلایا ہے
غلط کہتے ہیں اب کوئی مسیحا ہو نہیں سکتا

کہاں الطاف شاہانہ کہاں حاتم کی فیاضی
سمندر کے مقابل کوئی دریا ہو نہیں سکتا

ستا سکتا نہیں کوئی کسی کو دورِ آصف میں
فلک سن لے ترا ارمان پورا ہو نہیں سکتا

کسی کے لب پہ آجائے شکایت غیر ممکن ہے
کسی کے دل میں رہ جائے تمنا ہو نہیں سکتا

شہِ والا کے ہیں احسان اتنے جاں نثاروں پر
کہ سر بھی نذر دے کر کوئی ہلکا ہو نہیں سکتا

کسی مجرم کے حق میں جب سزا کا حکم ہوتا ہے
نگاہِ لطف کہتی ہے کہ ایسا ہو نہیں سکتا

بڑا عادل سہی لیکن برابر شاہ آصف کے
اگر انصاف سے پوچھو تو کسریٰ ہو نہیں سکتا

سلا رکھا ہے اسے تلوار کے سائے میں حضرت نے
قیامت تک تو اب بیدار فتنا ہو نہیں سکتا

مزے کی بات تو یہ ہے کہ رعبِ شاہِ عادل سے
حسینوں کی دل آزاری کا چسکا ہو نہیں سکتا

بتوں نے توبہ کر لی عاشقوں کے دل دکھانے سے
یہ کہتے ہیں کہ پتھر کا کلیجا ہو نہیں سکتا

زمانہ وہ گیا جب فتنۂ قد فتنے اٹھاتے تھے
کسی کی چال سے اب حشر برپا ہو نہیں سکتا

کریں ہر چند شاہانِ جہاں تقلید حضرت کی
مگر یہ بانکپن یہ رعب پیدا ہو نہیں سکتا

رخِ شہ دیکھ کر فق ہو گیا مہتاب کا چہرہ
گماں اس کو تھا کوئی مجھ سے اچھا ہو نہیں سکتا

کلامِ شاہ نے اعجاز کی تاثیر پیدا کی
کسی کو اب سخن گوئی کا دعویٰ ہو نہیں سکتا

عجب چلتا ہوا پھندا ہے فکرِ شاہ عالی کا
ہزار اونچا کوئی مضموں ہو منتہا ہو نہیں سکتا

ابھی دن اپنے پھر جائیں ابھی ڈوبے یہ تر جائیں
اشارہ شہ کا ہو جائے تو پھر کیا ہو نہیں سکتا

انھیں کیا خوف جو ہیں دامنِ دولت لگائے ہیں
مخالف آسماں دشمن زمانہ ہو نہیں سکتا

رہیں یارب سلامت شاہ آصف اور شہزادے
کبھی فارغ دعا سے دل ہمارا ہو نہیں سکتا

جلیلؔ اک شعر بھی گر شاہ والا کو پسند آئے
تو کہہ سکتے ہو تم ایسا قصیدہ ہو نہیں سکتا

مناسب ہے کہ اب کوئی بحر ہلکی سی غزل کہہ دو
بغیر اسکے سخن کا لطف پورا ہو نہیں سکتا

غزل

چھری میرے گلے پر پھیر دو کیا ہو نہیں سکتا
اب ایسے تم ہو نازک تم سے اتنا ہو نہیں سکتا

لبِ جاں بخش پہ مرتے ہوئے لاکھوں کو دیکھا ہے
مسیحا کہنے سے قائلِ مسیحا ہو نہیں سکتا

انھیں دیکھو کہ وہ دل لیگئے ہم سے زبردستی
ہمیں دیکھو کہ اب ہم سے تقاضا ہو نہیں سکتا

کیا ہے وعدۂ فردا الٰہی کیا قیامت ہے
وہ ہیں بے فکر مجھ سے صبر اتنا ہو نہیں سکتا

نگاہوں سے تو چھپتے ہیں مگر آنکھوں میں پھرتے ہیں
اسی کا نام پردہ ہے تو پردا ہو نہیں سکتا

تمہیں پر کیا ہے جسکے ہوں ہزاروں چاہنے والے
وہ پورا قول کا وعدے کا سچا ہو نہیں سکتا

وہی اب بے وفا کہلاتے ہیں جو ہم سے کہتے تھے
تم ایسے ہو تو ممکن ہے میں ایسا ہو نہیں سکتا

کبھی دل لو کبھی پھیر دو کبھی خوش ہو کبھی روٹھو
تمھیں تو کھیل ہے مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا

قیامت میں بڑا مجمع سہی پہچان ہی لیں گے
انھیں ہو جائے دھوکا ہمکو دھوکا ہو نہیں سکتا

جو حالت دیکھتے ہیں جا کے اس بیدرد کے گھر میں
ہمارے دوستوں سے ہائے اتنا ہو نہیں سکتا

جلیلؔ خستہ جاں کو تم کہاں تک آزماؤ گے
تمہارا ہے تمہارا اب کسی کا ہو نہیں سکتا

در مدحِ اعلیٰحضرت میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس سلطانِ دکن

جلیلؔ القدر ہو صاحب تمہاری بات کیا کہنا
یہ وہ مصرع ہے جس پر چاہیے صد مرحبا کہنا

جلیلؔ زار کو آصف جلیل القدر فرمائیں
یہ وہ عزت ہے جس کو چاہیے فضلِ خدا کہنا

سوئے احباب جانا ہو جو اے بادِ صبا تیرا
ہماری سرفرازی کا ہر اک سے ماجرا کہنا

شرف ایسا خطاب ایسا کسی نے بھی نہیں پایا
یہ دعویٰ ہے بجا دعویٰ یہ کہنا ہے بجا کہنا

حقیقت میں شہِ آصف کی یہ ذرہ نوازی ہے
جو ہو ذرہ سے کم خورشید سے اسکو سوا کہنا

نہیں ممکن ادا ہو شکر اس اعزاز بخشی کا
سوا مدح و ثنا کے اور ہو سکتا ہے کیا کہنا

جدا ہے شان سلطانِ دکن کی سب سلاطیں سے
قصیدہ بھی ہوا لازم ہمیں سب سے جدا کہنا

شہِ آصف سا ظل اللہ دیکھا ہے کہیں تو نے
قسم ہے اے فلک تجھ کو خدا لگتی ذرا کہنا

فقیروں کا اگر ملجا کہیں تو بات ہی کیا ہے
امیروں کے لیے ہے فخر اس در کا گدا کہنا

مرے ممدوح کی نسبت یہی معمول ہے سب کا
سرِ اوجِ شرف کہنا شہ کشورکشا کہنا

مسیحا میں جو کہتا ہوں لب جاں بخش آصف کو
نگاہیں کہتی ہیں ہمکو بھی خضرِ رہنما کہنا

عقیدت پر نظر کر کے مناسب بلکہ واجب ہے
فدائے مصطفےٰ دلدادۂ غوث الوریٰ کہنا

مزاج شاہِ والا بے طلب دینے کا خوگر ہے
عبث ہے کچھ طلب کرنا خطا ہے مدعا کہنا

انھیں باتوں سے بیڑا پار ہوتا ہے غریبوں کا
بجا ہے کشتیِ عالم کا تمکو ناخدا کہنا

لٹائے جاتے ہیں جب لعل و گوہر پھر غلط کیا ہے
تمہیں کانِ سخا کہنا تمہیں بحرِ عطا کہنا

کسی پر کھل نہیں سکتا کہ منشائے دلی کیا ہے
اسے بھی ہے مناسب ایک شاہانہ ادا کہنا

وفا کا دور دورہ ہے وفاداری کا چرچا ہے
جفا کرنا کجا اب ظلم ہے لفظ جفا کہنا

کہاں اب کوئی کہتا ہے یہ تھا دستور آگے کا — اسیر زلف جاناں کو گرفتارِ بلا کہنا
نہیں کچھ شک کہ حضرت فرد ہیں جوہر شناسی میں — وہ آکر دیکھ لے جنکو نہ باور ہو مرا کہنا
نظر چن لیتی ہے اس شعر کو جو شعر ہوتا ہے — کہ چھپ سکتا نہیں نقاد سے اچھا برا کہنا
دعا جو شہ کے حق میں خلق کے دل سے نکلتی ہے — وہ کہتی ہے مجھے زیبا ہے تیر بے خطا کہنا

جلیلؔ اچھے کہے اشعار مدح شاہ آصف میں
جلیل القدر ہو صاحب تمہاری بات کیا کہنا

۱۳۲۶ھ

در مدح اعلیحضرت میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس سلطان دکن

جو دن پھرتے ہیں تو سامان پیدا ہو ہی جاتا ہے — شبِ غم لاکھ طولانی ہو، تڑکا ہو ہی جاتا ہے
چمن میں پھولنے پھلنے کی نوبت آ ہی جاتی ہے — دکن میں بارور نخلِ تمنا ہو ہی جاتا ہے
رہا جو شہ کی نظروں میں ترقی اسکو لازم ہے — ملا دریا سے جو قطرہ وہ دریا ہو ہی جاتا ہے
چمک ذرے میں سورج کی کرن سے آ ہی جاتی ہے — درِ شہ کا گدا ادنیٰ سے اعلیٰ ہو ہی جاتا ہے
توجہ چاہیے تھوڑی سی شاہِ بندہ پرور کی — فقیروں کا جہاں میں بول بالا ہو ہی جاتا ہے
جو دل سے ہو رہا حضرت کا پھر اسکو کمی کیا ہے — موافق آسماں تابع زمانہ ہو ہی جاتا ہے
مرے گلزار میں رنگِ خزاں کب تک جما رہتا — کہ اک دن فصلِ گل کا دور دورہ ہو ہی جاتا ہے
توقع شاہ سے رکھنا کبھی خالی نہیں جاتا — یہ دیکھا ہے کہ فضلِ حق تعالیٰ ہو ہی جاتا ہے
اشارہ چاہیے ہر مشکل آساں ہو ہی جاتی ہے — سہارا چاہیے ہر بوجھ ہلکا ہو ہی جاتا ہے
کسی کا دردِ دل ہو بے اثر یہ غیر ممکن ہے — مریضوں پر کرم فرما مسیحا ہو ہی جاتا ہے
مسیحا جب کرم فرما ہوا پھر پوچھنا کیا ہے — دوا ہو یا نہ ہو بیمار اچھا ہو ہی جاتا ہے
تجسس شاہدِ مقصود کا ضائع نہیں جاتا — وہ اک دن زیبِ آغوشِ تمنا ہو ہی جاتا ہے
عقیدت جب ہوئی پوری تو کیسا پردۂ دوری — رخِ محبوب دل میں جلوہ آرا ہو ہی جاتا ہے
بجا ہے اب عروسِ شاعری کا دون کی لینا — شباب آتا ہے تو جوبن دوبالا ہو ہی جاتا ہے
گلِ مضموں جو کل خشک تھے اس کا تعجب کیا — خزاں کے دور میں ہر پھول کانٹا ہو ہی جاتا ہے
نہ میں اچھا نہ میرے شعر اچھے بات اتنی ہے — جسے اچھا کہیں سرکار اچھا ہو ہی جاتا ہے
جلیلِ زار کو دیکھو جلیل القدر کو دیکھو — لقب جو شاہ سے ملتا ہے زیبا ہو ہی جاتا ہے
تعجب کیوں کسی کو ہو ہماری سرفرازی پر — خدا کا فضل ہوتا ہے تو ایسا ہو ہی جاتا ہے

یہ ایسی سرفرازی ہے یہ وہ ذرہ نوازی ہے — نہ کچھ کہیے مگر لوگوں میں چرچا ہو ہی جاتا ہے
حسد کوئی کرے کس واسطے سب پر یہ ظاہر ہے — کہ جو قسمت کا لکھا ہے وہ پورا ہو ہی جاتا ہے
لکھوں اب شکریہ کے ساتھ کچھ مدحِ شہِ والا — کہ اس موقع پہ دل میں جوش پیدا ہو ہی جاتا ہے
یہ مدحِ شاہ وہ مضموں ہے جسکے نظم کرنے کو — ارادہ میں نہیں کرتا ارادہ ہو ہی جاتا ہے

مطلع

کمالِ شاہ پر انسان شیدا ہو ہی جاتا ہے — جمالِ شاہ کو دیکھو تو سکتا ہو ہی جاتا ہے
نظر جس کی پڑی آئینہ روئے مبارک پر — نصیب اس کو سکندر کا نصیبا ہو ہی جاتا ہے
سواری کا سماں سو بار دیکھا ہے مگر پھر بھی — سلیماں کا شہِ آصف پہ دھوکا ہو ہی جاتا ہے
نہ ہے ہر دلعزیزی بخت و دولت بھی کنیزیں ہیں — تمھیں جو دیکھ لیتا ہے تمھارا ہو ہی جاتا ہے
خدا رکھے شہِ جم جاہ کا ہے رعب و داب ایسا — کسی کا بخت بگڑا ہو تو سیدھا ہو ہی جاتا ہے
تجلی محو کر دیتی ہے ایوانِ معلےٰ کی — درِ شہ کا تماشائی تماشا ہو ہی جاتا ہے
کسی آزاد کی اس در پہ آزادی نہیں چلتی — کرم کا خلق کا احساں کا بندا ہو ہی جاتا ہے
بہت دور آپ کو کھینچے جو کوئی فائدہ کیا ہے — خدنگ لطفِ شاہی کا نشانا ہو ہی جاتا ہے
دلوں پر کیوں نہ ہو قبضہ کہ دل کو شاد کرتے ہیں — یہ وہ جادو ہے جس سے غیر اپنا ہو ہی جاتا ہے
مثالِ ماہِ تاباں انجمن آرا جو ہوتے ہیں — تو شاہانِ جہاں کا حلقہ ہالا ہو ہی جاتا ہے
کمالِ شاہ کا اللہ اکبر کیا تصرف ہے — کوئی ارماں ہو دم بھر میں پورا ہو ہی جاتا ہے
جہاں مجرم کوئی پھنس کر ہوا سائل رہائی کا — مروت آ ہی جاتی ہے اشارا ہو ہی جاتا ہے
عتابِ شاہ بھی خالی نہیں شانِ ترحم سے — ہوا جو برطرف اس کا وظیفا ہو ہی جاتا ہے
نکل جاتی ہے خدمت ہاتھ سے روزی نہیں جاتی — یہی وہ بات ہے دل جس پہ شیدا ہو ہی جاتا ہے
سزا کے واسطے دل میں کوئی پہلو نہیں آتا — عطا کے واسطے کوئی بہانا ہو ہی جاتا ہے
مرے شہ کی سخاوت مشک کی تاثیر رکھتی ہے — چھپا کر لاکھ دیں عالم میں شہرا ہو ہی جاتا ہے
ہمیشہ فیض جاری ہے ہمیشہ خیر جاری ہے — لٹاتا ہے جو موتی دل کا دریا ہو ہی جاتا ہے
عجب عہد مبارک ہے کہ جب چاہو جہاں چاہو — خوشی کا عیش کا ساماں مہیا ہو ہی جاتا ہے

مسافر کو سفر میں دھوپ کی ایذا نہیں ہوتی
کہ سر پر دامنِ دولت کا سایا ہو ہی جاتا ہے

اسی در پر تو پھل ملتا ہے نخلِ خاکساری کا
جو قدموں میں جھکا سر اس کا اونچا ہو ہی جاتا ہے

دل آئینہ ہے اور اس میں خواصِ جامِ خسرو ہے
کسی کا راز دل ہو آشکارا ہو ہی جاتا ہے

سبق دیتے ہیں لقماں کو فلاطونِ زمن ہو کر
ہوا جو بندۂ بیدام دانا ہو ہی جاتا ہے

زہے تیر افگنی نکلے نہ نکلے تیر چشکی سے
دلِ حاسد میں خونِ تمنا ہو ہی جاتا ہے

کلامِ خسروی کیونکر نہ دنیا سے نرالا ہو
شہِ یکتا کا ہر مضمون یکتا ہو ہی جاتا ہے

خدا رکھے جہاں دو گل کھلائے طبعِ رنگیں نے
گلستاں بوستاں کا رنگ پھیکا ہو ہی جاتا ہے

زباں پر طوطیٔ ہندوستاں کو وجد آتا ہے
بیاں پر بلبلِ شیراز شیدا ہو ہی جاتا ہے

قلق کو داغ آتش کو جلن جامی کی بیہوشی
صبا کو بیکلی سودا کو سودا ہو ہی جاتا ہے

بجا ہے سامعیں کا مثلِ قمری نعرہ زن ہونا
کہ اک اک شعر موزوں سروِ رعنا ہو ہی جاتا ہے

زمینِ سخت میں بھی معنی روشن نکلتے ہیں
صدف میں دُر حجر میں لعل پیدا ہو ہی جاتا ہے

بناوٹ کی ضرورت کیا تصنع کی ہے حاجت کیا
طبیعت ہو جو بانکی شعر بانکا ہو ہی جاتا ہے

دیئے ہیں شاہ کو خالق نے کیا کیا چاند سے ٹکڑے
قمر جب دیکھتا ہے گھٹ کے آدھا ہو ہی جاتا ہے

نہ کیوں روشن ہوں سب کے دیدہ و دل شاہزادوں سے
کہ مہر و ماہ سے گھر گھر اجالا ہو ہی جاتا ہے

مجھے دعویٰ نہیں لیکن ثنا جب شہ کی لکھتا ہوں
سخن کو اپنی یکتائی کا دعویٰ ہو ہی جاتا ہے

کوئی مانے نہ مانے میں تو ہوں اس فیض کا قائل
زمیں مشکل سے مشکل ہو قصیدا ہو ہی جاتا ہے

جلیلؔ آصف کے حق میں جو دعا دل سے نکلتی ہے
اثر فضلِ خدا سے اس میں پیدا ہو ہی جاتا ہے

۱۳۲۷ھ

در مدح اعلیحضرت میر عثمان علی خاں آصف سابع سلطان دکن

بزم عشرت میں نئے رنگ کا ساماں دیکھا — حالتِ وجد میں ساغر کو بھی رقصاں دیکھا

پھول مقصد کے کھلے ہیں تو شگوفوں کے — جو نہ دیکھا تھا کبھی وہ چمنستاں دیکھا

غنچۂ گل سے بھلا ضبطِ خوشی کیا ہوتی — ہنس پڑے وہ بھی جو سرکار کو خنداں دیکھا

ہر شجر ہے شجرِ طور سے بڑھ کر روشن — ہر شگوفہ کو چراغِ تہِ داماں دیکھا

تھی نسیمِ سحر آگاہ کہ ہے وقتِ خوشی — کر گئی شمع کو خاموش جو گریاں دیکھا

ایک اک گھر پہ برستی ہوئی رحمت دیکھی — ایک اک دل سے نکلتا ہوا ارماں دیکھا

تخت کے تاج کے مالک مرے سرکار ہوئے — تخت کو تاج کو تقدیر پہ نازاں دیکھا

للہ الحمد کہ اورنگ نشین اقبال — بعد آصف تجھے عثمان علی خاں دیکھا

للہ الحمد کہ خدام وفا پرور نے — تجھے آقا تجھے والی تجھے سلطاں دیکھا

دیکھنا اس کو مسرت کا اثر کہتے ہیں — دشمنوں کے دہنِ زخم کو خنداں دیکھا

ایک عالم ہے کہ مدہوش نظر آتا ہے — یہ نہ پوچھو کسے شاداں کسے فرحاں دیکھا

ابرِ رحمت کی طرح خلقِ خدا کے سر پر — سایہ افگن تجھے اے سایۂ یزداں دیکھا

دوست دشمن پہ رہا یا پہ زمانے بھر پر — تری شفقت تری بخشش ترا احساں دیکھا

لوحش اللہ تجھے لاکھوں میں یگانہ پایا — بارک اللہ تجھے سر حلقۂ شاہاں دیکھا

حبذا ساتھ ترے نصرتِ باری دیکھی — مرحبا ہاتھ ترے فتح کا میداں دیکھا

کان سے وصفِ سکندر جو سنا تھا ہم نے — آنکھ سے آج وہ اے خسرِ ذیشاں دیکھا

کبھی چھپتے نہیں اوصاف جو آبائی ہیں — آصفی شان کو تیور سے نمایاں دیکھا

روئے رنگیں پہ پسینے کا عجب عالم ہے — آب و آتش کو بہم دست و گریباں دیکھا

چوری چوری جو نظر شہ کی طرف جاتی ہے — رعب دربار یہ کہتا ہے کہ ہاں ہاں دیکھا

عہد دولت میں ترے رنج ہوا گنج مراد   دور راحت میں ترے درد کو درماں دیکھا
نہ غم دزد، نہ رہزن کا کسی کو کھٹکا   رعبِ شاہی کو رعایا کا نگہباں دیکھا
بخت و دولت کو حکومت کو جہانداری کو   تیرے قابل ترے لائق ترے شایاں دیکھا
جس طرح ابر کے ٹکڑے سے ہو بارش مینہ کی   دستِ فیاض سے یوں ہی گہر افشاں دیکھا
دو نہیں چار نہیں سو نہیں سو لاکھ نہیں   سارے عالم کو ترا بندۂ احساں دیکھا
دولت و جاہ و حشم کو ہے عقیدت کیسی   اے شیدا لے صدقے اسے قرباں دیکھا
جس نے دربار ترا دیکھ لیا پھر اس نے   آنکھ اٹھا کر نہ کبھی سوئے گلستاں دیکھا
سچ ہے نظارۂ دربار کچھ آسان نہیں   جسکو دیکھا صفت آئینہ حیراں دیکھا
اس نظر میں اثر اکسیر کا آجاتا ہے   جس نظر نے تجھے عیسیٰ دوراں دیکھا
یوں ہی دیکھیں فلک پیر کو ہم لاکھ برس   جس طرح آج ترا تابع فرماں دیکھا

ایک تجھ پر نہیں موقوف زمانے کو جلیل
میر عثمان علی خاں کا ثناخواں دیکھا

۱۳۲۹ھ

در مدحِ اعلیحضرت میر عثمان علی خاں آصفجاہ سابع سلطانِ دکن

مدح گوئی فخر ہے طبعِ رسا کے واسطے
دل دعا کے واسطے لب ہیں ثنا کے واسطے

گوہرِ معنی نکالے ہیں اسی مقصود سے
ارمغاں ہوں تاکسی بحرِ عطا کے واسطے

لعل پارے ہیں یہ مصرعے رنگ میں ڈوبے ہوئے
کیا مناسب نذر ہے کانِ سخا کے واسطے

گرچہ مدحت پر نہیں حاجت روائی منحصر
پھر بھی حیلہ چاہیے حاجت روا کے واسطے

کون وہ، بحرِ عطا کانِ سخا حاجت روا
جو خدا کا فضل ہے خلقِ خدا کے واسطے

میر عثماں علی خاں خسروِ ملکِ دکن
مایۂ ناز و طرب ارض و سما کے واسطے

بھلا ہی ہے اسی شاہ فلک فر کے لیے
بادشاہی ہے اسی ظلِ خدا کے واسطے

حبذا اے تاجدار ذی کرم والا ہمم
ہے عطا تیرے لیے تو ہے عطا کے واسطے

ملک کے حق میں ہیں ایسے تیرے انفاسِ لطیف
بات جو گلشن میں ہے بادِ صبا کے واسطے

یہ بھی کو ہم نے دیکھا یہ ترا ہی خلق ہے
کام تو کرتا ہے بندوں کا خدا کے واسطے

تجھ کو دیتے ہیں دعا آرام سے بیٹھے ہوئے
دارِ راحت ہے ترا در ہر گدا کے واسطے

طبعِ عالی کے لیے ہے دانش و تدبیر و رائے
ذہن موزوں ہے ترا فہم و ذکا کے واسطے

یہ ترا عہدِ مسرت ہے کہاں اب رنج و غم
چشم و لب ترسا کریں آہ و بکا کے واسطے

سن لے تو بھی نغمے فلک سے ہے آصفِ سابع کا دور
راستی کا حکم ہے ہر کج ادا کے واسطے

طالعِ روشن سے یہ مضموں ہے روشن کہ ہے
فتح و نصرت آصفِ کشور کشا کے واسطے

شکوۂ معشوق کیوں آئے لبِ عشاق پر
اب کوئی موقع نہیں جور و جفا کے واسطے

ہاتھ سے تیرے ملی ساری کدورت خاک میں
سینہ و دل گھر ہے صدق و صفا کے واسطے

دامنِ عالم سے دھبا بے وفائی کا مٹا
گود پھیلاتے ہیں اب وعدے وفا کے واسطے

حکم یہ ہے ہاتھ سے جانے نہ پائے چھوٹ کر — یہ بھی گویا قید ہے دزدِ حنا کے واسطے
گر سیاست ہے تو ہے شانِ ریاست بھی عجب — ہے یہاں عفو و عطا سہو و خطا کے واسطے
بعدِ حاتم مل گیا اے شاہ تیرا دستِ فیض — پھر ٹھکانا ہو گیا جود و سخا کے واسطے
اس قدر اوصاف ہیں ممکن نہیں جن کا شمار — سخت مشکل ہے یہاں حمد و ثنا کے واسطے
خلق سے تیرے گلستاں کے گلستاں کھل گئے — تو نے کچھ چھوڑا نہیں بادِ صبا کے واسطے
گل سراپا گوش ہیں سننے کو تیری گفتگو — لب شگوفوں کے کھلے ہیں مرحبا کے واسطے
کیا مروت ہے ادھر تعجیل ہے بہرِ عطا — اور ادھر تاخیر ہوتی ہے سزا کے واسطے
بندھ گئی ہے ایسی استغنا کی عالم میں ہوا — راہ آنے کی نہیں حرص و ہوا کے واسطے
نام لے کر شاہ کا پاتے ہیں راحت دردمند — یہ دوا اکسیر دیکھی ہے شفا کے واسطے
چارہ سازی اس کو کہتے ہیں کہ دورِ شاہ میں — درد ڈھونڈے سے نہیں ملتا دوا کے واسطے
اونچے اونچوں کی ہے تیری ذاتِ عالی سے رجوع — آسماں بھی جھک رہا ہے التجا کے واسطے
آتے جاتے آنکھ اٹھ جاتی ہے تیری جس طرف — ہاتھ اٹھ جاتے ہیں لاکھوں کی دعا کے واسطے
قہر تیرا دشمنانِ بے مروت کے لیے — لطف تیرا دوستانِ بے ریا کے واسطے
مدعا سارے زمانے کا تو خود پورا کرے — ملتجی حق سے ہو اپنے مدعا کے واسطے
ہے یہی اک در جہاں ملتی ہے منہ مانگی مراد — ہے یہی اک گھر غریب و بے نوا کے واسطے
جو ہمارا درد ہے روشن ہے وہ سرکار پر — جائیں کیوں پیشِ اطبا ہم دوا کے واسطے
سلطنت پائی جو پایا دامنِ دولت ترا — کیوں پھریں یا ہم سایۂ بالِ ہما کے واسطے
بس کہاں تک شاہ کے اوصاف لکھو گے جلیلؔ — ہاتھ اٹھاؤ اب قلم رکھ کر دعا کے واسطے
یا خدا تیری عنایت سے رہے شام و سحر — فتح و نصرت آصفِ کشور کشا کے واسطے
چار دانگِ دہر میں ہو بول بالا شاہ کا — یا الٰہی چار یارِ باصفا کے واسطے

بہرِ عثمانؓ شاہ عثماں پر رہے رحمت تری
مشکلیں آساں ہوں مشکل کشا کے واسطے

۱۳۲۹ھ

در مدحِ اعلیٰحضرت میر عثمان علی خاں آصف سابع سلطانِ دکن

کس قدر سالگرہ روح فزا ہوتی ہے
وجد میں ساری خدائی بخدا ہوتی ہے

دل عنادل کے شگوفے کی جگہ کھلتے ہیں
آج کل اور ہی گلشن کی ہوا ہوتی ہے

دم عیسیٰ ہے نسیم سحری کا جھونکا
آج کل درد میں تاثیر دوا ہوتی ہے

سبز پوشاک پہنتے ہیں جوانانِ چمن
سرخرو رنگ مسرت سے حنا ہوتی ہے

بیل بوٹے میں عجب حسن نظر آتا ہے
پتی پتی میں عجب شانِ خدا ہوتی ہے

نرگسِ باغ کی آنکھوں میں ہے مستی کا وہ رنگ
جیسے ساغر میں مے ہوش ربا ہوتی ہے

جا بجا سنبلِ پیچاں کا وہ عالم دیکھا
جیسے بل کھاتی ہوئی زلف دوتا ہوتی ہے

دیکھیے سیر تو آنکھوں میں سرور آتا ہے
سونگھیے پھول تو بو روح فزا ہوتی ہے

بچے بچے کو عقیدت ہے شہِ والا سے
غنچے غنچے میں یہاں بوئے وفا ہوتی ہے

جانِ مشتاق کو سوجھی ہے یہ تدبیر اچھی
نام سرکار کا لے لے کے فنا ہوتی ہے

ایسے فیاض زمانے میں کہاں ہوتے ہیں
عرض ہوتی نہیں حاجت کہ روا ہوتی ہے

رحم کے ہاتھ سے ہوتا ہے گرفتار رہا
عدل کے ہاتھ سے ظالم کو سزا ہوتی ہے

جان جلتے ہیں جو ہوتا ہے کوئی رازِ نہاں
ٹال جاتے ہیں کسی سے جو خطا ہوتی ہے

ہاتھ دینے سے کبھی روک لیں ممکن ہی نہیں
بادشاہوں سے جو ہوتی ہے سدا ہوتی ہے

خاکِ پا جیسی ہے ایسی کوئی اکسیر نہیں
ایک چٹکی سے ہزاروں کو شفا ہوتی ہے

بات حکمت کی جو آتی ہے زبانِ شہ پر
حکمرانوں کے لیے راہ نما ہوتی ہے

خلق شہ نے وہ دیا ہے سبق دلسوزی
شمع محفل کی ہوا خواہ صبا ہوتی ہے

بانکپن کا کوئی موقع جو نکل آتا ہے
قابل دید وہ شاہانہ ادا ہوتی ہے

ٹوک کی بات جو سن لے تو عدو کٹ جائے
تیر سے، تیغ سے، خنجر سے سوا ہوتی ہے

قصد ہوتا ہے چمن کا تو نچھاور کے لیے
پھول دامن میں لیے بادِ صبا ہوتی ہے

چتر ہو ساتھ سواری کے ضرورت کیا ہے
سر پہ چھائی ہوئی رحمت کی گھٹا ہوتی ہے

خشک پتوں کی طرح اڑتے ہیں سرِ اعدا کے
تیغ سرکار کی چلنے میں ہوا ہوتی ہے

دوستوں کے لیے فرمانِ ظفر بنتی ہے
دشمنوں کے لیے پیغامِ قضا ہوتی ہے

تن کے چلتی ہے تو بن جاتی ہے طاؤس تن
قتل کرنے میں حسینوں کی ادا ہوتی ہے

اور خدمت تو کوئی ہو نہیں سکتی ہم سے
عمر و دولت کی شب و روز دعا ہوتی ہے

شاہ شہزادے سلامت رہیں یارب جن سے
محفلِ عیش و طرب روز بپا ہوتی ہے

اب مناسب ہے کہ اک تازہ غزل بھی پڑھ دوں
رونقِ بزمِ سخن اس سے سوا ہوتی ہے

غزل

توبہ جب توڑ کے پیدا یہ صدا ہوتی ہے
ہائے کیا چیز مے ہوش رُبا ہوتی ہے

یوں تو اس کی ہر ادا ہوش رُبا ہوتی ہے
جو ذرا شوخ نکلتی ہے قضا ہوتی ہے

روئے معشوق سے ہے اس کا اٹھانا دشوار
لاکھ پردوں کا جو اک پردہ حیا ہوتی ہے

رنگ چہرے کا اڑا خواب اڑا آنکھوں سے
کوچۂ عشق میں کیا تیز ہوا ہوتی ہے

دل جو لینا ہو کسی کا تو نگہ ہو کہ ادا
ایک سے ایک لگاوٹ میں سوا ہوتی ہے

آرزو خلد کی حوروں کی تمنا زاہد
ایسے دل میں بھی کہیں یادِ خدا ہوتی ہے

باغ میں شوخیٔ رفتار کا موقع کیا ہے
دیکھیے دیکھیے پامال حنا ہوتی ہے

پینے والوں سے نہیں ہوش سنبھالا جاتا
مفت بدنام مے ہوش رُبا ہوتی ہے

خاک میں چرخ ملاتا ہے ملانے دو جلیلؔ
اور بھی آئینۂ دل کی جلا ہوتی ہے

۱۳۳۰ھ

در مدح اعلیٰحضرت میر عثمان علی خاں آصف سابع سلطان دکن

غلغلہ آج ہے دربار کا دنیا بھر میں — یہی چرچا ہے زباں پر یہی سودا سر میں
دیکھ لو دیکھ لو پھر ہوگا نہ ایسا دربار — کسی اقلیم کسی ملک کسی کشور میں
لوگ ہر سمت سے دلی میں کھنچے آتے ہیں — دلبری ایسی تو ہوگی نہ کسی دلبر میں
کون دربار کے نشہ میں نہیں متوالا — چرخ کہتا ہے کہ میں بھی ہوں آئی چکر میں
نکلی جاتی ہے نظر آنکھ سے ارماں دل سے — آج ٹھہرا نہیں جاتا ہے کسی سے گھر میں
آج آغوش میں بچوں کا یہ عالم دیکھا — آرزو جیسے مچلتی ہو دلِ مضطر میں
دخترِ رز سے بھی نیچے نہیں بیٹھا جاتا — ابھی شیشے میں نظر آئی ابھی ساغر میں
شوق نظارۂ دربار نے سب کو کھینچا — شیخ مسجد میں برہمن نہ رہا مندر میں
ہر طرف عیش کا سامان نظر آتا ہے — شہر میں عید ادھر جشن ادھر لشکر میں
قابلِ دید ہے دربار کا ایوانِ بلند — پردۂ دیدۂ مشتاق ہیں اک اک در میں
تاجپوشی کے لیے قیصرِ ہند آئے ہیں — جارج پنجم جو ہیں موجود زمانے بھر میں
یہ برآمد ہوئے مغرب سے تو وہ مشرق سے — ہے یہی فرق شہِ ہند و شہِ خاور میں
چرخِ چارم پہ ہے گوشہ کلہِ قیصر کا — یہ بلندی تھی کہاں طالعِ اسکندر میں
سالہا سال سرِ شہ پہ مگس رانی کی — جب سعادت کی صفت آئی ہما کے پر میں
آپ چاہیں تو گدا ہمسرِ سلطاں ہو جائے — چار دن میں نہیں دو دن میں نہیں دم بھر میں
کام چلتا ہے اشاروں میں جہانداری کا — ہیں نظر میں وہی اوصاف جو ہوں ہر سر میں
دیدنی آج ہے سارے رؤسا کا مجمع — کوئی شوکت میں ہے نامی کوئی مال و زر میں
جلوہ گر یوں بصد اعزاز ہے ایک ایک میں — جیسے رہتے ہیں نگیں حلقۂ انگشتر میں

بالخصوص آصف سابع چمن آرائے دکن
سبع سیارہ بھی ہیں جس کے لیے چکر میں

میر عثمان علی خان بہادر جمجاہ
آبِ زر سے ہے یہ مرقوم ہر اک دفتر میں

دیکھو دیکھو وہ ہیں سلطان دکن جلوہ فروز
کس قدر چست حکومت کی قبا ہے بر میں

کوئی کس آنکھ سے سرکار کا جلوہ دیکھے
اشک شادی تو بھرے آتے ہیں چشم تر میں

مایۂ ناز ہے انساں کے لیے ایک کمال
آپ ماہر ہیں ہر اک فن میں ہر اک جوہر میں

آصفی شان پہ سب لوٹ ہوئے جاتے ہیں
بانکپن کی جو ادا دیکھتے ہیں تیور میں

سادہ پوشاک کا عالم یہ کہے دیتا ہے
سادگی میں ہے جو زینت وہ کہاں زیور میں

صفت ہمت و مردانگی و صف شکنی
آئی عثمان علی خاں میں جو تھی حیدر میں

بانکپن میں ہیں جو مشہور انھیں سے پوچھو
وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ نوک کہاں خنجر میں

جوش زن آج جو دل میں ہے خوشی کا دریا
نور بن بن کے نکھرتا ہے رخِ انور میں

کہتی ہیں دیکھنے والوں سے حیادار آنکھیں
سنگریزہ ہے اگر آب نہ ہو گوہر میں

وسعت اتنی ہے کہ ملتی ہیں کروڑوں جانیں
دامنِ دولتِ سلطانِ جہاں پرور میں

خُلق ایسا ہے کہ مخلوق مسخر ہو جائے
بات ایسی ہے کہ تاثیر کرے پتھر میں

باتوں باتوں میں کمال اپنا دکھا دیتے ہیں
جیسے دل چھین لے ساحر کوئی دو اکھر میں

خوبیاں اتنی اگر ہوں تو بتا دو ہم کو
کسی ہمپایۂ و ہم مرتبۂ و ہمسر میں

بارشِ ابرِ کرم کی نہ رہی حد کوئی
ہو گئی غرق جہاں قلزم سیم و زر میں

بندھی ہے تیغ دوسر جب کمر حضرت میں
درد دیتا ہے خبر اٹھ کے عدو کے سر میں

یہ وہ تلوار ہے گھماسان میں جب چلتی ہے
فرق کر دیتی ہے پیدا رہِ خیر و شر میں

جس کے قبضے میں ہو وہ فاتح و منصور رہے
خاص جوہر ہے یہ شمشیر ظفر پیکر میں

تیز چلنے میں قیامت ہے یہ شاہی تلوار
دے سکے ساتھ بھلا دم یہ کہاں صرصر میں

ہمرکاب آپکے جتنے ہیں وزیر و امرا
فرد ہیں دولت و جاہ ہنر و جوہر میں

ایک سے ایک ہے اسٹاف میں لائق فائق
ایک سے ایک ہے جانباز و جری لشکر میں

سارے اوصاف بیاں ہوں یہ کہاں ممکن ہے
آئیے سیر کو دربارِ ضیا گستر میں

کس قدر آج سلامی کی ہے آواز بلند
توپ چلتی ہے دھمک ہوتی ہے گوش کر میں

ہے سلاطینِ مغلیہ کا نظر میں دربار
فرق رکھتا نہیں کچھ شوکت و کر و فر میں

وہی دہلی ہے وہی انجمن آرائی ہے
وہی گل لالہ کھلا ہے چمنِ اکبر میں

وہی شوکت وہی حشمت وہی شاہانہ جلوس
وہی دربار ہوا جس کی بھری ہے سر میں

ایسے موقع پہ مراعات کیا کرتے تھے
وہ سلاطین جو تکتے تھے زر و گوہر میں

انھیں الطاف کی امید ہے قیصر سے ہمیں
وہی الفت ہے رعایا کی دلِ قیصر میں

رؤسا پائیں ثمر نخلِ وفاداری کا
ان کا اعزاز بڑھے جان پڑے کشور میں

منتخب کوئی نہ لے آصفِ ہفتم کو خطاب
یہی اعلیٰ ہیں رئیسانِ وفا پرور میں

یہی اس شان کے شایاں ہیں خدا شاہد ہے
ظلِ داور یہی کہلاتے ہیں دنیا بھر میں

ہو مبارک تجھے اے ہند یہ جشنِ شاہی
آج چھلکے گی مئے عیش ترے ساغر میں

مٹ گیا اب تری بے بال و پری کا شکوہ
آ گئی قوتِ پرواز شکستہ پر میں

وقت آیا ہے کہ ابرِ کرمِ شہ برسے
خوں سیروں ہی بڑھے تیرے تنِ لاغر میں

وقت آیا ہے کہ اب اوج پہ قسمت آ جائے
دیر ہوتی نہیں فضل و کرمِ داور میں

تو سبھی ایسے ہوں فرمانِ عنایت جاری
گرد افلاس کا پھر ہو نہ کسی کے گھر میں

ملک آباد رہے شاد رہیں دل سب کے
نام ہوتا ہے انھیں باتوں سے دنیا بھر میں

حالتِ ہند بیان کرنے کی حاجت کیا ہے
کہ ہے سب کچھ نظرِ شاہ جہاں پرور میں

بارک اللہ بہت خوب کہا تو نے جلیلؔ
اس زباں میں جو مزہ ہے وہ نہیں کوثر میں

۱۳۳۰ھ

در مدح اعلیحضرت میر عثمان علی خاں آصف سابع سلطان دکن

بارک اللہ آج گلشن کی ہوا کچھ اور ہے
ہے وہی بلبل کا نغمہ پر مزا کچھ اور ہے

رنگ و بو میں تازگی ایسی خدا کی شان ہے
بوئے گل کچھ اور ہے رنگِ حنا کچھ اور ہے

ناز سے رکنا کبھی شوخی سے بڑھ چلنا کہیں
آج تیری چال اے بادِ صبا کچھ اور ہے

یوں تو جلسے عیش کے ہر روز ہوتے ہیں یہاں
آج کے جلسے کا چرچا جا بجا کچھ اور ہے

آج سینے میں مسرت سے ہے دل بے اختیار
آج کانوں میں نویدِ جانفزا کچھ اور ہے

آج بے مانگے مرادیں مل رہی ہیں غیب سے
آج گلیوں میں فقیروں کی صدا کچھ اور ہے

ہو مبارک یہ گرہ کا جشن آصفجاہ کو
آج شانِ آصفی نامِ خدا کچھ اور ہے

مرحبا کیا ٹھاٹھ ہیں، کیا رعب ہے کیا آن بان
کہتے ہیں تیور یہ شاہانہ ادا کچھ اور ہے

آنکھ پڑتی ہے جو شہ پر دل سے آتی ہے صدا
ہیں تصدق یہ جمالِ دلربا کچھ اور ہے

سیرِ گل سے قلب کو تفریح ہوتی ہے مگر
روئے رنگیں کی بہارِ جانفزا کچھ اور ہے

جلوہ آرا ہے جو خورشیدِ سپہرِ سروری
چشم بد دور آج آنکھوں میں ضیا کچھ اور ہے

ان کے سایے میں رعایا پھولتی پھلتی رہے
جن کے دم سے باغِ عالم کی فضا کچھ اور ہے

سایۂ بالِ ہما ہے قدر کے قابل مگر
حق تو یہ ہے سایۂ ظلِّ خدا کچھ اور ہے

دستِ ہمت سے عطا کرتے ہیں جب گنجِ مراد
پوچھ لیتی ہیں نگاہیں مدعا کچھ اور ہے

تھے جو حاتم کے ثناخواں وہ بھی کہتے تھے یہی
یہ عطا، یہ فیض، یہ جود و سخا کچھ اور ہے

ابرِ دامانِ کرم برساتا ہے سیم و زر
ہم نے دیکھی ہیں گھٹائیں یہ گھٹا کچھ اور ہے

طبعِ روشن پر ہے آئینہ ہر اک رازِ نہاں
یہ صفائی، یہ لطافت، یہ جلا کچھ اور ہے

آصفِ سابع کو عمرِ خضر ہو یارب نصیب
اس سے بڑھ کر کیا دعا گو کی دعا کچھ اور ہے

تجھ سے ممکن ہے کہاں مدح و ثنا لکھنا جلیل
شاہ آصفجاہ کی مدح و ثنا کچھ اور ہے

در مدح اعلیٰحضرت میر عثمان علی خاں آصف سابع سلطان دکن

جشنِ سیمیں میں عجب شوکت و رفعت دیکھی
اور کیا کہیے بس اللہ کی رحمت دیکھی

رنگ وہ ہے کہ جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھا
چشم بد دور مسرت ہی مسرت دیکھی

جوبلی اور بھی شاہوں نے منائی ہوگی
کس نے اس طرح کہیں شوکت و عظمت دیکھی

شاہ کے خاص ندیموں میں ترنم دیکھا
شاہ کی خاص کنیزوں میں سخاوت دیکھی

شہ کی سعی میں فتوحات سکندر دیکھے
شہ کے نقشے میں فلاطوں کی فراست دیکھی

شاہ کے عہد میں پھلتے ہوئے نخلِ امید
شاہ کے سایے میں بڑھتی ہوئی دولت دیکھی

آنکھ جب لگ گئی تقدیر کو دیکھا بیدار
آنکھ جب کھل گئی اقبال کی صورت دیکھی

عدلِ کسریٰ کو فسانہ ہی فسانہ سمجھا
جس نے اس خسروِ عادل کی عدالت دیکھی

صاف دل رکھتے ہیں سب مذہب و ملت والے
آئنہ میں نہ کہیں گرد کدورت دیکھی

دستِ فیاض کو سرچشمۂ رحمت پایا
ذاتِ عالی ہمہ تن چشمِ مروت دیکھی

رعب ایسا کہ شجاعوں کا کلیجہ پانی
تیور ایسے کہ عیاں شیر کی صولت دیکھی

فکرِ عالی میں بلندی و فلک پیمائی
نطق میں سحر و فسوں طبع میں جودت دیکھی

ملک میں ہیں یہ ترقی کے مہیا اسباب
کہیں ثروت کہیں دولت کہیں حشمت دیکھی

تشنہ کامانِ جہاں ہوتے ہیں سیرابِ کرم
موجِ رحمت نگہِ لطف و عنایت دیکھی

جس طرح عام ہو خورشید جہاں تاب کا فیض
سب پہ یکساں شہِ والا کی عطوفت دیکھی

جیسے ماں باپ کو الفت ہو جگر پاروں سے
شاہ کی یوں ہی رعایا سے محبت دیکھی

کودک و پیر و جواں اہلِ عمل جتنے ہیں
دل میں ہر ایک کے آصف سے عقیدت دیکھی

فی الحقیقت یہی سلطان ہیں سلطانِ علوم
دولتِ علم و ہنر جن کی بدولت دیکھی

گرمیِ بزم سے جلتا نہیں پروانہ کوئی
جشنِ سیمیں کی یہ آنکھوں سے کرامت دیکھی

اہلِ صنعت کو اسی دور میں بڑھتے دیکھا
باکمالوں کی اسی عہد میں کثرت دیکھی

شاہ کے ہاتھ ہر اک وقت ہر اک عالم میں
مصطفٰے کی مدد اللہ کی نصرت دیکھی

شہ کا اقبال بڑھے عمر بڑھے جاہ بڑھے
خلق پر جن کی سدا چشمِ عنایت دیکھی

شاہ کے زیرِ نگیں قاف سے تاقاف رہے
باعثِ امن و اماں جن کی حکومت دیکھی

مدحِ سلطاں سے ہے یہ رنگِ قصیدے کا جلیلؔ
حسن ہر لفظ میں ہر شعر میں جدت دیکھی

۱۳۵۵ھ

قطعات تاریخ

جلیل مانکپوری

مرتبہ

جناب علی احمد جلیلی

مقدمہ

غزل کے کلاسیکی روایات کے محافظین میں جو نئے دور کی نئی تحریکات کے مقابلہ میں غزل کو اس کا مقام دلانے میں حریفانہ آئے ان میں فصاحت جنگ جلیلؔ مانکپوری سرفہرست ہیں۔ وہ قدیم سلسلۂ تلمذ کے خاتم اور لکھنوی شاعری کی آبرو تھے۔ بحیثیت شاگرد و جانشین امیرؔ مینائی نہ صرف روایات کے پابند تھے بلکہ دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شاعر بھی۔ نیازؔ فتحپوری نے جناب جلیلؔ کی زندگی ہی میں ان کے تعلق سے لکھا تھا کہ جلیلؔ امیرؔ مینائی کے شاگرد و جانشین ہیں اور ایسے شاگرد و جانشین کہ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو وہ خود ان کے حق میں غزلگوئی سے دستبردار ہوجاتے۔

استادی و شاگردی کی روایت کا جو سلسلہ میر و مرزا سے شروع ہوا تھا جلیلؔ مانکپوری پر ختم ہوگیا ہے۔ وہ اس سلسلے کی آخری یادگار تھے۔ انھیں دہلی و لکھنؤ دبستان کا آخری نام لیوا بھی کہا جاسکتا ہے۔

جلیل حسن جلیلؔ ۱۸۶۶ء میں یو۔ پی کے ضلع پرتاپ گڑھ میں بمقام مانکپور پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے جلیلؔ مانکپوری کے نام سے شہرت پائی۔ بائیس سال کی عمر میں امیرؔ مینائی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے جو اس وقت استاد والئ رام پور تھے۔ رام پور میں جب دفتر امیر اللغات قائم ہوا تو جناب امیرؔ نے مانکپور سے طلب کرکے انھیں اس کا سکریٹری بنادیا (۱۸۹۵ء)۔ پانچ سال بعد امیر اللغات کا دفتر بند ہوجانے کے بعد حضرت امیرؔ مینائی نے حیدرآباد کا رُخ کیا تو جناب جلیلؔ کو بھی اپنے ہمراہ لائے (۱۹۰۰ء)۔ جناب امیرؔ یہاں آتے ہی انتقال فرماگئے اور جلیلؔ مہاراجہ بہادر شادؔ کی سرپرستی میں یہیں رہ گئے۔ اسوقت میر محبوب علی خاں آصف والئ دکن تھے اور جناب داغؔ دہلوی کو ان کی استادی کا شرف حاصل تھا۔ ۱۳۲۲ھ میں داغؔ دہلوی انتقال فرماگئے تو شاہ آصف نے ان کی جگہ جلیلؔ مانکپوری کو دی۔ ۱۹۰۹ء میں ایک فرمان کے ذریعہ استادِ شاہ بن گئے۔ دو سال بعد شاہ آصف نے رحلت پائی تو ان کے جانشین میر عثمان علی خاں نے جلیلؔ کے منصب استادی کو برقرار رکھا۔ تادم آخر دربار سے وابستہ رہے۔ ۱۹۴۶ء میں انتقال ہوا۔

حضرت جلیلؔ نے کم و بیش جملہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی مگر فطری مناسبت کے سبب زیادہ توجہ غزل پر مرکوز رکھی۔ تاہم دوسرے میدانوں میں بھی اپنی فکر کے جوہر دکھائے جن میں تاریخ گوئی بطور خاص قابل ذکر ہے۔

جلیلؔ کے زمانے سے قبل اور خود ان کے دور میں بھی فن تاریخ گوئی کو بڑی وقیع نظر سے دیکھا جاتا تھا اور شاعر کے لیے اس فن سے واقفیت ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اساتذہ سخن میں سے زیادہ تر نے روایتاً اس صنف کو اپنایا ہے اور اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔

لفظ یا الفاظ یا شعر کے کسی جزو سے مروجہ سنین میں سے کسی واقعہ کے ظہور میں آنے کی تاریخ کو حساب جمل کے لحاظ سے نظم بند کرنے کو فن تاریخ گوئی کہتے ہیں۔ اس فن کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ کسی واقعہ کے ظہور میں آنے کی تاریخ کو مستقلاً محفوظ کر لینے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ تاریخ گوئی ایک فن ہے جو تخصیص چاہتا ہے۔ اس میں شاعر کا کام واقعہ کے اظہار کے لیے دانستہ اور شعوری طور پر ایک لفظی پیراہن فراہم کرنا ہوتا ہے جس کے حروف کی عددی قیمت واقعہ کے سنہ تاریخی کے برابر ہو۔

تاریخ گوئی کے یوں تو کئی اقسام ہیں لیکن ان میں تین صورتیں بہت عام ہیں۔

صوری:۔ یہ ایک ایسا اسلوب تاریخ گوئی ہے جس میں مطلوبہ تاریخ یا سال کو واضح الفاظ کی صورت میں بیان کر دیا گیا ہو۔ حرفوں کے اعداد محسوب کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ مثلاً میر امنؔ نے "باغ و بہار" کا سنہ اشاعت یوں نکالا تھا۔

مرتب ہوا جب یہ باغ و بہار　　　　تھا سن بارہ سو سترہ کا شمار

اس قسم کا استعمال تاریخ گوئی میں بہت کم ہے۔ یہی حال ایک اور قسم صوری و معنوی کا ہے لیکن ان کا استعمال تاریخ گوئی میں بہت کم ہے۔ چنانچہ جناب جلیلؔ نے بھی ان پیچیدہ قسموں سے خود کو دور رکھا ہے۔

معنوی:۔ یہ قسم عام اور مروج ہے۔ اساتذہ سخن اور جلیلؔ نے بھی اپنا زور قلم اسی میں دکھایا ہے۔ اہل جمل کے نزدیک تاریخ معنوی مصرعے کے لفظ یا الفاظ کا نام ہے جن کے اعدادِ جمل کے مجموعے سے سنہ مطلوب حاصل ہو۔

جلیلؔ کے یہاں معنوی کی تین صورتیں ملتی ہیں۔

مطلق یا سالم الاعداد:۔ یہ تاریخ معنوی کی وہ صورت عام ہے جو اپنی جگہ مکمل اعداد رکھتی ہو یعنی تاریخ کے الفاظ میں بغیر کسی کمی بیشی کے کل حروف کے اعداد جمع کرنے سے تاریخ کا سال نکل آئے۔ تاریخ گوئی کی سب سے بہتر صورت بھی سمجھی جاتی ہے کیونکہ یہ اپنی جگہ مکمل اعداد رکھتی ہے۔ جلیلؔ کے یہاں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ مثلاً

فصیح الملک داغؔ دہلوی کی وفات کی تاریخ یہ ہے:

ہے مصرع سال رحلت داغؔ　　　　صد حیف وہ دل کو دے گئے داغ
۱۳۲۲ھ

ریاضؔ خیرآبادی کی تاریخ وفات کا مصرع بھی سالم الاعداد ہے۔

کہہ گیا یہ چھلک کے جام ریاض   چمنِ خلد ہے مقامِ ریاض
۱۳۴۳ھ

دوسرے زمرہ میں وہ تاریخیں آتی ہیں جو بذاتِ خود مکمل نہیں ہوتیں۔ جن میں اعداد کی کمی یا بیشی کے لیے تدخلہ یا تخرجہ کا عمل کیا جاتا ہے۔ اگر مادہ تاریخ میں اعداد کی کمی ہو تو اس میں بھرتی کا عمل تدخلہ کہلاتا ہے اور اعداد کی زیادتی ہو تو اس میں کمی کا عمل تخرجہ ہوگا۔

جلیل کے یہاں تخرجہ کی نئی نئی صورتیں ملتی ہیں۔ مثلاً

جلیل مصرعِ تاریخ بے بہا نکلا   کہ آئی شاد سے ملنے کو بنکے رحمت عید
۱۳۸۳ھ

مادہ تاریخ کے اعداد ۱۳۹۱ ہوتے ہیں اور سنہ مطلوب ۱۳۸۳ ہے اس لیے بے بہا کہہ کر بہا کے (۸) اعداد کو خارج کر دیا گیا ہے۔

دوسری مثال سالگرہ کی مبارکباد ہے۔

ادا نکلتی ہے تاریخ میں یہ خوب جلیل   بہارِ گلشنِ جاں ہے یہ شہ کی سالگرہ
۱۳۳۷ھ

مصرعِ تاریخ میں (۱) عدد کی زیادتی تھی۔ ادا یعنی (۱) عدد کے نکلنے سے مطلوبہ سنہ حاصل ہو گیا۔

صنعتِ تخرجہ کی ایک نادر مثال آصف سابع کی تخت نشینی کا قطعہ تاریخ ہے جس میں (۷) عدد کا تخرجہ اس حسن سے کیا گیا ہے کہ اس کا جواب ذیل سے آدہ تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ سات شعر کے قطعہ تاریخ میں (۶) سلاطین آصفی کا ذکر نام بنام کیا گیا ہے۔ ساتویں شعر میں (۶) کے تخرجہ کے ساتھ آصف سابع کی تخت نشینی کا سال یوں نکالا گیا ہے۔

اٹھ گئے چھ تو بفرمانِ خداوند جلیل   میر عثمان علی خاں ہوئے سلطانِ دکن
۱۹۱۱ء

یہ تخرجہ ایسا ہے جس کے سامنے سالم الاعداد تاریخ بھی سرِ خم کرتی ہے۔

اسی طرح جلیل نے تعمیہ کی دوسری صورت یعنی تخرجہ سے بھی کام لیا ہے۔ یعنی کمی کو پورا کرنے کی مختلف صورتیں نکالی ہیں۔ مثلاً

آگیا لب پہ ایک مصرعِ سال   دوسرا شیر بھی شکار ہوا
۱۳۳۳ھ

مادہ میں ایک عدد کی کمی کو لفظ ایک یعنی ایک عدد کے جمع سے پورا کیا گیا ہے۔ ایک اور دوسرا میں جو معنوی رعایت ہے وہ اس مادہ تاریخ کا حسن ہے۔

پڑھو جلیل بآوازِ مصرعِ تاریخ   الٰہی تا بہ ابد ہو شمار سالگرہ
۱۳۳۹ھ

مادہ تاریخ میں (۱۵) اعداد کی کمی تھی۔ آواز کی عددی قیمت (۱۵) سے تدخلہ کا کام لیا گیا ہے۔

حیدرآباد کے ڈیم نظام ساگر کی تعمیر کی تاریخ زرتلہ کی ایک نادر مثال ہے جو فارسی میں ہے:

آبِ در جو آمد و تاریخ گفتم اے جلیل — در دکن آورد عثماں چشمۂ آبِ حیات
١٩٣٢ء

مادۂ تاریخ کے اعداد میں (١٢) عدد کی کمی ہے۔ آب کی عددی قیمت (٣) اور جو کی (٩) ہے۔ یہ دونوں مل کر (١٢) عدد کی تکمیل کرتے ہیں۔

جلیل نے اگرچہ تاریخ کی دیگر صنعتوں کی طرف توجہ نہیں دی ہے تاہم کچھ جدتوں اور صنعتوں کے نمونے مل جاتے ہیں۔ چنانچہ سالم الاعداد تاریخوں میں ایسی تاریخیں بھی ہیں جہاں انھوں نے مکمل مصرعوں کے بجائے مصرعے کے کسی جزو سے تاریخ برآمد کی ہے۔ مثلاً

تاریخ تذکرہ خمخانۂ جاوید

فکرِ سال طبع کرتا ہوں تو کہتا ہے جلیل — فکر ہے کیوں سال کی یہ تذکرہ خود سال ہے
١٣٢٥ھ

تاریخ وفات امیر مینائی

گئے جو خلد بریں کو تو انکی تربت پر — جلیل نے یہ لکھا۔ روضۂ جناب امیر
١٣١٨ھ

جلیل کے یہاں صنعت منقوط میں بھی کئی تاریخیں ملتی ہیں۔ اس صنعتِ منقوط میں حروفِ مہملہ کو چھوڑ کر حروف معجمہ سے تاریخ نکالی جاتی ہے۔

حرفِ منقوط میں تاریخ کہی میں نے جلیل — چھپ گیا شام کو خورشید علی کا صحیفہ
١٣٢٥ھ

اس تاریخ میں بھی نقطہ دار حروف کے اعداد سے مطلوبہ سنہ برآمد ہوتا ہے۔

چو کردم فکرِ تاریخش بہ منقوط — ندا آمد۔ خوشا دیوانِ ناظم
١٩١٠ء

تاریخ گوئی کی ایک صنعت 'صنعت تضاعف' بھی ہے۔ اس صنعت میں تاریخ کے الفاظ کو دہرانے یا دوچند کرنے سے مقصد حاصل ہوتا ہے۔

مطلوب جو تاریخ ہو دیوان کی جلیل — دو بار کہو۔ ہے نعت گوئی اعجاز
٦٦٣

نعت گوئی اعجاز کے تاریخی اعداد (٦٦٣) ہیں۔ اس عدد کو دوچند کرنے سے ١٣٢٦ھ حاصل ہوتے ہیں۔

تاریخ گوئی میں صنعت توشیح بہت کم استعمال ہوتی ہے۔ جلیل کے یہاں ایک ہی تاریخ اس صنعت میں ملتی ہے۔ اس صنعت میں ہر مصرعے کے پہلے حرف کے اعداد کی جمع سے اور اسی طرح ہر مصرعے کے آخری حرف کے اعداد کی جمع سے دو تاریخیں نکلتی ہیں۔ جلیل نے کمال یہ دکھایا ہے کہ آخری مصرعے سے بھی تاریخ نکلتی ہے۔

صنعتِ توشیح سے نکالی ہوئی تاریخ آخری صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

دورِ عثمانی میں سرکاری و حکومتی سطح پر عمارات، مساجد، تالاب اور پل وغیرہ کی تعمیر پر تاریخیں نکلوا کر کتبہ کی صورت میں لگائی جاتی تھیں تاکہ سنہ تعمیر کی یاد باقی رہے۔ یہ تاریخیں عثمان ساگر، نظام ساگر اور جوبلی ہال وغیرہ مختلف مقامات پر نظام حیدرآباد کے حکم سے کندہ ہو کر نصب کی گئی ہیں۔ یہ سب اس کتاب میں شامل ہیں۔

یہ مجموعۂ تواریخ ان سارے قطعاتِ تاریخ پر مشتمل ہے جو جلیل مانکپوری کی فکر کا نتیجہ ہیں۔ ان کے موضوعات ولادت، وفات، اشاعتِ دواوین و کتب، عمارتوں، تالابوں اور پلوں کی تعمیر، شادی اور دیگر تقریبات وغیرہ ہیں۔ یہ زیادہ تر دوست احباب اور اعیان سلطنت کی فرمائشوں پر نکالی گئی ہیں۔ یہ مختلف مسودات میں میرے یہاں بکھری پڑی تھیں۔ میں نے منظم طور پر انھیں ترتیب دیا ہے اور سنہ واری ترتیب کے بجائے مختلف عنوانات کے تحت ان کو تقسیم کر دیا ہے تاکہ ایک ہی نوعیت کی تاریخوں کا تقابلی مطالعہ بھی ہو سکے۔ اس کام کی طرف اردو ریسرچ سنٹر کے جناب عبدالصمد خاں صاحب نے توجہ دلائی۔ میں ان کا شکر گزار ہوں۔

پہلی تاریخ کا سنہ ۱۳۰۰ھ ہے۔ آخری تاریخ ۱۳۶۳ھ میں نکالی گئی۔ اس طرح یہ تاریخیں جلیل کی شاعرانہ زندگی کے ۶۴ سال کی طویل مدت کا احاطہ کرتی ہیں۔ یہ تعداد میں (۲۳۹) ہیں۔ جہاں تک میری معلومات ہے اساتذۂ فن میں سے کسی کے یہاں تواریخ کا اتنا عظیم ذخیرہ نہیں۔

علی احمد جلیلی

تاریخہائے پیدائش

پ۔ فرزند خورشید حسن برادر زادہ مصنف:

آئی یہ صدائے ہاتف غیب ۔۔۔ نو بادۂ باغ آرزو ہے
۱۳۰۰ھ

پ۔ نواب احمد علی خاں بہادر فرزند نواب محمد علی خاں:

عیاں اس سے ہے نام سالِ ولادت ۔۔۔ جگر پارہ نواب احمد علی خاں
۱۳۰۴ھ

پ۔ محمد کاظم خلف سید عبدالستار صاحب خونپوری:

میں نے کیا خوب یہ لکھی تاریخ ۔۔۔ جلوۂ نورِ چشم۔ راحتِ جاں
۱۳۰۶ھ

پ۔ انیس الرحمان فرزند ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب پھلواری شریف:

خوش بود سالِ ولادت بہ انیس الرحمٰن ۔۔۔ مونس جاں بصد اقبال سلامت باشد
۱۳۰۹ھ

ولادت کی تاریخ لکھو جلیل ۔۔۔ یہ نخل تمنا کا پھولا ہے پھول
۱۳۰۹ھ

پ۔ رشید احمد فرزند خورشید احمد صاحب مینائی لکھنوی:

اس کے لیے تاریخ ولادت یہ ہوئی نظم ۔۔۔ خورشید کے گھر جلوۂ ماہِ ہلال ہے
۱۳۱۲ھ

پ۔ فرزند میاں لطیف احمد صاحب مجددی رامپوری:

ہاتف نے مجھے یہ دی بشارت ۔۔۔ نکلا ہے ستارۂ سعادت
۱۳۱۷ھ

پ۔ حامد مرزا فرزند مولوی عزیز مرزا صاحب:

بہ فکر رفتہ و گفتہ جلیل ایں تاریخ ۔۔۔ عزیز خاطر و یوسف لقائے مایۂ ناز
۱۳۲۱ھ

پ۔ محمد خورشید علی خاں فرزند حکیم نظیر علی خاں:

ہوئی جو سالِ ولادت کی فکر مجھکو جلیل ۔۔۔ ندا یہ غیب سے آئی بن نظیر علی
۱۳۲۲ھ

پ۔ محمود شاہ خلف میاں حامد شاہ محدث رامپوری:

جلیل اچھی کہی تاریخ یہ منقوط میں تم نے ۔۔۔ چراغ کعبۂ علم و عمل محمود شاہ آئے
۱۳۲۵ھ

پ۔ مرزا اسداللہ بیگ فرزند مرزا احمداللہ بیگ :

مصرع سالِ ولادت ہے یہ کیا خوب جلیلؔ — دیکھیے دولت و اقبال کا تارا چمکا
۱۳۲۶ھ

پ۔ دخترِ دخترِ سر مہاراجہ بہادر وزارت پناہ بالقابہ :

مصرعِ تاریخ پر وجدؔ آگیا — روشنی آنکھوں کی قوت دل کی ہے
۱۳۲۶ھ

پ۔ مظفر علی فرزند عابد علی :

رقم کرد سالِ ولادت جلیلؔ — کہ طفلِ جواں بخت نیکو نہاد
۱۳۲۷ھ

پ۔ نونہال چمن مراد راجہ آصف پرشاد :

مجکو ہوئی جو فکر ولادت کے سال کی — آئی ندا کہ یہ گلِ باغِ مراد ہے
۱۳۲۸ھ

پ۔ فرزند احمداللہ بیگ :

تاریخ جلیلؔ نے یہ لکھی — چمکا خورشید اوجِ اقبال
۱۳۲۸ھ

پ۔ شہزادہ نواب میر کاظم علی خاں بہادر :

نذر دے یہ مصرعِ تاریخ لکھ کر اے جلیلؔ — خسروِ والا گہر کا ہے یہ لعلِ بے بہا
۱۳۳۰ھ

پ۔ شہزادی بلند اقبال طال عمرہا و زاد اقبالہا :

جلیلؔ مدح گو کی ہے یہ تاریخ — یہ شہزادی تجھے شاہا مبارک
۱۳۳۰ھ

پ۔ شہزادۂ بلند اقبال زاد عمرہٗ و اقبالہٗ :

مصرعِ تاریخ بھی نکلا نیک کہہ دے جلیلؔ — ہو مبارک پانچواں شہزادۂ روشن جبیں
۱۳۳۰ھ

پ۔ شہزادہ نواب میر عابد علی خاں بہادر :

مل گیا اک مصرعِ تاریخ مجکو اے جلیلؔ — تاجِ آصف کا گہر شہزادۂ عابد علی
۱۳۳۱ھ

خوب روشن ہے یہ تاریخ اے جلیلؔ — شاہ آصفجاہ کا نورِ نظر
۱۹۱۲ء

ڈوب کر تاریخ یہ میں نے نکالی اے جلیلؔ — آصفِ بحرِ مروت کا درِ نایاب ہے
۱۳۳۱ھ

پ۔ شہزادہ نواب میر حشمت علی خاں بہادر :

ایک عالم ہے گرویدہ ہے زلیخا کی طرح — حبذا کیا یوسفِ مصرِ دکن پیدا ہوا
۱۳۳۱ھ

ڈھل کے نکلی نور کے سانچے میں یہ تاریخ بھی | کیا منور برجِ شاہی کا قمر پیدا ہوا
۱۳۳۱ھ

پ ۔ شہزادہ نواب تقی علی خاں بہادر :

تاریخ کا مصرع بھی عجب نور فشاں ہے | یہ آنکھ کا تارا ہو مبارک شہ والا
۱۳۳۱ھ
نذر دے یہ مصرع تاریخ لکھ کر اے جلیل | ہو مبارک آصفِ سابع کا سلخ نورِ چشم
۱۳۳۱ھ

پ ۔ شہزادہ نواب میر افتخار علی خاں بہادر :

فکرِ تاریخ کی جو میں نے جلیل | مایۂ افتخار ۔ سال ہوا
۱۳۳۸ھ

پ ۔ رضی الدین (پہلی بھیت) :

جلیل اک تو بھی لکھ سالِ ولادت | کھلا پھول آج باغِ آرزو کا
۱۳۳۱ھ

پ ۔ فرزند سید ابوالبرکات صاحب انور :

خوب روشن ہے یہ تاریخ جلیل | حبذا اک قمر انور ہے
۱۳۴۴ھ

پ ۔ فرزند محمود احمد انور مینائی :

جلیل اس کی تاریخ ہے کیا درخشاں | یہ ہے چشم بد دور آنکھوں کا تارا
۱۳۴۴ھ

پ ۔ فرزند عبداللطیف اڈیٹر آزاد ہند مدراس :

گل کھلا تاریخ کا طبع شگفتہ ہے جلیل | گلشن اقبال کا زیبا ثمر پیدا ہوا
۱۳۴۴ھ

پ ۔ فرزند نفیس بنگلوری :

مصرع اس کی ہے تاریخ یک لخت | مہِ کامل ہے یہ طفل جواں بخت
۱۳۴۷ھ

پ ۔ فرزند محمود احمد مینائی انور :

دیکھنا سال ولادت ہو اگر | دیکھئے اخترِ اقبال آیا
۱۳۴۷ھ

پ ۔ فرزند سید احمد شاہ ابن میاں محمد شاہ محدث رامپوری :

جلیل اکنوں بگو سالِ ولادت | کہ یکتا گوہرِ بحرِ سیادت
۱۳۴۷ھ

پ ۔ عزیز الدین فرزند احمد الدین سابق داروغہ بلاغ عام :

مصرع سال ہے کیسا جامع | کہ ہوا مہرِ شرافت طالع
۱۳۴۸ھ

پ۔ فرزند حافظ عبداللہ صاحب مانکپوری :

جلیلؔ نے یہ چمکتی ہوئی کہی تاریخ — کہ طالع آج ستارہ ہوا سعادت کا
۱۳۴۸ھ

پ۔ فرزند عبدالغنی صاحب :

عجب ضو فشاں ہے ولادت کا سال — یہ خورشید اقبال چمکا ہے آج
۱۳۵۲ھ

پ۔ مصطفےٰ احمد فرزند مونس احمد فرزند مصنف :

جلیلؔ اس کے لیے میں نے جو کی فکر سنِ عمر — دیا ہاتف نے یہ مژدہ۔ سکندر بخت کج آیا
۱۳۵۲ھ

پ۔ فرزند محمد یوسف شرفی بنگلوری :

لکھی یہ جلیلؔ آپ نے کس چاہ سے تاریخ — یوسف کو دیا حق نے پسر یوسف ثانی
۱۳۵۳ھ

تاریخہائے وفات

م۔ عبدالعلیم خاں گوتنی (اودھ) :

جلیلؔ ایک عالم کی ہے یہ زباں پر — جوانی میں ہے ہے دیا داغ کیا
۱۳۱۱ھ

م۔ حافظ محمد غوث خاں حیدرآباد :

لکھو یہ جلیلؔ سالِ رحلت — دے جنت انھیں خدائے باقی
۱۳۱۱ھ

م۔ حضرت استاذی امیر مینائیؔ لکھنوی :

پڑھا جو سب میں اٹھ کر یہ ایک نے مصرع — امیر کشور معنی امیر مینائی
۱۳۱۸ھ

گئے جو خلد بریں کو تو ان کی تربت پر — جلیلؔ نے یہ لکھا۔ روضۂ جناب امیر
۱۳۱۸ھ

م۔ شیخ غضنفر علی جگوری :

جس وقت جلیلؔ کو وہ یاد آتے ہیں — کہتا ہے۔ ہائے شیخ صاحب مرحوم
۱۳۲۱ھ

م۔ شوقؔ نیموی :

جلیلؔ خستہ سے تاریخ جب پوچھی کہا اس نے — کہ تاریخ وفات شوق ہے شوق سخنور ہیں
۱۳۲۲ھ

م۔ داغؔ دہلوی :

ہے مصرع سال رحلت داغؔ — صد حیف وہ دل کو دے گئے داغؔ
۱۳۲۲ھ

م۔ مسعود احمد خلف خاں بہادر محمد صدیق :

لکھو تاریخ یہ بالائے لحد　　داغ کیا دے گئے مسعود احمد
۱۳۲۳ھ

م۔ داروغہ منشی محمد اشرف :

مل گیا ایک مصرعِ تاریخ　　خوابگاہ محمد اشرف ہے
۱۳۲۴ھ

م۔ مولوی خورشید علی کاکوروی :

تاریخ ہو مطلوب اگر تم کو جلیل　　تحریر کرو۔ یغفر لہ تربت پر
۱۳۲۵ھ

حرفِ منقوط میں تاریخ کہی ہے نے جلیل　　چھپ گیا شام کو خورشید علی کا مصحف
۱۳۲۵ھ

م۔ حضرت شاہ التفات احمد سجادہ نشیں ردولی شریف :

اے جلیل این مصرعِ تاریخ آمد حسبِ حال　　اللہ اللہ آں ولی گفت و فنا فی اللہ شد
۱۳۲۶ھ

م۔ دخترِ عبدالرحیم صاحب حسبِ فرمائش شفیع محمد صاحب مدراسی :

بس اور اب بجز سالِ رحلت نہ کہیے　　یہ پھولوں کی ہے سیج تربت نہ کہیے
۱۳۳۴ھ

م۔ خورشید حسین پرتاپ گڑھ :

تاریخ بہ برکت احد ہے　　خورشید حسین کی لحد ہے
۱۳۳۶ھ ۱۳۳۵+۱

جلیل آواز ہاتف آرہی ہے　　نگہ سے چھپ گیا خورشید ہے ہے
۱۳۳۶ھ

م۔ اہلیہ مرزا اکبر بیگ صاحب دہلوی :

بہرِ لوحِ تربتش زیبات تاریخ جلیل　　بیگم والا حسب زیب النسا خلد آشیاں
۱۳۳۷ھ

م۔ مرزا سلامت اللہ بیگ دہلوی :

جلیل مصرعِ تاریخ نقشِ تربت ہو　　یہ خواب گاہ ہے دیکھو سلامت اللہ کی
۱۳۳۷ھ

م۔ حاجی محمد یعقوب حیدرآبادی :

جلیل آکر دیا مژدہ صبا نے　　جگہ دی ان کو جنت میں خدا نے
۱۳۳۷ھ

م۔ محمد شاہ صاحب قبلہ محدث رامپوری :

ثبت بر لوحِ مزارش کن جلیل　　وارثِ دینِ رسول دوسرا
۱۳۳۸ھ

م۔ مولوی مظفر کریم لکھنوی :

ہے دعا بھی سالِ رحلت بھی جلیلؔ　　خلد میں اب انکو گھر دے یا کریم
۱۳۳۴ھ

م۔ عبدالکریم فرزند محمد غوث مدراسی :

جلیلؔ اس لحد پر یہ تاریخ لکھو　　کہ، مرقد میں ہے ہائے ٹکڑا جگر کا
۱۳۴۰ھ

م۔ سلطان مرزا صاحب رامپوری :

مصرعِ تاریخ رضواں کی زبانی ہے جلیلؔ　　قصرِ جنت آج ہے سلطان مرزا کیلیے
۱۳۴۰ھ

م۔ میاں عید و فتحپوری (اہسوہ) :

سالِ رحلت ہے دعا پر شامل　　داخلِ خلد الٰہی ہو جائے
۱۳۴۰ھ

م۔ سید فخر اللہ الہ آبادی :

ہاتف کی جلیلؔ ہے ندا آج　　فخرِ احباب اٹھ گیا آج
۱۳۴۱ھ

م۔ قاضی حمید الدین صاحب دہلوی :

مصرعِ تاریخ لکھو لوحِ تربت پر جلیلؔ　　ہے یہ اس مرحوم کا مرقد کہ جنت کا چمن
۱۳۴۲ھ

م۔ نواب عزیز جنگ بہادر ولاؔ :

سرِ مزار رقم کن جلیلؔ ایں تاریخ　　بیا و بیں کہ ہمیں است خوابگاہِ ولاؔ
۱۳۴۳ھ

م۔ اہلیہ تجمل حسین صاحب حیدرآبادی :

مصرعِ تاریخ لکھو لوحِ تربت پر جلیلؔ　　لو عزیزو تربتِ محبوب بیگم دیکھ لو
۱۳۴۳ھ

م۔ زوجۂ شاہ نظام الدین واعظ جھجری :

تاریخ کی تھی فکر یہ آئی ندا جلیلؔ　　پایا بہشت شاد عزیزالنسا ہوئیں
۱۳۴۳ھ

م۔ محمود احمد صاحب میرٹھی :

بہرِ تاریخش یکے آمد بروں از غیب گفت　　از طفیلِ سرورِ دیں عاقبت محمود باد
۱۳۴۴ھ

م۔ علی الدین حسن مرحوم :

مصرعِ تاریخ لکھو لوحِ تربت پر جلیلؔ　　فاتحہ پڑھ لو علی الدین حسن کا ہے مزار
۱۳۴۴ھ

م۔ شاہ نظام الدین واعظ :

جلیل سنگِ لحد پر لکھو یہ سالِ وفات　　　کہ آہ کعبۂ دیں مولوی نظام الدین
۱۳۴۵ھ

م۔ اعتبار الملک سید افتخار حسین مضطر خیر آبادی :

جلیل اس سانحہ کی ہے یہ تاریخ　　　اٹھا آج اعتبار ملک معنی
۱۳۴۵ھ

م۔ سید شاہ عبد الہادی فتحپوری :

فکر تھی تاریخ کی آواز غیب آئی جلیلؔ　　　قصر جنت میں مکیں ہیں آج وہ قطب کمال
۱۳۴۵ھ

م۔ حاجی عبد الرزاق عاصی وکیل :

لوح تربت پہ لکھو تاریخ رحلت اے جلیلؔ　　　خلد کا ہے گلشن جاوید عاصی کے لیے
۱۳۴۵ھ

م۔ حکیم امتیاز الدین حسین افسر الاطباؔ حیدر آباد :

بہر نقش تربتش تاریخ یکتا یافتم　　　مرقد شاہ اطباؔ امتیاز الدین حسین
۱۳۴۶ھ

م۔ اہلیہ حبیب محسن میجر افواج حیدر آباد :

جلیلؔ آرہی ہے یہ آواز ہاتف　　　جگہ ان کو جنت میں دی اب خدا نے
۱۳۴۶ھ

م۔ خاتون شفیع محمد میونسپل کونسلر مدراس :

جلیلؔ سنگِ لحد پہ یہ نقش ہو تاریخ　　　بہشت پاک عزیز النسار کا مرقد ہے
۱۳۴۶ھ

م۔ اہلیہ سید محمد صاحب پیر بغدادی :

مصرع تاریخ لکھو لوح تربت پہ جلیلؔ　　　خلد میں ہیں آج وہ مرحومۂ قدسی نہاد
۱۳۴۷ھ

م۔ میر ریاض الدین صاحب لکھنوی :

نقش کن بر تربتش سالِ وفات　　　واصل حق گشتہ آں عالی گہر
۱۳۴۷ھ

م۔ سید شاہ حسین مدراسی :

واصل حق گشت وگفتم بہر تاریخش جلیلؔ　　　پاک باطن محرم اسرار سید شاہ حسین
۱۳۴۷ھ

م۔ سید محمد نوح صاحب شہیر (مچھلی شہری) :

جلیلؔ خستہ نے تاریخ لکھی لوحِ تربت پر　　　شہیر نامور والا نسب کا آہ مرقد ہے
۱۳۴۸ھ

م۔ والدۂ ڈاکٹر عزیز حسن کاکوروی :

گئیں دارِ فانی سے آئی ندا
وہ مرحومہ جنّت کے ہیں قصر میں
۱۳۴۸ھ

م۔ اہلیہ نہال احمد فرزندِ مصنف :

گئی جہاں سے یہ لکھی جلیل نے تاریخ
کہ آج خلد میں جا کر بسی ہے مرحومہ
۱۳۴۸ھ

م۔ سید فضل الرحمٰن وکیل کانپوری :

نقش کر تاریخِ رحلت لوحِ تربت پر جلیل
قصرِ جنّت میں مکیں ہیں سید نیکو نہاد
۱۳۴۸ھ

م۔ احمد اللہ خاں خلف حشمت اللہ خاں :

مل گیا اک مصرعِ تاریخِ رحلت اے جلیل
احمد اللہ خاں نے پایا آج گلزارِ ارم
۱۳۴۸ھ

م۔ طاہرہ بیگم امروہہ :

سالِ رحلت ہے یہ موزوں اے جلیل
طاہرہ ہیں قصرِ جنّت میں مکیں
۱۳۴۸ھ

م۔ فرید حسین مرحوم :

جلیل نے یہ لکھا سال ان کی رحلت کا
گئے بہشتِ معلّیٰ کو اب فرید حسین
۱۳۴۸ھ

م۔ علامہ سراج الحسین :

سالِ رحلت نوشت کلکِ جلیل
شد سوئے خلد آں یگانۂ دہر
۱۳۵۰ھ

م۔ مختار بیگم :

قضا کر گئیں سال لکھو جلیل
سوئے خلد مختار بیگم گئیں
۱۳۵۰ھ

م۔ اہلیہ شاہ فصیح اللہ صاحب :

تاریخ لکھو جلیل کہ خوشدل ہوں سب حبیب
یا رب پئے بتولِ ہو جنت اسے نصیب
۱۳۵۰ھ

م۔ اہلیہ محمد حنیف صاحب موآئمہ :

لکھو جلیل یہ سالِ وصالِ مرحومہ
کہ ہے بہشت بریں میں وہ آج معصومہ
۱۳۵۰ھ

م۔ فضل الرحمٰن وکیل کانپوری :

لکھو سرِ قبر یہ تاریخ اے جلیل
خواب گاہ سید والا تبار
۱۳۵۰ھ

م۔ اہلیہ محی الدین احمد نائب ناظم:

جلیلؔ اچھا یہ نکلا ایک مصرع سال رحلت کا — مرزا فاطمہ بیگم پہ رحمت سایہ افگن ہے
۱۳۵۱ھ

م۔ زوجہ محمد احمد صاحب ناظم پٹنہ:

جلیلؔ سال یہ رحلت کا ایک نکلا ہے — انیس فاطمہ جنت میں ہے رفیق دلھن
۱۳۵۲ھ

م۔ مرزا محمد عباس بیگ نقشبندی:

مصرع تاریخ لکھو لوح تربت پر جلیلؔ — الفراق اے میرزا عباس بیگ نقشبند
۱۳۵۲ھ

م۔ عمدۃ النساء بیگم:

نوشت مصرع سال وفات کلک جلیلؔ — شدہ بہ دار بقا عمدۃ النساء بیگم
۱۳۵۲ھ

م۔ اہلیہ غازی الدین احمد:

نکلے ایک لا مصرع تاریخ جلیلؔ — خالق پاک سے واصل ہوئیں انور بیگم
۱۳۵۲ھ

م۔ محمد احمد صریر مینائی فرزند امیر مینائی:

ایک نکلا لکھے تاریخ کا مصرع جلیلؔ — مدفن منشی محمد احمد جنت مقام
۱۳۵۲ھ

م۔ جناب صادق قریشی:

سال رحلت ایک ہاتھ آیا جلیلؔ — یار صادق تھے وہ جنت کو گئے
۱۳۵۲ھ

م۔ اہلیہ عماد حسن:

سال وفات انکا یہ لکھا جلیلؔ نے — معصومہ فاطمہ گئی خلد بریں کو آج
۱۳۵۲ھ

م۔ مولوی امام الدین:

لکھی جلیلؔ نے تاریخ رحلت مرحوم — مقیم خلد ہیں مقبول حق امام الدین
۱۳۵۲ھ

م۔ خاتون حبیب خاں کلکتہ:

لکھو تم جلیلؔ ان کی تاریخ رحلت — کہے آہ یہ تربت نیک بانو
۱۳۵۳ھ

م۔ آفاق بنارسی:

جلیلؔ لکھو سر تربت یہ مصرع تاریخ — مقیم خلد بریں جا کے ہوگئے آفاق
۱۳۵۲ھ

م۔ منیر الزماں خاں والد صدیق الزماں مینائی:

جلیل اب ہو تاریخ حسب رواج
منیر الزماں خاں جناں میں ہیں آج
۱۳۵۳ھ

تاریخہائے دواوین، رسائل، لغات وغیرہ

رسالہ منظر الاسلام مولفہ مذاق تعلقدار ریاداں اودھ:

جلیل ہم نے یہ تالیف کی لکھی تاریخ
درود پڑھنے کے لائق ہے جو روایت ہے
۱۳۰۸ھ

دیوان مہتاب داغ فصیح الملک داغ دہلوی:

مطلع نور ہے یہ مصرع سال
کیا نیا چاند ہے کہ داغ نہیں
۱۳۱۰ھ

ناول تصویر جناب یاس خیرآبادی:

ہٹتی نہیں آنکھ میں سماکر یہ جلیل
تصویر ہے یا آنکھ کی یہ پتلی ہے
۱۳۱۰ھ

کیا کہوں جادو کہ جادو خود یہ کہتا ہے جلیل
صدقے جادو ایسی جیتی جاگتی تصویر کے
۱۸۹۳ء

تاریخ الانبیاء جناب فیروز رامپوری:

راحت جاں شدہ ایں مصرع تاریخ از او
راحت دل سیر پاک بنی اسرائیل
۱۳۱۰ھ

دیوان جناب تشنہ:

جلیل از پے تاریخش رقم زد
چہ دیواں چشمۂ آب حیات است
۱۳۱۰ھ

دیوان اول نواب سید بنیاد حسین خاں تلمیذ امیر:

کہی اس کی تاریخ ہم نے جلیل
اسے کہیے فیض جناب امیر
۱۳۱۳ھ

دیوان صنمخانۂ عشق امیر مینائی:

خوب دیکھا تو صنم خانہ کو
پایا بتخانۂ آذر کا جواب
۱۳۱۳ھ

کہف المتین حضرت شاہ محمد معصوم صاحب نقشبندی مجددی:

پا کے خوشبو ہم نے حسرت سے گذارش کی جلیل
خوب ہی کھینچا ہے یہ عطر آپ نے اوراد کا
۱۳۱۷ھ

بوسہ دینے سے تو ہوتی نہیں تسکین جلیل
دل میں رکھ لینے کے قابل ہے کتاب معصوم
۱۳۱۷ھ

دیوان سفیرؔ حیدرآبادی تلمیذ امیرؔ مینائی :

یہ خنجر اور نشتر جس نے دیکھے — کہا کیا بات اس بانکے سخن کی
١٣١٨ھ

دیوان میکشؔ تھانوی :

میں نے بھی کہی ڈوب کے تاریخ اسکی — ہے دارو بیخودی کلام میکش
١٣١٨ھ

داسوخت مختارؔ شاہجہاں پوری :

جس نے یہ داسوخت دیکھا کہا وہ اے جلیلؔ — گرمیٔ اشعار نے پھونکے دل و جان و جگر
١٣١٨ھ

دیوانِ برقؔ :

کہ رہا ہے خود یہ دیوان اے جلیلؔ — دیکھنا ہیں برقؔ کے اشعار گرم
١٣١٩ھ

ناول چنچل نار مہاراجہ بہادر شادؔ :

ختم ناول کی کہی تاریخ میں نے اے جلیلؔ — کتنی پاکیزہ زباں ہے صاف ہے کتنا بیاں
١٣٢٠ھ

میں نے بھی جلیلؔ اس ناول کی تاریخ کہی کیا گرم — اک برق جفا اک سوز نہاں پرکالا آتش چنچل نار
١٩٠٣ء

دیوان دوم جناب جاہؔ تلمیذ حضرت امیرؔ مینائی :

بولا یہ جلیلؔ سن کے سب کی — واللہ ہے خاص امیرؔ کا رنگ
١٣٢٠ھ

کلیات سحرؔ رئیس محمود آباد :

طبع دیوان شد و گفتم تاریخ — سحر آمیز سخنہائے سحر
١٣٢٠ھ

دیوان کوثرؔ ساکن بمبئی :

کہتے ہیں یہ سب مصرع تر اسکے جلیلؔ — دیوان نہیں دیکھو چشمۂ کوثر ہے
١٣٢٠ھ

کتاب دربار دہلی فیروزالدین :

ایک نکلا ہے یہ مصرع سال کا — قیصری دربار کا نقشہ کھنچا
١٣٢١ھ

تاریخ تیموری :

ہوئی تاریخ کی جب فکر مجھ کو — ندا آئی ۔ نظام ملک گیری
١٣٢١ھ

تزکِ محبوبیہ :

جلیلؔ اچھی کہی تاریخ تم نے — مرقع ہے یہ اخوان الصفا کا
١٣٢١ھ

دیوان سراج بادشاہ قادری:

جلیلؔ آنکھیں ہوں روشن وہ لکھو تاریخ نورانی — کلام صاحب عرفاں سراج بزم عرفاں ہے
۱۳۲۲ھ

طبع دیوان مولانا شبیر تعلقدار مچھلی شہر:

جلیلؔ اچھی کہی تاریخ تم نے اس کے چھپنے کی — کہ یہ دیوان گنجینہ ہے مضموں ہائے عالی کا
۱۳۲۳ھ

دیوان فیاض موسوم بہ ثمرۂ حیات:

جلیلؔ پیش نظر ہے کلام تازہ و تر — دل آج اٹھائے مزے ثمرۂ فصاحت سے
۱۹۰۶ء

دیوان نعت مفتی سید اعظم شائق:

اس سخن کے لیے موزوں ہے یہ تاریخ جلیلؔ — ذکر محبوب کا ہے کیوں نہ ہو محبوب ہمیں
۱۳۲۴ھ

غرائب الجمل مولفہ جناب ولاؔ:

سال جو آپ کا پوچھے کہو اس سے جلیلؔ — بے بہا آئینہ تاریخ گوئی سال ہے
۱۳۲۵ھ

خمخانۂ جاوید تذکرۃ الشعرا:

فکر سال طبع کرتا ہوں تو کہتا ہے جلیلؔ — فکر ہے کیوں سال کی یہ تذکرہ خود سال ہے
۱۳۲۵ھ

ایضاً اشاعت

مصرع تاریخ لکھ کر داد دیتا ہے جلیلؔ — یہ کھنچا زیبا مرقع شاعران دہر کا
۱۳۲۶ھ

دیوان نعتیہ موسوم بہ ہدیۂ شادؔ (مہاراجہ شاد):

جلیلؔ عرش سے آیا ہے مصرع تاریخ — درود پڑھنے کے قابل ہیں نعت پاک کے پھول
۱۳۲۵ھ

دعا بھی ہے یہی تاریخ طبع بھی ہے یہی — قبول خاطر محبوب رب کلام یہ ہو
۱۳۱۵ھ

جب یہ کہہ لو تو پھر پڑھے تاریخ — مدح پیغمبر [illegible] کہو
۱۳۲۵ھ

مطلوب جو تاریخ ہو دیوان کی جلیلؔ — دو بار کہو ہے نعت گوئی اعجاز
۱۳۲۶ھ

مجموعۂ رباعیات شفق رامپوری:

مصرع تاریخ تم لکھو جلیلؔ — ہر رباعی تازگی میں فرد ہے
۱۳۲۵ھ

دیوان عبداللہ خاں شاعر لکھنوی:

چھپ گئے جو ہوا شائع اشعار کا مجموعہ — تاریخ کہی میں نے، دیکھو سخن شاعر
۱۳۲۶ھ

دیوان صمیم:

جلیلؔ مصرع تاریخ گفت دگوہر سفت　　ہیں کلام صمیم سخن طراز ہیں
۱۳۲۶ھ

دیوان مضطر دہلوی:

صدائے چھپنے کا سن کے مژدہ ہوئے ہزاروں کے دل شگفتہ　　جلیلؔ نے سال طبع اس کا لکھا کلام فصیح مضطر
۱۳۲۸ھ

دیوان نواب ناظم:

چو کردم فکر تاریخش بہ منقوط　　ندا آمد خوشا دیوان ناظم
۱۹۱۰ء

دیوان نواب عزیز جنگ بہادر ولاؔ:

ایں مصرع تر گفت جلیلؔ از پے سالش　　دیوان گہر ریزہ دگہر بیز ہمیں ست
۱۳۲۸ھ

دیوان صغیر:

بنوشت جلیلؔ مصرع سال　　دیوان صغیر نکتہ دانے
۱۹۱۱ء

دیوان وفاؔ:

یہ تاریخ چھپنے کی لکھ دو جلیلؔ　　فصیح و دل آویز نظم وفاؔ
۱۳۲۹ھ

رسالہ لمعۂ ابن شعلہ:

جلیلؔ اچھی ہوئی تاریخ اس کی　　یہ اک گلدستۂ بزم سخن ہے
۱۳۲۹ھ

خمخانۂ جاوید:

پے سال طبعش رقم زد جلیلؔ　　زمانہ بود مست خمخانہؔ
۱۹۱۱ء

دیوان ضیاؔ دہلوی:

طبع دیواں کی خوب ہے تاریخ　　مونس جاں ہے یہ کلام ضیاؔ
۱۳۳۲ھ

دیوان صحوؔ حضرت آغا داؤد:

کیا خوب جلیلؔ آپ نے تاریخ نکالی　　یہ صحوؔ کا دیواں ہے کہ اک دفتر عرفاں
۱۳۳۲ھ

دیوان شمشیر لال خانصاحب کوتوال بلدہ حیدرآباد:

مصرع تاریخ بھی ہے خوب موزوں لے جلیلؔ　　آج کیا شمشیر کے جوہر نمایاں ہوگئے
۱۳۳۲ھ

دیوان نواب عزیز جنگ ولاؔ :

مصرعِ تاریخ موزوں ہے جلیلؔ   شعر ہیں دلچسپ شاہ لاجواب
۱۳۲۸ھ

دیوان سید مومن فریادؔ رائے بریلی :

مصرعِ تاریخ نکلا فکرِ روشن سے جلیلؔ   ہوگئی کیا گرم بزمِ شاعری فریاد سے
۱۳۳۷ھ

دیوان نواب عزیز جنگ ولاؔ :

طبع کی تاریخ لکھو تو بھی جلیل   ایک دلبر ہے یہ نیرنگِ سخن
۱۳۳۷ھ

کلامِ نعت عزیز جنگ بہادر ولاؔ :

جلیل اس حلیۂ منظوم کی تاریخ لکھ تو بھی   سراپائے رسولِ پاک دیکھو کتنا پیارا ہے
۱۳۳۸ھ

دیوان حبیب الرحمن معلیٰ حیدرآبادی :

جلیلؔ ایں چنیں گفت تاریخ طبعش   کہ الہامِ غیبی کلامِ معلےٰ
۱۳۴۰ھ

دیوان حبیب اللہ عشقؔ مدراسی :

طبع کا سال بھی موزوں ہے جلیلؔ   دخترِ عشق یہ دیواں نکلا
۱۳۴۱ھ

کتاب گنجینۂ سلیمانی مظفر حسین بھوپالی :

جلیلؔ اس کے لیے تاریخ بھی کیسی بری نکلی   یہ ہے اک نسخۂ اکسیر یا گنجِ سلیمانی
۱۳۴۲ھ

دیوان نواب فصیح یار جنگ بہادر علامی :

بگو جلیل پے طبع سال دیوانش   فصیح و دلکش و نیکو کلامِ علامی ست
۱۳۴۲ھ

رسالہ قاضی ظہور الحسن ناظمؔ سیوہاروی :

بے بہا تاریخ نکلی اس کے چھپنے کی جلیلؔ   کیا رفیق و رہنما ہے عالمِ اسرار ہے
۱۳۴۳ھ

دیوان سید عباس حسن فصاحت لکھنوی :

جلیلؔ اچھی کہی تاریخ رنگیں طبع دیواں کی   کھلے ہیں روح افزا پھول گلزارِ فصاحت کے
۱۳۴۳ھ

دیوان سید شاہ یحییٰ عالم قادری سجادہ نشیں :

کہی جلیلؔ نے تاریخِ طبع "جلوۂ طور"   کلام ہیں ہے یہ شوخی زبانِ موسیٰ کی
۱۳۴۳ھ

دیوان محمود شاگرد ظہیر دہلوی :

طبع دیواں کی کہی تاریخ یہ نے اے جلیل — لائق صد آفریں محمود کے ہیں شعر آج
۱۳۴۲ھ

طبع دیوان جناب آفاق بنارسی :

یہ تاریخ بھی کیا نزاکت بھری ہے — عروس سخن کیا ہے آج اک پری ہے
جس جگہ دو دل کے بیٹھے ہیں یہ کہتے ہیں جلیل — چھاگئے ہیں شعر سب آفاق کے آفاقی پر
۱۳۴۴ھ

دیوان مظفر حسین خاں سلیمانی شاہ آبادی :

مصرع سال ہے حقیقت حال — یہی دیکھا ہے بے نظیر چمن
۱۳۴۵ھ

طبع دیوان مرزا بہادر یاور :

ہے لاجواب مصرع تاریخ بھی جلیل — یاور کے شعر موجۂ آب حیات ہیں
۱۳۴۶ھ

نور اللغات نیر کاکوری :

تاریخ یگانہ ہے تو یہ ہے — اردو کا خزانہ ہے تو یہ ہے
۱۳۴۹ھ

کتاب تقریب المراد :

مصرع تاریخ لکھ روشن جلیل — ہے سراج دیں یہ تقریب المراد
۱۳۴۶ھ

طبع دیوان ارمغان صمیم :

طبع کا سال بھی ہے خوب جلیل — بے بہا ارمغان زیبا ہے
۱۳۴۷ھ

دیوان ظہور الحسن ناظم :

اشاعت کی تاریخ پیاری ہے یہ — کہ ناظم کی جادو نگاری ہے یہ
۱۳۴۸ھ

طبع دیوان اشرف :

طبع کی تاریخ اچھی ہے جلیل — چشم بد دور اشرف و اعلیٰ کلام
۱۳۴۸ھ

کتاب محبوب حضرت ناظم :

طبع جس دم ہوئی تاریخ کہی میں نے جلیل — کہ یہ ہے حل علی خوب کتاب محبوب
۱۳۴۹ھ

دیوان طوفان حیدر آباد :

طبع کی تاریخ تم لکھو جلیل — بے بہا ہے مثل نعت مصطفےٰ
۱۳۵۱ھ

رسالہ المجبوب مدیر حامد میاں :

طبع کا سال اشاعت نذر دے لکھ کر جلیلؔ ‏ ‏ ‏ تحفۂ مجبوب المجبوب ہے نام خدا
۱۳۵۱ھ

کلامِ واصفؔ :

طبع کا سال ایک نکلا ہے جلیلؔ ‏ ‏ ‏ دلکش و نادر ہے گیلانے خیال
۱۳۵۱ھ

دیوان قربانؔ :

تاریخ طبع دیوان تم بھی جلیلؔ لکھو ‏ ‏ ‏ جو شعر ہم نے دیکھا قند و نبات پایا
۱۳۵۱ھ

کتاب معین الشعرا آفاق بنارسی :

جلیلؔ اس کی تصنیف کا سال لکھو ‏ ‏ ‏ کہ تالیف بھی نسخۂ کیمیا بھی
۱۳۵۲ھ

تاریخہائے شادی

کتخدائیِ نواب فرخندہ حسین خاں :

جلیلؔ اس جشن کی تاریخ ہجری ‏ ‏ ‏ یہ لکھ دو شادی فرخندہ بنیاد
۱۳۲۱ھ

کتخدائیِ دختر احمد حسین صاحب معتمد پیشی حضور پرنور :

سال لکھا یہ بصد زینت و زین ‏ ‏ ‏ حبذا ہے یہ قران السعدین
۱۳۱۷ف

کتخدائیِ ہمشیرۂ والیِ دکن :

مصرعِ تاریخ بھی ہے خوب روشن اے جلیلؔ ‏ ‏ ‏ بارک اللہ دو ستارے جلوہ گر ہیں ایکجا
۱۳۳۴ھ

شادی نواب غلام محمد نور اللہ (مدراس) :

جلیلؔ اس خوشی کی یہ تاریخ لکھئے ‏ ‏ ‏ مبارک ہو یارب انھیں عقد ثانی
۱۳۳۸ھ

شادی شفیع محمد صاحب (مدراس کونسلر) :

مطلع انوار ہے تاریخ کا مصرع جلیلؔ ‏ ‏ ‏ ہو گیا اچھا قران آفتاب و ماہتاب
۱۳۴۲ھ

کتخدائیِ سید ابو البرکات انور :

چرخ سے آواز آتی ہے جلیلؔ ‏ ‏ ‏ مرحبا اک جا ہیں ماہ و مشتری
۱۳۴۳ھ

کتخدائیِ شاہ نظام الدین خلف متاع الدین :

جلیلؔ اس کتخدائی کی کہی تاریخ یہ میں نے ‏ ‏ ‏ کہ یا اللہ مبارک اب ہو شادی خانہ آبادی
۱۳۴۳ھ

کتخدائی یس۔ اے شفیع محمد (مدراس):

ہاتفِ غیبی یہ دیتا ہے صدا ہیہم جلیلؔ
آؤ اب دیکھو قران آفتاب و ماہتاب
۱۳۴۵ھ

شادی نواب محمد علی خاں فرزند نواب مظفر یار جنگ:

جلیلؔ سخنور نے تاریخ لکھی
کہ ہو آپ کو کتخدائی مبارک
۱۳۴۸ھ

عقد عبداللطیف فاروقی:

عقد کا سال خوب ہے یہ جلیلؔ
مہ و خورشید مل گئے ہیں آج
۱۳۵۰ھ

تحفۂ نادر ہے اس موقع پہ تاریخ جلیلؔ
فانکحوا ما طاب کی تفسیر یہ شادی ہوئی
۱۳۵۰

تاریخہائے تہنیت

عید سعید بہ پیشگاہ سلطانِ دکن میر محبوب علی خاں:

کہتی ہے خوشی آج گلے مل مل کر
ہو شاہ کو یا خدا مبارک یہ عید
۱۳۲۱ھ

تہنیت عید اضحیٰ سلطانِ دکن میر عثمان علی خاں:

عید اضحیٰ ہو مبارک اے شہ عالی وقار
۱۹۱۱ء
عید قرباں ہو مبارک اے شہ دریا نوال
۱۳۲۹ھ

جشن سال گرہ مبارک:

تاریخ کا مصرع ہے جلیلؔ اپنی زباں پر
کیا عیش فزا عقدہ کشا سال گرہ ہے
۱۳۳۰ھ

تہنیت جشن عید اضحیٰ:

نذر دے تاریخ کا مصرع جلیلؔ
عید قرباں بھی ہے قرباں شاہ پر
۱۳۳۰ھ

جشن سالگرہ مبارک:

زباں پر مصرع تاریخ بے بہا آیا
مبارک اے شہ عالی وقار سالگرہ
۱۳۳۳ھ

جشن سالگرہ مبارک:

اٹھا جو دست دعا ہاتھ آگئی تاریخ
کلید گنج سعادت ہے شہ کی سالگرہ
۱۳۳۴ھ

جشن عید سعید:

اے جلیلؔ اک مصرع تاریخ نکلا لاجواب
شاہ عثماں سے گلے ملنے کو عید آئی ہے آج
۱۳۳۳ھ

جشن عید اضحیٰ :

میں نے یہ سال عید نکالا ہے بے بہا
ہر شب شب برات ہو ہر روز عید ہو
۱۹۱۶ء

جشن سالگرہ مبارک :

ادا کے ساتھ ہوئی جلوہ گر نئی تاریخ
بہار عیش ہے شاہِ دکن کی سالگرہ
۱۳۳۵ھ

جشن سالگرہ مبارک :

جلیلؔ مصرعِ تاریخ بے بدل نکلا
نئی بہار دکھاتی ہے شہ کی سالگرہ
۱۳۳۶ھ

جشن سالگرہ مبارک :

ادا نکلتی ہے تاریخ میں بھی خوب جلیلؔ
بہار گلشنِ جاں ہے یہ شہ کی سالگرہ
۱۳۳۷ھ

جشن سالگرہ مبارک :

پڑھو جلیلؔ بآواز مصرعِ تاریخ
الٰہی تا بہ ابد ہو شمار سالگرہ
۱۳۳۷ھ

جشن سالگرہ مبارک :

جلیلؔ مصرعِ تاریخ کیا ملا زیبا
ہزاروں سال ہو یہ یادگار سالگرہ
۱۳۴۰ھ

جشن سالگرہ مبارک :

نذر دے اے جلیلؔ مصرعِ سال
شاہ عثماں کی ہے یہ سالگرہ
۱۳۴۳ھ

سالگرہ سید گل محمد یحییٰ سہروردی :

جلیلؔ مصرعِ تاریخ خوب موزوں ہے
خدا کی شان نئی عید عید میں آئی
۱۳۴۵ھ

تہنیت عید صیام بخدمت مہاراجہ شادؔ :

بارگاہ حق میں ہو مقبول تاریخ جلیلؔ
شاد کے گھر روز یارب تو بہار عید ہو
۱۳۴۵ھ

تہنیت عید اضحیٰ بخدمت مہاراجہ بہادر شادؔ :

جلیلؔ اچھی تاریخ تم نے نکالی
ہوئی شاد پر عید قرباں بھی قرباں
۱۳۴۵ھ

تہنیت عید اضحیٰ بہ عالیجناب مہاراجہ شادؔ :

شرف یہ خاص ہے دربار شاد صوفی کا
کہ جام بادۂ توحید لے کے عید آئی
۱۳۴۶ھ

تہنیت عید صیام مہاراجہ بہادر شاد:

اچھا نکلا جلیل یہ سال　　دن عید شب برات شب ہو
۱۳۳۶ھ

تاریخہائے عطایا

عطائے شمشیر:

لکھ چمکتی ہوئی تاریخ جلیل　　آج شمشیر عطا کی شہ نے
۱۳۲۹ھ

عطائے انگشتری:

کی عطا انگشتری تاریخ نکلی اے جلیل　　دی شہ یکتا نے یہ مہر سلیمانی مجھے
۱۳۲۹ھ

عطائے گھڑی، توڑا، بٹن:

کہی تاریخ ایسی جو ہے آب زر سے لکھنے کی　　گھڑی توڑا بٹن سونے کے اپنے شاہ سے پائے
۱۹۱۲ء

عطائے انگشتری:

نذر دے تاریخ یہ لکھ کر جلیل　　ایک انگوٹھی ہاتھ آئی شاہ سے
۱۳۳۱ھ

عطائے جامہ دار:

باادب کر عرض یہ مصرع جلیل　　شاہ نے تشریف دولت کی عطا
۱۹۱۳ء

عطائے کمخواب:

سال این لطف و عطا کز شاہ شد　　داد خلعت آصف جمجاہ شد
۱۳۳۲ھ

عطائے شملہ:

مصرع تاریخ لکھ کر پیش کرتا ہے جلیل　　سرفراز آصف نے مجھکو ایک شملہ سے کیا
۱۳۳۲ھ

عطائے جامہ دار:

فرد نکلا یہ مصرع تاریخ　　اے خوشا جامہ دار سلطانی
۱۳۳۲ھ

عطائے کمخواب:

تاریخ ہے اس خلعت شاہی کی جلیل　　سرکار نے کمخواب عطا کی ہے آج
۱۳۳۳ھ

تاریخہائے تعمیر عمارات، تالاب، مساجد وغیرہ

باغ نواب محمد علی خاں بہادر موسوم بہ خواجہ گلشن :

جلیلؔ اچھا کہا ہے تم نے یہ تاریخ کا مصرع   ہوا ہے خواجہ گلشن سیما جان کی دل کی
۱۳۱۹ھ

منیر باغ وغیرہ منیر الزماں خاں تحصیلدار :

تاریخ چاہتے ہیں اگر آپ اے جلیلؔ   کہیے منیر باغ بھی جنت کا ہے چمن
۱۹۰۲ء

تعمیر ہال مدرسہ آصفیہ حیدرآباد :

ان کے حق میں ہے دعا تاریخ کا مصرع جلیلؔ   دے جزا اس کی تمھیں پروردگارِ دو جہاں
۱۳۲۳ھ

چاہ پختہ واقع صمد آباد ضلع پرتاب گڑھ (اودھ) :

سال ہجری کے لیے کہتا ہے یہ زار و نحیف   چشمۂ کوثر کا ہمسایہ ہے یہ چاہ لطیف
۱۳۲۶ھ

تیاری تعمیر اتالیق منزل محمد کامل صاحب :

لکھی اس کی تاریخ میں نے جلیلؔ   یہ بے مثل اتالیق منزل بنی
۱۳۲۸ھ

نور محل واقع کاکوری :

نور کے خط میں لکھو مصرع تاریخ جلیلؔ   چشم بد دور بنا نور محل منزل نور
۱۳۲۹ھ

عثمان ساگر :

سنگِ بنیاد کی تاریخ یہ اچھی ہے جلیلؔ   موجزن چشمۂ فیضِ شہِ دریا دل ہے

سنگِ بنیاد جو رکھا تو ندا یہ آئی   دیکھنا چشمۂ رحمت یہ ہوا جاری آج
۱۳۳۱ھ

تعمیر نقار خانہ عثمانی درگاہ اجمیر شریف :

جلیلؔ مصرع تاریخ ایں چنیں گفت   بہ پائداری نقار خانہ عثمانی
۱۹۱۳ء

جلیلؔ نذر شہ دیں پناہ کرتا ہے   عجب وسیع ہے نقار خانہ عثمان
۱۹۱۳ء

افتتاح خلوت مبارک (دیوان دربار) :

باادب کرو عرض یہ تاریخ کا مصرع جلیلؔ   کیا نیا ہے قصر شاہی کیا نیا دربار ہے
۱۳۳۳ھ

تعمیر یادگار زیب النسا بیگم بنت شاہ اورنگ زیب عالمگیر:

مصرعِ تاریخ نقشِ صفحۂ عالم ہے
یادگار بنت عالمگیر دارائے جہاں
۱۳۳۴ھ

تعمیر دربار ہال واقع باغ عام:

موزوں ہے خوب مصرعِ تاریخ اے جلیل
ایوان جشن سالگرہ بے مثال ہے
۱۳۳۵ھ

تعمیر کورہ تالاب خلد آباد:

جلیل از بہر تاریخش رقم زد
کہ ایں ہم چشمۂ آبِ حیات است
۱۳۳۶ھ

تعمیر تالاب شاہ خاکسار خلد آباد:

مصرعِ تاریخ ہے موزوں جلیل
بحرِ مواج فیوضِ آصفی
۱۳۳۷ھ

جامن تالاب خلد آباد:

کس قدر صاف ہے یہ مصرعِ تاریخ جلیل
خلد آباد کا تالاب مصفّا ہے یہ
۱۳۳۸ھ

تعمیر چاہ تعمیر کردہ نصیر الدین تحصیلدار:

لکھ یہ تاریخ آبدار جلیل
چشمۂ فیض ہے یہ چاہ نیا
۱۳۳۸ھ

تالاب شاہ درہ ضلع اورنگ آباد:

جلیل اس آبِ شیریں کی ہے تاریخ
کہ گویا چشمۂ کوثر ہے جاری
۱۳۴۰ھ

تالاب قتلغ خاں ضلع اورنگ آباد:

مصرعِ تاریخ ہے شامل دعا پڑھئے جلیل
بحرِ رحمت ہو یہی سارے جہاں کے واسطے
۱۳۴۰ھ

مدینہ مسجد واقع گلکنڈہ:

جلیل تاریخ ایسی لکھیے کہ صوفیوں کو بھی وجد آئے
حرم ہے یہ مسجد مقدس پڑھیں مصلّی نماز آکر
۱۳۴۵ھ

تعمیر نظام ساگر حیدرآباد دکن:

سالِ ہجری گفت با من ہاتفِ غیبی جلیل
کل شیء حی من الماء قال رحمٰن النصیر
۱۳۵۰ھ

آب در جو آمد و تاریخ گفتم اے جلیل
در دکن آورد عثماں چشمۂ آبِ حیات
۱۹۳۲ء

پُل گوداوری:

اے جلیل اس جسر کی تاریخ ہے کیا آبدار
عہدِ عثماں میں بنا یہ پل جوابِ کہکشاں
۱۳۵۲ھ

واپسی علاقہ ریزیڈنسی :

جلیلؔ اک مصرعِ تاریخ تو بھی نذر دے لکھ کر ۔۔۔ رزیڈنسی ملی اب در کھلا مقصد برآری کا
۱۳۵۴ھ

فرش سنگ مرمر بمسجد عثمانیہ سلطان بازار :

جلیلؔ اس حسنِ خدمت کی لکھو تاریخ ہجری میں ۔۔۔ بچھایا اک محمد کے ولی نے فرش مرمر کا
۱۳۵۲ھ

واپسی سکندر آباد :

ہوئی تاریخ بامداد الٰہی یہ جلیلؔ ۔۔۔ پایا اسکندر ثانی سے سکندر آباد
۱۳۶۴ھ

تاریخہائے متفرقہ

رونق افروزی والیٔ رامپور از سفر یورپ :

میں نے برجستہ کہا مصرعِ تاریخ جلیلؔ ۔۔۔ غل یہ ہے مصر سے یوسف سوئے کنعاں آئے
۱۸۹۴ء

سکوں دیدہ و دل کو حاصل ہوا ۔۔۔ جلیلؔ اب قدم تو حضور آگئے
۱۳۱۱ھ

در تہنیت جشن مسند آرائی والیٔ رامپور :

جلیلؔ آوردہ ایں مصرع بے نذر ۔۔۔ جواں دولت جواں قسمت جواں سال
۱۳۱۱ھ

عید سعید بہ پیشگاہ اعلیٰحضرت نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس :

کہتی ہے خوشی آج گلے مل مل کر ۔۔۔ ہو شاہ کو یا خدا مبارک یہ عید
۱۳۲۱ھ

تمغۂ قیصری مولوی محمد عزیز مرزا صاحب :

مصرعِ تاریخ کہتا ہے جلیلؔ ۔۔۔ تمغۂ قیصر ہے زیبا آپ کو
۱۹۰۹ء

تخت نشینی میر عثمان علی خاں والیٔ دکن :

اٹھ گئے چھ تو بفرمانِ خداوند جلیلؔ ۔۔۔ میر عثمان علی خاں ہوئے سلطان دکن
۱۹۱۱ء

جلیلؔ اس جشن کی تاریخ تو نے خوب موزوں کی ۔۔۔ مبارک ہو یہ دورِ عدل آصفجاہ ہفتم کا
۱۳۲۹ھ

شکار شیر آصف سابع والیٔ دکن :

اک ملا تاریخ کا مصرع جلیلؔ ۔۔۔ شیر افگن نے کیا پہلا شکار
۱۳۳۲ھ

نذر دے تاریخ لکھ کر اے جلیلؔ ۔۔۔ شیر مارا شاہ نیک اقبال نے
۱۳۳۲ھ

آگیا ایک لب پہ مصرع سال	دوسرا شیر بھی شکار ہوا
۱۳۳۲ھ

تہنیت دربار یادگار جلوس آصف سابع :

جلیلؔ اس جشن کی تاریخ کیا نایاب نکلی ہے	یہ آصفجاہ سابع تاجدار ہفت کشور ہو
۱۹۱۲ء

عطائے خطاب نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن شروانی :

تاریخ اس خطاب کی ہے ہدیۂ جلیلؔ	علامہ ورشید زمن صدر یار جنگ
۱۳۳۱ھ

سرفرازیٔ وزارت مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد :

مل گیا سال یہ تائید الٰہی سے جلیلؔ	شاد کو شاد کیا شانے وزارت دیگر
۱۳۳۴ھ

عطائے عہدۂ نظامت پٹھان محمد احمد صاحب :

مصرع سال تم لکھو یہ جلیلؔ	لطف حق سے وہ ہو گئے ناظم
۱۳۵۰ھ

ولادت محمد کاظم خلف سید عبدالستار صاحب جونپوری :

۳۰۰	شکر صد شکر خالق یزداں	۵۰
۲۰	کہ ہوئی پوری آرزوئے جہاں	۵۰
۲۰	کاظم نیک طالع وخوش رو	۶
۵۰	نام پر جس کے جان و دل قرباں	۵۰
۶۰۰	خوب پیدا ہوا مبارک فال	۳۰
۵	ہو گئی سبز کشت زار جہاں	۵۰
۷۰۰	ذکر مولود سے جہاں ہے خوش	۳۰۰
۷۰	عید کا ہر مکاں میں ہے ساماں	۵۰
۸۰	فیض دیدار حسن صورت سے	۱۰
۱	آنکھ روشن ہے اور دل شاداں	۵۰
۴۰	میں نے کیا خوب یہ لکھی تاریخ	۶۰۰
۳	جلوۂ نور چشم ۔ راحت جاں	۵۰
۱۸۸۹ء	۱۳۰۶ھ	۱۲۹۶ف

راحت القلوب


راحت القلوب

جامع

زین بدر عربی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

راحت القلوب

حمد بیحد و بیقیاس مر حضرت خداوندے را کہ صور انسانی از کتم عدم بوجود در آوردہ بدرجۂ کمال رسانیدہ کہ احصا افلاک و ملک پیرامون ادراک وحوالی اطلاع آن گذر نتوان یافت اما بعد این کلمات وحل بعضی مشکلات کہ از لسان گوہر فشان پیر روشن ضمیر خود و شیخ نامدار مقبول حضرت پروردگار پیر و سر طریقت و درِ دریاے کرامت گوہر یکتاے سلامت دیباجہ عنوان محبت خواجۂ دیوان مودت سلطان العاشقین برہان العارفین الصالحین حجۃ الدین علی جمیع المسلمین بندگی حضرت شاہ شرف الدین احمد یحییٰ منیری نور اللہ مرقدہ در سمع این قاصر و فہم این ناقص آنچہ مسموع و مفہوم فرا خاطر گشتہ بتحت قلم در آوردہ شد تا سالکان راہ الٰہ و محققان درگاہ شہنشاہ را بمطالعۂ این مجموعہ مرغوب کہ مسمّٰی بہ راحت القلوب است قوۃ یقین و شوق در سیر و سلوک دین حاصل گردد۔ آنانرا کہ بجال افراط و تفریط متضمن اند جمعیت دینی و علم یقینی از زائی گناہ بالنبی و آلہ الامجاد

مجلس اول بعد از نماز جمعہ معارف شہر از شغل داران حاضر بودند مثل ملک محمود متصرف و ملک نصیر الدین تلمغانی و بعضے یاران از اہل تصوف نیز حاضر بودند کہ شخصے از اہل تصوف سخنی در باب

رضا و طلب حق مرخلق را در میان آورده که رضاے حق بوده کمال کیے حاصل شود بندگی مخدوم ادام الله
عظمته فرمود که چون طالب حق بدین مقام رسد هر بلاے و محنتی که بروے نازل باشد ملول خاطر
نگردد بلکه صابر و شاکر باشد چنانکه اهل سلوک میگویند که خلوت یحیٰی پیغامبر علیه السلام آنروز بود که
او را سر بریدند و خلوت خلیل الله پیغامبر علیه السلام روزے بود که کافران براے امتحان در منجنیق کرده
باتش انداختند و خلوت زکریا پیغامبر علیه السلام روزے بود که اره بر سر وے راندند میگویند که چون اره بر
سر وے نهادند کسے پرسید که این ساعت چه می خواهی گفت میخواهم تا نیمے از من در مشرق
آویزند و نیمے در مغرب تا جهانیان دانند که راه دوست راهیست که جز عاشقان راه حضرت الله
دیگر نپوید چون بندگی مخدوم ادام الله عظمته بدینجا رسید الطریق و عظام حاضران را فرمود که تا طالب
حق در فرمانبرداری حضرت باری عز اسمه کمر توبه کمال استوار نه بندد هرگز راه نپوید و اصلا محبت
محبوب نجوید مطابق همین حکایتے فرمود میگویند که چون خلیل علیه السلام کارد بر حلقوم اسمٰعیل
علیه السلام نهاد حقتعالی حجابها از میان دور افگند و فرمود که اے فرشتگان درین پدر و پسر
بنگرید که در فرمانبرداری من چگونه اطاعت می نمایند روز اول به طعن میگفتید اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ
یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ امروز به بینید که خون فرزند دلبند خویش در طلب در رضاے
ما چگونه میریزد اے جبرئیل مر ملائکه را فرمان برسان که کبش اسمٰعیل بر گردنهاے خود نهاده از براے
فداے او بر زمین برند جبرئیل علیه السلام گفت خداوندا هٰذِهٖ کَرَامَةٌ عَظِیْمَةٌ این کرامت بزرگ است
که فداے او را بر گردن فرشتگان مقرب نهند حقتعالی فرمود سوگند بعزت و جلال خود اگر همه فرشتگان
آسمان و زمین فداے اسمٰعیل را بر اعناق خود نهاده بر زمین برند تا مکافات آن یک سخن او نباشد که
در جواب پدر گفت یَآاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ نظیر این آنست که چون روز قیامت شود و سکان
اطباق این هفت طاق زنگاری بلکه جملگیان این رواق زنگاری بفرمان باری جل و علا صف
بر صف کشند خطاب مستطاب حضرت رب الارباب مسبب الاسباب جل و علا در رسد
یَا مَلٰٓئِکَتِیْ اَزْلِفُوْا عِبَادِیَ الْمُوَحِّدِیْنَ فِیْ جَنَّاتِیْ وَعَرِّفُوْا لَهُمْ قُصُوْرَهُمْ وَحُوْرَهُمْ

یعنی ای فرشتگان فرود آرید بندگان واحد دانندگان مرا در بوستانهای بهشت ماو بشناسانید
مراو شان را قصور و منازلی و حور آنها پس گوید جل و علا که ای فرشتگان سوگند بعزت و جلال
خود که اگر همه بهشت ها را با آنچه در وی است باین خاکیان کرم نمایم هنوز مکافات آن یک
کلمه بلی که در جواب اَلَستُ بِرَبِّکُم گفته اند نشود تا آن وقت که بدولت مشاهده جمال خود مشرف
گردانم شاید که مکافات آن تواند بود والله اعلم بالصواب **مجلس دوم** روزی چند کسان
مسافر از زمره اهل صفه حاضر آمدند یکی از میان ایشان از حال مبدا و معاد و از طریق معرفت این
استفسار نمود بندگی مخدوم دام ظله بسوی حاضران آورده بتصریح و تشریح این معنی مشغول
شدند و فرمودند که سعادت عظمی و مرتبه ازلی مر نفس ناطقه را معرفت الهیست و معرفت مبدا و
معاد است لیکن طریق معرفت این بر دو وجه است یکی ازین بر دو وجه
طریقه اهل نظر و استدلال است و وجه ثانی طریقه اهل ریاضت و مجاهده است و سالکان مر طریقه
اول اگر لازم گرفته اند ملتی از ملل انبیا علیهم السلام پس اینها را متکلمین نامند و اگر ملتی از ملل
انبیا علیهم السلام لازم نه گرفته اند پس اینها را حکمای مشائین نامند و سالکان مر طریقه ثانی اگر موافقت
کرده اند در ریاضت خود با احکام شریعت را پس اینها را صوفی متشرع نامند و اگر موافقت نکرده اند
در ریاضت خود با احکام شریعت را پس اینها را حکمای اشراقین نامند پس مر هر طریق را دو طریق
است چنانچه نزدیک متامل پوشیده نیست لیکن حاصل طریقه اول استکمال القوت نظریست
و آن عقل مستفاد است یعنی مشاهده کردن نظریات را و محصول طریقه ثانی استکمال القوت
عملی است و ترقی در درجات آن و درجه ثالث از قوت عملی فیضان کردن بر نفس صور معلومات
را بر سبیل مشاهده چنانچه در عقل مستفاد لیکن این درجه کمل و اقوی است از مستفاد چراکه چیزیکه
فایض است بر نفس در درجه ثالث می باشد صور کثیره مستعد می باشد نفس بصفای خود از کدورات
و از صیقل کردن آن نفس را از زنگار تعلقات و آلایش دنیاوی آنرا که فیضان شود آن صور بر آن نفس
چنانچه آینه که از صیقل صاف کرده شد و آنچه مقابل آن آینه کرده شود بوجه کمال محسوس شود و آنکه فیضان

شود نفس در عقل مستفاد و آن علوم است که مناسب شود آن علوم را مبادی مبادی آنکه ترتیب
داده شده است از برائے رسانیدن بسوے مجهول چنانچه آئینه که اندک صیقل کرده شود پس هر چه
مقابل او خواهد بود محسوس بوده کمال نخواهد شد مگر شئ قلیل همدرین میان شخصے مسافر از طرف بجی
رسید و ارادت بیعت آورد بندگی حضرت مخدوم قبول فرموده بیعت و حلق نموده طاقیه عطا فرمود
همدرین میان حاضرے عرضداشت که در عهد رسول صلی الله علیه وسلم هم بیعت و قصر بود بندگی
مخدوم عظمه الله فرمود صحبت بود و خرقه پس چرا که رسول علیه السلام خرقهٔ مبارک خود بر خواجه اویس
قرنی رحمة الله عطا فرمود دیگر خیر لیکن قصر و حلق و بیعت گفته اند که در عهد خواجه جنید و بایزید جاری گشت
و حکمش تا حدیست که اگر بیعت بکنند و دست بر دست نه نهند هرگز حکم پیری و مریدی نکنند بعده بطریق
این حکایت نقل فرمود که شیخ احمد بر شیخ نظام الدین رحمة الله رفت و طاقیه التماس نمود ایشان
طاقیه عطا فرمودند لیکن بیعت و قصر درمیان نبود که نظام الدین رح در دار البقا نقل فرمود آخر الامر
شیخ احمد از شیخ محمود التماس بیعت نمود شیخ محمود گفت که ارادت به کسے داری یا نه گفت طاقیه
از حضرت شیخ نظام الدین رحمة الله گرفته ام دیگر بس لیکن دست بر دست و بیعت هیچ نبود شیخ محمود در
جوابش گفت که الحال حاجت نیست همون بیعت است صوفیے دران مجلس حاضر بود گفت که طاقیه
محض تبرک بود بیعت چگونه همان باشد بعد ازان شیخ محمود متامل شده شیخ احمد را گفتند که بعد تحقیق
این مقدمه آنچه خواهد انجامید گفته خواهد شد بعد ازان این واقعه را بر مشائخان آن عصر فرستاده که واقعه
چنین پیدا شده است چه باید کرد آخر اتفاق جمله مشائخان و درویشان آن زمان برین افتاده که طاقیه
تبرک بود و بیعت نبود شما بیعت بکنید بعده بندگی حضرت مخدوم فرمود که غرض ازین حکایت آنست
که تا دست بر دست و مقراض نباشد حکم پیری و مریدی نکنند هم ازینجاست که قول جمله مشائخان اهل سلوک
درین باب وارد است که اَلْمُرِیْدُ لَا یَکُوْنُ مُرِیْدًا حَتّٰی یَاْخُذَ الشَّیْخُ شَعْرَهَا نَاصِیَه یعنی مرید نمی باشد مرید
تا آنکه بگیرد شیخ موی پیشانی او والله اعلم بالصواب **مجلس سوم** روزی چند مسافران از زمرهٔ اهل تصوف و مشائخان از شغل
دلان جائیکه بندگی مخدوم دام فیضه جلوس فرموده بودند در رسیدند از جماعت ایشان ذکر خواجه اویس قرنی رحمة الله علیه

از زبان آورده که فردای قیامت حضرت صمدیت ده هزار فرشته بر صورت اویس در وجود آرد که تا اویس
میان ایشان شده در عرصات در آید لیکن موجب این چیست و حکمت معلوم نیست که درین
چه سر است بندگی مخدوم دام شرفه رو سوی حاضران آورده فرمود چنان معلوم می شود که
شاید درین این حکمت تواند بود که در دنیا خدای تعالی را در قُبّهٔ تواری پرستیده است و او را آنجا جز
باری تعالی کسے دیگر نشناخت پس مناسب آنست که آن روز نیز او را جز خدای تعالی کسے دیگر
نشناسد چنین گویند که فردای قیامت خواجه علیه الصلوٰة والسلام از کوشک خود بیرون آید چنانچه
کسے مر کسے را طلب کند خطاب از حضرت رب الارباب آید که کرا میطلبی خواجه علیه السلام گوید که
اویس رح را میطلبم باز خطاب در جواب خواجه علیه السلام فرود آید که چنانچه اویس رح را در دنیا ندیدی
اینجا هم نه بینی بعده خواجه علیه السلام گوید که الٰهی او کجاست فرمان آید فِی مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ
مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۔ یعنی در محل صدق نزدیک بادشاه قادر بعده خواجه علیه السلام گوید چون است
که امروز همه جمله که امروز در عرصات موجود اند در تفحص و طلب اند و امروز او را من میخواهم که به بینم و او مرا نمے بیند
فرمان در رسد که اے محمد صلی الله علیه وسلم آنها که محتاج دیدار تو اند محض واسطه من و کسانیکه بی تو
می توانند که مرا به بینند پس محتاج بتو چون شوند دیدن او بما چه سود کند و دیدن ما بتو چه زیان دارد چون
بندگی مخدوم دام شرفه بدینجا رسید رو سوی حاضران آورده فرمود سبحان الله چه مرتبه و کمال
عز و جلال بجال خواجه اویس قرنی رحمة الله خدای تعالی عطا فرموده که در روز رستخیز خواجه
کونین صلی الله علیه وسلم بطلب او بیرون آید و او حاجت بشفاعت حضرت رسالت پناه
صلی الله علیه وسلم در آن روز نه آرد همدرین میان مولانا آمون عرضداشت که بخواجه اویس قرنی
رحمة الله مرقع مبارک حضرت رسالت پناه صلی الله علیه وسلم بحسب اشارت آن سرور انبیا
صلعم رسیده بود یا که باتفاق تابعین رضوان الله علیهم اجمعین ۔ بندگی مخدوم عظمه الله فرمود که
حسب اشارت حضرت رسالت پناه صلی الله علیه وسلم سپرده بودند علما درین باب چنان میگویند
که چون خواجه علیه الصلوٰة والسلام از عالم فانی بعالم جاودانی خرامیدند وصیت فرمودند که مرقع مبارک تو بکه دهیم

فرمود که با ایشان رح . بعد انتقال آن خواجه علیه السلام بموجب فرمان عمر و علی رضی الله عنهما مرقع
مبارک گرفته بطلب خواجه اویس رحمة الله بیرون آمدند نشانیها و علامتهای خواجه رحمة الله
از هر یک می پرسیدند لیکن همه همین میگفتند که او شتربانیست اشتران مردمان می چراند وقتی از دو
سیل به آبادانی نمی آرد بعد طلب بسیار او را دریافتند مرقع مترفع بموجب امر محمد مصطفی صلی الله
علیه وسلم دادند و گفتند که فرمان حضرت پیغامبر صلی الله علیه وسلم چنین رفته است که وقت پوشیدن
این مرقع امتان مرا هرگز فراموش نکنی بعد ازان خواجه رحمة الله مرقع مبارک بستد و در گوشه
رفت و میگفت بار خدایا هرگز این مرقع نپوشم تا که محمد مصطفی صلی الله علیه وسلم را تمام بمن نه بخشی
در سرا او فرو خواندند که بعضی را تو بخشیدم گفت نه تمام میخواهم در همین گفتگو بود که عمر خطاب و علی رضی الله
عنهما نزدیک او رفتند و گفتند که باید دید که او در آن گوشه چه میکند و بچه مشغول است چون نظر خواجه
رحمة الله بر ایشان افتاد گفت افسوس صد افسوس که تعجیل کردید و مرا از وقت خاص بوقت
نمودید وگرنه این مرقع مترفع محمد مصطفی صلی الله علیه وسلم هرگز در بر نمیکردم تا که تمامی امت
رسول الله صلی الله علیه وسلم بمن نمی دادند [بخشیدم] چون امیر المومنین عمر خطاب و علی رضی الله عنهما
باطن عظمت زنده را دیدند با یک دیگر متحیر ماندند و گفتند که ای اویس تو چرا از رغبت نیامدی در رسول
علیه السلام را ندیدی گفت که شما دیده بودید گفتند که ای اویس خواجه چگونه میفرمائی که مایان همه
وقت در آنحضرت بودیم گفت که دندان مبارک حضرت رسالت پناه صلی الله علیه وسلم خسته
شده بود دیده بودید یا نه گفتند که دیده بودیم گفت حیف صد حیف پس با وجود دیدن چرا دندان
خود را سالم گذاشتید بعد ازان دندانهای خود نمود که سی و دو دندان بموجب متابعت حضرت
رسالت پناه صلی الله علیه وسلم شکسته شده بود مولانا آمون استفسار نمود که همه دندانهای
مبارک حضرت رسالت پناه صلی الله علیه وسلم خسته شده بود یا نه مخدوم اعظم الله فرمود که یک
دندان خسته شده بود مولانا آمون باز عرضداشت که پس چرا خواجه اویس رحمة الله همه دندان
خود را شکست ساخت فرمود که بدین معنی که آن دندان مبارک معین بر خواجه معلوم نه بود

همه را شکست ساخت که تا آن دندان مبارک شکسته است داخل بود پس عمر گفت رضی الله عنه مرا
دعاے بکن گفت که در تشهد اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ میگوییم درین دعا
تو هم داخل می شوی چون زمانے بگذشت ایشان را معذرت کرد و گفت که باز گردید قیامت نزدیک
است من به ساختن زاد آخرت مشغول هستم والله اعلم بالصواب **مجلس چهارم** روزے بعد
نماز بامداد بندگی حضرت مخدوم دام عظمته الله جلوس فرموده بودند که حاضرے از حاضران مجلس
روسوے بندگی حضرت مخدوم دام عظمته آورده عرضداشت نمود که آنروز که فرمان حضرت عزت
درباب سجده آدم صفی الله اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ط اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ در آمد جمله
ملائکان مقرب بارگاه بموجب امر الٰهی مر آدم را سجده کردند مگر ابلیس انکار کرد و از تکبرے که مانا ری
بوده ام گفت با آنکه سرشتش از خاک است سر بسجده خواهم برد و عرض داشت که چنین کسے
را که از ریاضت و مجاهدات بدرجه کمال رسیده باشد بچنین کس این قدر کلام نالائق نمی سزد
بعده بندگی مخدوم عظمه الله فرمود که آرے ایچنین جواب به چنین مردے کامل اصلا نمی سزد
لیکن موافق مشیت حق هر چیزیکه هست انجام میگردد و این را با این بهانه مرتد عالم ساخت
و بدرگاه کبریاے داناے راز تکبرے مطلق درست نیست اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُتَکَبِّرِیْنَ ه
بدرستیکه الله تعالی دوست نمیدارد تکبر کنندگان را. بعد از آن حکایتے فرمود که روزے عزازیل
بر بهشت نظر کرد چه میبیند که دبیر قضا بخامه اقتضا از براے نظاره اهل غیرت این کلمه
حکمت نوشته بود که مارا بنده از بندها ست که او را بانواع انعام لا کلام مکرم گردانیده از زمین بآسمان
برم و از آسمان بجنان رسانم بعد از آن او را بامرے از امور خود دلالت کنم و او مخالفت فرمان ما
کند عزازیل چون این کلمات را مطالعه کرد هزار سال طاعت و اوراد خود بگذاشت و متصل
برین بنده نافرمان همان لعنت میکرد و این نمیدانست که آن لعنت محض بر خود است و بروایتے
چنین آمده که چون عزازیل در لوح محفوظ نگاه کرد و دید نوشته اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ
گفت خداوندا این شیطان رجیم کیست ندا آمد که بنده از بندگان من که بعنوان نعم کرمش

گردانم بعد ازان نافرمانی کند آخر من او را خوار و نگونسار گردانم گفت الٰہی او را ایمن نمائے تا ہلاک نش
گردانم فرمود که سَوْفَ تَرَاهُ یعنی زود باشد که او را ببینی **مجلس پنجم** روزے بندگی حضرت مخدوم
ادام الله عظمته بعد نماز بامداد و اوراد و بدرس مشغول شدند در سبق قاضی احمد ذکر وحدانیت باریتعالیٰ
آمده بود قاضی احمد استفسار آن نمود بعده بندگی حضرت مخدوم جہان بوجه احسن بالتفصیل
بیان فرمودند که حضرت باریتعالیٰ صانع العالم واحد. یعنی کاریگر عالم یکیست لقوله تعالیٰ. قُلْ
هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ایضاً لَوْ کَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا یعنی اگر بودے در آن
آسمان و زمین خدایہا ورائے آن ہر آئنه فساد می شد و آن آسمان و زمین. **بیت**

اگر بودے ازیکے خدا افزون	تا نماندی جہان بدین قانون

صبی چون بدرجه بلاغت رسد عاقل و ممیز شود اول چیزیکه برو از راه شرع فرض گردد
ایمان آوردن است بخدائے عزوجل و آن آنست که خدائے را یگانه و بے ہمتا داند و از شرک
و جفت و زن و فرزند چنانچه مذهب بعضی است و از همه صفات ناسزا چون عجز و نقصان
و جہل پاک و منزه شناسد و بہمه صفات ثبوتے چنانکه دانائے بہمه چیز و توانائے بہمه چیز و
بے نیازی از همه موصوف داند و بدل اعتقاد بنده و بزبان اقرار کند که هُوَ حَیٌّ عَالِمٌ قَادِرٌ سَمِیْعٌ
بَصِیْرٌ مُدَبِّرٌ اِلٰی غَیْرِ ذٰلِكَ یعنی او تعالیٰ زنده است و داننده است و بر ہر شے قادر است
و شنونده است و بیننده است و تدبیر کننده است. تا غیر این. وَ مُتَکَلِّمٌ بِکَلَامٍ وَاحِدٍ
اَزَلِیٍّ قَائِمٍ بِذَاتِهٖ لَیْسَ مِنْ جِنْسِ الْحُرُوْفِ وَالْاَصْوَاتِ یعنی گوینده است بکلام واحد
ہمچو واحد یکه ازلی است قائم بذات خود و او نیست از جنس حروف و صوت بلکه مضمون است
كَقَوْلِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَلَامُ اللّٰهِ تَعَالٰى غَيْرُ مَخْلُوْقٍ یعنی کلام خدا پیدا کرده خدا نیست. جبرئیل
علیه السلام که بر محمد مصطفےٰ صلی الله علیه وسلم قرآن آورده مضمون بود نه که حروف تہجی و عبارت
و صوت. این ہمه را حضرت جبرئیل علیه السلام بعقل و دانش خود جمع کرده اند آیات و سورہائے
متفرقه که جبرئیل علیه السلام آورده بر چہار یاران جمع کردند

فاما جمع نموده حضرت عثمان است و قرآن را فرقان براے همین گویند که در و متفرقه است اِنَّ جِبْرَئِيْلَ نَظَرَ فِي اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ وَجَآءَ بِالْقُرْاٰنِ مِنَ اللَّوْحِ بِحُكْمِ اللّٰهِ تَعَالٰى اِلٰى مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ یعنی بدرستیکه جبرئیل علیه السلام نظر کرد در لوح محفوظ و آورد قرآن را از لوح محفوظ بحکم الله تعالی بسوے محمد رسول الله صلی الله علیه وسلم

بیت

گرچه قرآن از لب پیغمبر ست		هر که گوید حق نگفت او کافر است	

و صفات الله تعالی نه همراه او ست و نه جدا از و ست اَللّٰهُ عَلٰى مَذْهَبِ الْاَصَحِّ اسم ذاتے که مستجمع لجمیع الاسماء و الصفات است۔ باقی همه صفات او ست و تا که بر وحدانیت باری تعالی دلیل و حجج نداند مقلد بود و تقلید آن است بد انچه خلق را بیند و نیز بر آن باشد دلیل و حجت خود نداند این چنین کسے نزدیک بعضے مسلمان نیست نزدیک اهل سنت و جماعت چون مقلد را التصدیق بود مومن است و نزدیک معتزله و اشعریه مومن نیست تا که همه مسائل اعتقادی بدلیل نشناسد بر وجهے که ممکن بود مر دفع شبهات او را و نزدیک کرامیه هر که گوید لا اله الا الله و خداوند را نه شناخت و صانع از مصنوع نداند و بروا عتقاد نکند مومن بود و این تقلید محض است و از ینجا ست که فقهاے ما از اهل سنت و جماعت میگویند که قول فرو ایمان نیست یعنی تقلید محض ایمان نیست مقلد که مومن بود جائیست که مراد را تصدیق بود اما قول مجرد بی تصدیق ایمان نیست چنانچه از مردمان شنید لا اله الا الله او نیز گفت لا اله الا الله اگر او را پرسند که این چه گفتی گوید از مردمان شنیدم من نیز گفتم نمیدانم که چیست مومن نبود اما اگر گوید از مردمان شنیدم و دانستم که گفتن این حق و درست است یعنی اعتقاد برین کردم مومن بود خلیل رحمه الله فرموده است که چون بنده بشناخت که مرا صانع است از حکم تقلید بیرون آمد صورت مسئله چنان بود که چون کسی را پرسند که ترا که آفریده در جواب گوید خدا تعالی یا بدین نهج جواب گوید کسے که آسمان و زمین آفریده است مرا و ترا آفریده است پس وے مقلد نبود ایمان وے درست بود اگر گوید نمیدانم

وبا این هم گوید لا اله الا الله مومن نبود چون بندگی مخدوم عظمه الله بدینجا رسید ترغیبا للی امرین
فرمود که بنده مومن را واجب است که در شناختن هستی خداے عزوجل عزم بالجزم کنند که این
موجودات بخودی خود نشده است زیرا که ام محال است شدن چیزے بخودی خود کار بی کاریگر قطعا
صورت نه بندد چنانکه کتاب بے کاتب اصلا در وجود خود به خود نه آید همچنین کارہاے دیگر را قیاس
برین باید کرد پس لازم مے آید که کار را البته کاریگرے باید وگرنه کار بیکاریگر بود و آن محال است
پس ثابت شد که کار بے کاریگر هرگز در وجود نه آید و این کاریگر باید که واجب الوجود بود یعنی هستی
او بخودی خود بود نه بغیر خود وگرنه او هم محتاج بدیگرے بود و آن دیگر بدیگرے تا حد بے نهایت
و این در عقل باطل است هرگز نزدیک اهل فراست مجوز العقل نیست چون هستی خداوند تعالی
بدلائل و حجج ثابت گشت پس مرمومن را ثبوت یگانگی باری نیز واجب است و آن آنست که
اگر خدا دو بودے اصلا هیچ کارے راست نامدے زیرا که اگر یکے خواستی که چیزے را هست کند
و آن دیگرے خواستی که همون چیز را نیست کند پس برین تقدیر خواست هر دو تمام بودے و آن
محال است چرا که لازم مے آید که آن چیز هست باشد بمقتضاے یکے و هم نیست باشد بمقتضاے
دیگرے در یک حال و این محال است قطعا۔ چنانچه لازم محال بلزوم نیز محال یا خواست هر دو
ناتمام بودے و آن هم محال است چرا که برین تقدیر لازم مے آید که هر دو عاجز و ناقص باشند و
عاجزے و ناقصے خدائی را نشاید و نباید یا که خواست یکے تمام بودے و خواست دیگرے ناتمام پس
بدین تقدیر دوم عاجز و ناقص مے باشد و این هر دو خدائی را نشاید و اگر کسے از روے منازعت
در پیش آید بدین وجه که یکے مر دیگر را در هر کار و هر چیز موافقت و متابعت کردی پس در جوابش
بچنین وجه در آریم که این نیز محال است از آنکه کار هر یکے موقوف است بموافقت دیگرے یا موقوف
نیست اگر موقوف است پس هر یکے ناقص می باشد و اگر موقوف نیست دومے باطل می شود که
بر و هیچ کارے بسته نیست بودن و نابودن وے برابر است چون بدین دلیل و حجت دومے باطل شد
یگانگی باری و وحدت قطعا ثابت گشت چنانچه نزدیک بعضے اهل عقل مخفی و محتجب نیست و چون

دوش بدین وجهت که صدر مذکور شد باطل گشت زیاده بودن از دو لطریق اولی باطل و محال بود چنانچه بادنی تامل روشن گردد والله اعلم بالصواب **مجلس ششم** روزے بندگی حضرت مخدوم دام شرفه بعد فراغ نماز بامداد بتلاوت قرآن مجید و فرقان حمید مشغول بودند که شخصے از مسافر بخارا آمد و سلام گفت بندگی مخدوم عظمه الله جواب سلام او داده لیکن تعظیم نه کرده بعد تلاوت قرآن مجید بندگی حضرت مخدوم جهان جهت تسکین خاطر آن شخص مسافر و ترغیباً للحاضرین بر لفظ مبارک راند که از کتب مطول چنان معلوم گشته که بوقت تلاوت سخن نه گوید و شنونده قرآن هم باید که سخن نه گوید و در حال تلاوت قرآن تعظیم هیچ کسی نه کند مگر تعظیم بادشاه عادل و مادر و پدر و استاد. درین اختلاف روایت است نزدیک بعضے استاد مطلق هر چیزے که با او خوانده باشد و نزدیک بعضے تخصیص است که تعظیم استاد کیه با او فقه خوانده باشد بکند بعده همون شخص بخارا استفسار نمود که فرق درمیان قرآن به یاد خواندن و دیده خواندن چیزے هست یا نه بندگی حضرت مخدوم جهان فرمود آرے فرق این قدر است کسیکه قرآن یاد می خواند پس گوئی حق تعالی با وے سخن میگوید و کسیکه دیده میخواند پس چنین است که گوئی که او با حق تعالی در سخن است باید که معنی قرآن بغیر از تفسیر هرگز یاد نباید گفت. بقوله علیه السلام مَنْ فَسَّرَ الْقُرْاٰنَ بِرَأْيِهٖ فَقَدْ كَفَرَ یعنی کسی که معنی بگوید قرآن را از عقل خود پس تحقیق او کافر است و مس نه کند قرآن را در حالیکه جنب باشد و بے وضو هم از دست نگیرد قرآن را مگر به غلاف. همدرین میان ذکرے در نسب رسول علیه السلام در پیش آمده بود بندگی حضرت مخدوم جهان دام شرفه بر لفظ مبارک راند که ان نبینا و رسولنا محمد مصطفے صلی الله علیه وسلم بن عبد الله بن عبد المطلب بن هاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مره بن کعب بن لوے بن غالب بن فهر بن مالک بن نضر بن کنانه بن خزیمه بن مدرکه بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان بن اد بن اُدَد بن همیع بن عامر بن سلامان بن نابت بن حمل بن قیدار بن اسمٰعیل ذبیح الله بن ابراهیم خلیل الله بن آزر بن ناحور بن شاروخ بن ارغو بن فالغ بن غابر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح پیغامبر علیه السلام بن لامک بن هود

پیغامبر علیه السلام بن مهلائیل بن متوشلخ بن اخنوخ که او ادریس است پیغامبر علیه السلام بن یارد بن قینان بن انوش بن شیث علیه السلام بن آدم صفی الله صلوٰة الله علیه السلام ـ اِنَّ النَّبِیَّ عَلَیْهِ السَّلَامُ اِدَّعٰی نُبُوَّتَهٗ وَاَظْهَرَ الْمُعْجِزَاتِ عَلٰی یَدَیْهِ کَانْشِقَاقِ الْقَمَرِ وَانْجِذَابِ الشَّجَرِ وَتَسْلِیْمِ الْحَجَرِ وَنَبْعِ الْمَاءِ مِنْ بَیْنِ اَصَابِعِهٖ وَتَسْبِیْحِ الْخَشَبِ وَشِکَایَةِ النَّاقَةِ وَشَهَادَةِ شَاةِ الْجَبَلِیَّةِ وَشُرْبِ الْکَثِیْرِ مِنَ الْبَشَرِ قَلِیْلًا مِنَ الْمَاءِ یعنی بدرستیکه نبی علیه السلام دعوی کرد نبوت را و ظاهر کرد معجزات را بر دستهای خود چون دو پاره ساختن ماهتاب را وکشیدن بسوے خود درخت را و سلام گفتن سنگ و روان شدن آب از میان انگشتهاے آن سرور کائنات صلعم و تسبیح خواندن چوب و شکایت کردن شتر ماده و گواهی دادن گوسپند کوهی و نوشانیدن از آب اندک مردمان کثیر را معجزات که از محمد مصطفےٰ صلی الله علیه وسلم در ظهور آمده از تفسیر مفسران و از روایت راویان چنین معلوم گشته که قبل از تولد حضرت عبد الله بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف کافران از علم نجوم میگفتند که در سال فلان آن شخص در جهان پیدا خواهد شد که از وے پیغامبر آخر زمان متولد خواهد شد از این جبه صوف قطره خون خواهد چکید آخر الامر چون تولد حضرت عبد الله گشت از جبه صوف که مر کافران را بود قطره هاے خون چکید در میان کافران غوغا افتاده که آن شخص که از وے پیغامبر آخر الزمان پیدا خواهد بود متولد شد آخر کافران علیهم اللعنة بایکدگر خود ها مصلحت برین مستحکم کردند که بهتر آنست که همین شخص را بالفعل از جهان ناپدید باید کرد اگر این را خواهیم گذاشت تا آخر از وے پیغامبر آخر الزمان پیدا خواهد شد و او دین اسلام را بر دین غالب خواهد کرد بعده عزم جزم بکشتن حضرت عبد الله کرده روانه شدند لیکن کافران هر چند سعی تا مقدور خود در کشتن حضرت عبد الله دریغ نکردند لیکن بسبب نور محمدی و بحفظ حافظ حقیقی موی از تن هرگز جدا کردن نتوانستند در پرورش عبد الله عبد المطلب کوشش ابویه و احتیاط از حد زیاده میکردند چون به عمر پنج و شش سالگی رسید راویان چنین روایت میکنند که حضرت عبد الله

روزے بہ طرف صحرائے میرفت کہ ماہتاب از آسمان جدا گشتہ در گریبان حضرت عبداللہ در
آمدہ بعد ازان دوبارہ گشتہ بمنزل خود رفت حضرت عبداللہ این معاملہ را دیدہ و بحیرہ و تفکر افتاد
این حقیقت واقعی پیش حضرت عبدالمطلب یک یک اظہار ساخت حضرت عبدالمطلب این واقعہ
را شنیدہ در دل خود گفت کہ از ہمین شخص پیغامبر آخرزمان تولد خواہد شد آن ماہتاب کہ در گریبان
عبداللہ درآمد درحقیقت نور محمدی بود کہ می شتافت ازان روز محافظت عبداللہ از حد زیادہ
میکردند و بسبب نور محمدی این چنین جمال و حسن و کمال بر عبداللہ ایزد لایزال ارزانی داشتہ
بود کہ سودائے محبت عبداللہ در دل جمیع خلق اللہ از حد زیادہ تر بود از انجملہ در آن عصر یک دختر
بادشاہ بود کہ او بقوت علم خویش میدانست کہ پیغمبر آخرزمان از عبداللہ پیدا خواہد شد ازین جہت
آرزوئے تمام میداشت کہ اگر عبداللہ از من ہم صحبت شود تا این نعمت علیا یعنی پیدا بودن پیغمبر
آخرالزمان بہ نصیبۂ من شود در تجسس و تفحص عبداللہ می بود اتفاقاً روزے حضرت عبداللہ بعزم
شکار طرف وادی رفتہ بود آن روز کافران نیز بقصد ہلاکی عبداللہ بہ مقامے خفتہ بودند کہ یک شیر
نزدیک عبداللہ آمدہ - ہرچند قصد میکرد کہ بضرب پنجہ ہلاک کردہ طعمۂ خود نماید لیکن از انجا جنبش نتوانست
کرد کافران اینچنین حال بدیدند با یکدگر میگفتند کہ درباب کسیکہ خدائے تعالی این چنین رحم و عنایت
خود و رحمت کردہ است کہ شیر ہرگز طاقت نے یابد کہ ہلاک کند پس از مایان چہ خواہد شد شرمندہ
گشتہ ہر یک باز رفتند شخصے از قاتلان حضرت عبداللہ نیز در شکار رفتہ بود آن شخص این معاملہ
را دیدہ در دل خود بیقین آورد کہ این محض تصرف کرامت است کہ شیر حیوان بودہ قصد ہلاک میکند
لیکن نمے تواند کہ از جائے خود مقدار موئے جنبد آخرالامر آن شخص چون بخانۂ خود آمد پیش
زن خود واقعہ عبداللہ کہ از شیر روئے دادہ بود یک یک بیان نمود و گفت کہ تو بخانۂ عبدالمطلب
برو بہر وجہے کہ باشد منت و الحاح کردہ دختر خود را بعبداللہ بدہ آخرالامر زن آن شخص بخانۂ عبدالمطلب
آمدہ بمنت تمام اظہار ساخت کہ دختر خود را بہ عبداللہ می سپارم ہرچند میگفت حضرت عبدالمطلب
قبول نہ میکردند آخر بعد الحاح و منت بسیار قبول کردند آنچہ رسم کدخدائی در آن زمان بود بجائے

آورده عقد بستند چون نور محمدی صلی الله علیه وسلم از پشت عبدالله در رحم مادر محمد مصطفی صلی الله
علیه وسلم که آمنه نام بود نزول کرد نوری که بر چهرهٔ عبدالله می شتافت در زوال شد روزے
عبدالله بطریق سیر طرف همون دختر بادشاه که آرزوے کمال میداشت میرفت اصلاً توجه
آن دختر طرف عبدالله نبود حضرت عبدالله در دل خود گفتند که چون قبل ازین این دختر
بادشاه مرا میدید بتواضع و تعظیم از حد زیاده بخدمتگاری می در آمد الحال موجب چیست که نظر
هم نمے کند حضرت عبدالله بآن دختر بادشاه گفت که اے فلان این چه حال است که قبل ازین
آرزوے دیدن ما از حد زیاده تر بود الحال چیست دختر بادشاه جواب داده آرزوے چیزے که
میداشتم آن چیز بمقام خود رسید و قرار گرفت بوے برفت و گل بماند گل برفت و خار بماند گنج
برونه مار ماند **مجلس هفتم** روزے بعد نماز جمعه بندگی حضرت مخدوم جهان نور الله ضمیره
بے نظیر همچو قمر منیر جلوس بجامع مسجد فرموده بودند طالبان دین و محققان اهل یقین گرد او همچو هاله نشسته
بذکر کلام دینی مشغول بودند اندرین میان مولانا آمون عرضداشت که در اداے نماز جمعه میان
علما اختلاف واقع است چنانچه پوشیده نیست لیکن به مذهب اهل سنت نماز جمعه بچه نوع
آمده است بندگی حضرت مخدوم عظمه الله بزبان گوهرفشان فرمود که طریق نماز جمعه بهتر آنست
که جمله شانزده رکعت بگذارد اول چهار رکعت سنت صلوٰة الجمعه خواند بعده دو رکعت فرض صلوٰة
الجمعه بجماعت بگذارد بعده چهار رکعت سنت خواند لیکن درین سنت ظهر و جمعه یکے هم نگوید
بلکه اربع رکعات صلوٰة سنت هذا الوقت بگوید بعد ازان چهار رکعت فرض خواند نیت برین نوع کند
نویت ان اصلی لله تعالیٰ اربع رکعات صلوٰة اخر الظهر ادرکت وقته متوجها
الی جهة الکعبة الشریفة الله اکبر- و در هر چهار رکعت سوره فاتحه ختم کند لیکن در دو رکعت
اخیر معوذتین با فاتحه ضم کنند بعد ازان دو رکعت سنت بکنند- جلدر یا حین نزدیک بود از مقام
مطلوب برگشید و مولانا آمون فرمود که ترغیباً للحاضرین بآواز بلند بخوانید چیزیکه بندگی حضرت
مخدوم مقبول کونین بزبان گوهرفشان در جواب مولانا آمون فرموده بودند مطابق عبارت

ریاحین آمده بعد ازان فصل طریق نماز تهجد نیز مسطور بود خواندن فرموده بمضمون آنکه دوازده رکعت
پیش دو دوگانه سنت بگذارد نیت هر دوگانه آنکه نویت ان اصلی لله تعالی رکعتی صلوٰة
التهجد سنت رسول الله تعالی متوجها الی جهة الکعبة الشریفة الله
اکبر در دوگانه اول در رکعت اول بعد سوره فاتحه دوازده مرتبه قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ و در
رکعت دوم بعد سوره فاتحه یازده مرتبه قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ بخواند بعد تحیات و درود خوانده
سلام دهد و صد بار یا وهاب بخواند و پنج مرتبه اسم الله حاضری الله ناظری
الله شاهدی الله ناصری الله معی - خوانده از جای برخیزد و دوگانه دیگر شروع
کند در هر رکعت یک یک مرتبه قل هو الله احد کم کند چنانچه در ششمین دوگانه آخر رکعت
بعد فاتحه یک مرتبه قل هو الله احد خواند نماز تهجد تمام کند لیکن بعد سلام در دوگانه اول همون
اسم خواند که در صدر مسطور است و بعد سلام در دوگانه دوم صد مرتبه یَا فَتَّاحُ و پنج اسم
مذکور خوانده و بعد سلام در دوگانه سوم صد بار یا غفارُ و پنج مرتبه اسم مذکور خواند و در دوگانه چهارم
بعد سلام صد مرتبه یا کریمُ و پنج مرتبه اسم مرقوم خواند و در دوگانه پنجم بعد سلام صد بار یا عزیزُ
و پنج مرتبه اسم مسطور خواند و در دوگانه ششم بعد سلام صد مرتبه یا بدوحُ و پنج مرتبه
اسم مذکور خوانده سر به سجده برده آنچه خواهش قلبی داشته باشد از ایزد واهب العطایا
دعا بخواهد و از نماز تهجد فارغ شود بدین طریق نماز تهجد دوازده رکعت ادا کرده اند بعد ازان اند کی
در خواب روند چون آخر پاس شب از پاس کم بماند آنزمان برخیزد از تجدید وضو دوگانه شکرانه بگذارد و بعد
این دعای ملکوتی چندانکه تواند بخواند و آن اینست سبحان الملك الجبار سبحان العزیز الغفار
سبحان الواحد القهار سبحان الکبیر المتعال سبحان الکریم الستار سبحان
الخالق اللیل و النهار سبحان الذی لم یزل ولا یزال **مجلس هشتم** روز عاشوره
بود که بندگی حضرت مخدوم عظمه الله جلوس فرموده بودند ذکرے در فضیلت روزهٔ
روز عاشوره در میان آمد بندگی حضرت مخدوم جهان بر لفظ مبارک خود راندند که ابوهریره رضی الله عنه

روایت کرد که پیغامبر صلی الله علیه وسلم فرمود که اگر موے پشیزے زر صدقه کنند فضل روزه
عاشوره در یابد و هر که روز عاشوره روزه دارد بهشت درهاے بهشت بروے کشاده گردد و در آید
بهر دری که خواهد ابن عباس رضی الله عنه گفت که پیغامبر فرمود صلی الله علیه وسلم هر که روز عاشوره
روزه دارد پس مرآن بنده را بهر ساعتے شب و روز آن یوم عاشوره که بست و چهار ساعت بود برانگیزد
خدا تعالی بسوے آن بنده هفت لک فرشته که خوانند مرآن بنده را آمرزش تا روز قیامت و برانگیزد خدا تعالی از بهر بهشت
هفت لک فرشته تا بنا کنند قصرها و شمرها بفشانند درختان و روان کنند جویها اگر بمیرد در آن روز شهید مرده باشد ابن
عباس گفت رضی الله عنه که هر که روز عاشوره روزه دارد داده شود مرآن بنده را بعدد هر چیزے که در توریت و انجیل و زبور و قرآن
است نیکی - و در شب عاشوره صد رکعت بگذارد و بخواند در هر رکعت بعد از فاتحه سه بار قل
هو الله احد - چون از نماز فارغ شود هفتاد بار بگوید سبحان الله والحمد لله ولا اله
الا الله والله اکبر ولا حول ولا قوة الا بالله العلی العظیم و در روز عاشوره شش
رکعت نماز بگذارد و بخواند بعد از فاتحه والشمس یکبار و الضحی یک بار و انا انزلناه یک بار - و اذا زلزلت
الارض یکبار و معوذتین یگان بار - چون از نماز فارغ شود سر به سجده برد و قل یا ایها الکفرون بخواند
و حاجت خود خواهد روا گردد مجلس نهم روزے بندگی حضرت مخدوم عظمه الله بجمیع طالبان دین و محققان
اهل الیقین جلوس فرموده بودند از میان ایشان مولانا آموں عرضداشت که بعضے اهل خبر ان اند که
ایشان هرگاه که بدرجه کمال رسند عبادت کردن بروے فرض نیست حکم نفی عبادت این ها البته
بدلیل و سند خواهد بود پس آن دلائل و سند ایشان کدام است که بروے تکیه گرفته مستقل بر
منع عبادت بوده اند بندگی مخدوم عظمه الله فرمودند که دلائل مستند متصوفین در منع عبادت
این آیت کریمه است وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ پس بر تقدیر مذهب بعضے از اهل
تصوف صفت حکم لفظ حتے که در آیت مذکوره واقع است از براے نهایت است پس معنی
چنان میشود که عبادت بکن پروردگار خود را تا که آید ترا الیقین - لیکن محققان شرع بر آن اند که لفظ
حتی از براے غایت نیست بلکه از براے علت است چنانچه میگویند اَسْلِمْ حَتّٰى

تَدْخُلَ الْجَنَّةَ۔ اسلام آر تا تو داخل شوی بجنت یعنی عبادت علت حصول یقین است
چنانچہ آوردن اسلام سبب دخول جنت است بعد ازان قاضی اشرف الدین عرضداشت کہ
اگر مردے از مال حرام صدقہ دہد و امید و طمع ثواب دارد پس حکم بر آن شخص چگونہ می کنند بندگی
حضرت مخدوم عظمہ اللہ فرمود کہ عند الشرع حکم بروے بکفر میکنند اگر فقیر میداند کہ از مال حرام
صدقہ دادہ است دم آن صدقہ دہندہ راد عا خیر میکند فقیر ہم عند الشریعۃ کافر میگردد۔ ذکرے
در بیان سیادت افتادہ۔ آنہا کہ بزیر گلیم سیادت شدہ اند پنج کس اند اول حضرت محمد مصطفےٰ
صلی اللہ علیہ وسلم دوم حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ سوم حضرت امام حسن علیہ السلام
چہارم حضرت امام حسین علیہ السلام پنجم حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا پس نباید کہ
در حقیقت سید نباشد و سید گویاند و ہم نباید کہ در حقیقت سید باشد و چیزے دیگر گویاند
کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لَعْنَةُ اللّٰہِ عَلٰی دَاخِلِنَا فِیْنَا بِغَیْرِ نَسَبٍ وَعَلٰی خَارِجِنَا
مِنَّا بِغَیْرِ سَبَبٍ یعنی لعنت خدا باد بر کسیکہ داخل در ما باشد بغیر نسب و سید گویاند و لعنت
بر آن کسیکہ سید باشد و دیگر گویاند بغیر سبب مگر آنکہ کہ اگر سید گویانم مارا بکشند و یا خطاب سر
دادہ باشند۔ بعدہ فرمود کہ علامت سیادت آنست کہ ہرگز بد خلق و متکبر نبود و نیز بر اخذ مال غیرے
و بر قتل ناحق اقدام نکند و ہم مُتعمد صغیرہ و کبیرہ نگردد۔ مولانا آمون عرضداشت کسی کہ پدرش
شیخ باشد و مادر او سیدہ باشد پس اگر او سید گویاند درست باشد یا نہ بندگی مخدوم عظمہ اللہ
فرمود کہ اینچنین شخص اگر سید گویاند جائز است اگرچہ فرزند را اصالت از طرف پدر خود است لیکن اینچنین
شخص کہ مادر وے سیدہ باشد بسبب بہترین سیادت اگر گویاند درست است ذکرے
در تولد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم درمیان افتادہ بود بندگی حضرت مخدوم عظمہ اللہ بر لفظ مبارک
راند کہ گل جسد مبارک پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم از ناف زمین است جائیکہ کعبہ است مولانا
آمون عرضداشت کہ گل جسد مبارک نبی صلی اللہ علیہ وسلم از مکہ بود دفن در مدینہ چرا کردند زیرا کہ
میگویند کہ از ہر جا کہ گل آدم وجود مے سازند باز بعد مردن ہمون جا دفن کنند بندگی حضرت

ن۔ داخلین۔ ن۔ خارجین۔

مخدوم عظمه الله در جوابش فرموده که چون طوفان نوح شتاب موج زد گل محمد مصطفیٰ صلی الله علیه وسلم را در مدینه انداخت جائیکه بالفعل قبر مبارک است نور الله. پس رسول صلی الله علیه وبارک وسلم را مکی وهم مدنی گویند و اُمی نیز گویند چرا که نام مکه در قرآن اُم القریٰ است. همدرین میان ذکرے در بیان ازواج مطهرات نبی صلی الله علیه وسلم افتاده. بندگی حضرت مخدوم بالتفصیل از زبان گوهر فشان بیان فرمودند که نبی علیه السلام ما تزوج من النساء الا اربعة عشرة نسوة. الاول خدیجة ثم سودة ثم عائشة بنت ابی بکر رضی الله عنه تزوج هؤلاء ثلثة بالمکة ثم تزوج حفصة بنت عمر رضی الله عنه ثم ام سلمة ثم ام حبیبة ثم جویریة ثم صفیة ثم زینب ثم میمونة ثم زینب ثم امرأة من هزیل ثم امرأة من بنی کندة ثم امیرة کلیب. وللخدیجة ثلثة ابن واربع بنات الاول قاسم ثم طاهر وطیب + وفاطمة ثم رقیة ثم ام کلثوم ثم زینب وولد ابراهیم بالمکة من ماریة قبطیة کانت من الجواری. وزوج رسول الله صلی الله علیه وسلم فاطمة بعلی کرم الله وجهه وزوج رقیة بعثمان رضی الله عنه فلما ماتت رقیة فزوج ام کلثوم وقال علیه السلام لو کانت عندی ثلثاً فزوجتك وتزوج زینب بابی العاص فماتت اولاد کلهن الا اولاد فاطمة رضی الله تعالیٰ عنها. والله اعلم بالصواب

مجلس دهم

چون بندگی حضرت مخدوم مقبول کونین هر یک طالبان ومریدان را از خدمت حضور پرنور خود جا بجا تکیه گاه مقرر فرموده بودند به مولانا آموں نیز اشارت فرمودند لیکن مولانا آموں از دولت شرف ملازمت که مداومت حصول بود هرگز مفارقت قبول نکرده از عمر دوازده سالگی تا آخر وقت پیری بخدمت حضور مخدوم پرنور در سیر و طیر ملازم می بود در روزے بندگی حضرت مخدوم عظمه الله بعزم دیدار مقبول پروردگار خواجه اسحاق مغربی نور الله قلبه بمقام تکیه گاه ایشان رسیدند ذکرے در خوردن چونه که از صدف سوخته می سازند درمیان

افتاده که خوردن چو نه روا باشد یا نه بندگی حضرت مخدوم جهان در جواب فرمود که آن صدف استخوان کرم است که آب مقامگاه اوست چون در آتش سوخته شود خوردن او روا باشد. در ینولا به اقتضاے خلق عالم آنوقت در خدمت کرام بندگی مخدوم مقبول انام به آرزوی تمام التجا برین آورده که قدرے زمین نذر مخدوم جهان آورده ام بکار فقیران خواهد آمد چنانچه بندگی حضرت مخدوم عظمه الله حضور خواجه مذکور از روے نوازش خاص مولانا آمون را به خطاب اسم چهار قسم شیخ آمون- بهائی آمون- مولانا آمون- مقبول عالم آمون ممتاز کرده زمین نذر خود عطای بمولانا آمون فرمود چنانچه مولانا مذکور قبول نموده تکیه و آرامگاه خود ساخت از انوقت درباب نوازش مولانا آمون اکثر آمد و رفت ظاهری بندگی مخدوم جهان در آن سرزمین بود بلکه یک گلچکان ابتداءً و تبرکاً از دست مبارک خود نصب کرده سیراب از شیر و شکر ساخت و بنصب درختان دیگر مولانا شیخ آمون را حکم فرمود که چون آباد خواهد بود آرامگاه فقیران و مسکین و وابستگان است بموجب حکم حضرت مخدوم مولانا شیخ آمون همچنان کردند

واللّٰه اعلم بالصواب

رسالہ وفات نامہ

ھو المستعان

رسالہ وفات نامہ

حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الحق

والحقیقت والدین احمد یحیی منیری قدس اللہ سرہ العزیز

در مطبع نامی علیگرہ طبع شد

سنہ [illegible] ہجری

جامع

زین بدر عربی

بسم الله الرحمن الرحیم

حمد و ستایش فراوان مر حضرت پاک خداوند پاک را که ارواح پاک انبیاء و اولیا از عالم پاک بلطف و فضل برای کسب کمالات ایشان و ارشاد و هدایت خلق در دنیا بظهور آورده بعد از کسب و کمالات به عالم پاک برد از کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِهٖ برین معنی است وَمِنْهُ یَبْدَاُ وَاِلَیْهِ یَعُوْدُ اشارت برین واردات است و درود بے پایان بر سرور عاشقان و تاج سر محبان محمد رسول الله صلی الله علیه و آله و سلم که اصل همه خلائق از انس و ملائک اوست اگر او نبودی نه عالم بودے و نه آدم و النبی الامی موید این رمز است و بعده تحیات تسلیمات بر آل و اهل بیت او و یاران او و علمائے طریقت و نُبَنائے حقیقت که هر یکے خلفائے او بودند در میان علم شریعت و احکام طریقت و اسرار حقیقت خصوصاً بر خلیفه عصرنا و مقتدای دهرنا مولانا و مخدومنا و استادنا و شیخنا و مرشدنا الخلق الی الحق قطب العارفین و برهان العاشقین شیخ شرف الحق و الحقیقت و الهدی و الدین احمد بن یحیی منیری قدس سره العزیز باد اما بعد میگوید بنده ضعیف زین بدر عربی که بعضے یاران در وقت رحلت حاضر بودند برین حقیر اشارت کردند که آنچه خدمت حضرت شیخ الاسلام و المسلمین قدس الله سره العزیز در وقت وداع هر کسے را فرموده اند و وصیت کرده اند در کاغذے جمع کن تا غائبان را ازان حظے و نصیبے باشد بنا بران این حقیر آنچه حقیقت حضرت شیخ الاسلام بوقت رحلت از وصایات و ادعیه و بشارت ها در حق بعضے که حاضر بودند بر سبیل مفصل و در حق بعضے که غائب بودند بر سبیل اجمال استماع افتاده بود درین اوراق جمع آورده بخدمت یاران که حاضر بودند تصحیح کرد در روز چهار شنبه پنجم ماه شوال ۷۸۲ سنه اثنی و ثمانین و سبعمائه بدایت سعادت قدمبوس بلب ادب حاصل آمد. بیت

سال ہجرت بود کاندم هفتصد و ہشتاد و دو ٭ اینچنین گنج معانی شد بہ خاک اندر نہان

بعد از نماز بامداد بندگی مخدوم جہان قدس اللہ سرہ العزیز در رواق نو کہ ملک الشرق ملک نظام الملۃ والدین خواجہ ملک رحمہ اللہ و مد عمرہ بنا کردہ بود بر سر سجادہ تکیہ فرمودہ بودند و خدمت شیخ جلیل الملۃ والدین برادر حقیقی و خادم خاص دام جلالتہ علی مسند التقویٰ و بعضے یاران و خدمتگاران کہ چند شب بدولت موافقت پیوستہ بیدار می بودند چنانکہ قاضی شمس الدین دام تقواہ و مولانا شہاب الدین خواہرزادہ خواجہ مینا و مولانا ابراہیم و مولانا امون و قاضی میان و ہلال و عقیق و عزیزان دیگر کہ حاضر بودند خدمت حضرت مخدوم قدس اللہ سرہ العزیز بر زبان مبارک راند لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ بعدہ روے مبارک بر ایشان آوردہ فرمودند شما ہم بگوئید بحکم فرمان ہمہ موافقت نمودند لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم بگفتند بعدہ تبسم کنان بطریق تعجب فرمودند کہ سبحان اللہ آن ملعون درین محل در مسئلہ توحید بہ چیزے میخواہد کہ بجنباند از فضل خداے تعالیٰ چہ التفات لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم گفتن گرفت و حاضران را نیز فرمودند کہ شما ہم بگوئید بعد گفتن لاحول ولاقوۃ در ادعیہ وظائف مشغول شد تا چاشت فارغ شد بعدہ بعد زمانی زبان مبارک بہ تحمید خداوند برکشاد و ابتدا آغاز کرد الحمد للہ الحمد للہ خدا کرم کرد المنۃ للہ المنۃ للہ چند کرت بہ خوشی دل و فرحت باطن بار بار ہمین اعادت می نمود فرمود الحمد للہ المنۃ للہ المنۃ للہ بعد ازان بندگی مخدوم قدس اللہ سرہ العزیز از رواق در صحن رواق آمد تکیہ فرمود بعد زمانے دست مبارک فراز کردہ بطریق مصافحہ دست قاضی شمس الدین دام تقواہ بگرفت زمانے گرفتہ بود گذاشت آغاز وداع ہم از ایشان بود بعدہ دست قاضی زاہد دام اللہ زہدہ در دست گرفت بر سینہ مبارک داشت و فرمود ما ہمانیم ما ہمانیم باز فرمود ما ہمان دیوان گانیم ما ہمان دیوان گانیم باز در مقام تواضع نزول فرمود بر لفظ مبارک راند بلکہ خاک کفش دیوان گانیم بعدہ ہر یکے را اشارت بالتفات بلیغ ارزانی فرمود دست در ریش ہر یک بہ بوسید و امیدوار رحمت پروردگار عزوجل و مغفرت او گردانید و این آیت بلند برخواند لَاتَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ

الذُّنُوبَ جَمِيعًا این بیت بزبان مبارک شکر افشان ارزانی داشت بیت

خدایا رحمت دریاے عام است	ازانجا قطرۂ بر ما تمام است

بعدہ روے مبارک بسوے حاضران آوردہ فرمود کہ اگر فردا شما را بہ پرسند کہ
چہ آوردہ اید بگوئید لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ آوردہ ایم و فرمود قدس اللہ سرہ
العزیز اگر مرا خواہند پرسید من ہمین خواہیم گفت بعدہ کلمۂ شہادت بلند گفتن گرفت
اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا
عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ و این دعا نیز خواند رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَبِيًّا وَّبِالْقُرْاٰنِ اِمَامًا وَّبِالْكَعْبَةِ قِبْلَةً وَّبِالْمُؤْمِنِيْنَ
اِخْوَانًا وَّبِالْجَنَّةِ ثَوَابًا وَّبِالنَّارِ عَذَابًا۔ بعدہ قدس اللہ سرہ العزیز روے مبارک
بہ جانب مولٰنا تقی الدین والملۃ اودہی دام تقواہ آوردہ دست مبارک فراز کردہ گرفت فرمود دعا
بخیر بلو و کرم و رحمت بسیار ارزانی داشت بعدہ بزبان مبارک رفت امون مولانا امون
نزدیک در درونی رواق بود شنید لبیک گویان دویدہ پیش آمد بشرف پاے بوس مشرف
گشت دست او بگرفت و بر روے و بر سینہ مبارک مالیدن گرفت و فرمود بسیار محبت
کردۂ ترا نہ خواہم گذاشت خاطر جمع دار یکجا خواہم بود و اگر روز خواست بہ پرسند کہ چہ آوردۂ بگوی
لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اگر مرا خواہند پرسید من ہم
ہمین خواہم گفت و یاران را بگوے کہ خاطر جمع دارند اگر مرا آبرو خواہد بود من ہیچ کس را
نہ خواہم گذاشت بعدہ روے مبارک بہلال و عتیق آوردہ فرمود قدس سرہ العزیز تو مرا
بسیار خوش داشتۂ بسیار خدمت کردۂ چنانچہ من از تو خوش بودہ ام تو ہم خوش خواہی بود و خوش
خواہی ماند دست کرت دست مبارک بر پشت ہلال فرود آورد و باز فرمود با مراد خواہی ماند و
ہر دو قدم مبارک در کنار ہلال بود کہ این شفقت و رحمت بدو ارزانی فرمود و بعدہ مولٰنا

شهاب الدین ناگوری دام تقواه بیامد چند کرت بر سر و روے و رخساره و ریش و دستار او بوسه
داد چنانکه روے مبارک و لب مبارک قدس الله سره العزیز بر روے او و سینه وا آه آه
کنان الحمد لله الحمد لله گویان دست مبارک فرود آورده درود میفرستاد و مولنا
شهاب الدین جمال مخدوم باکمال نظر میکرد و درود میفرمود بعده مولانا شهاب الدین دام تقواه
خواهرزاده مینا را فرمود قدس الله سره العزیز تو مرا بسیار خدمت کرده با من بسیار موافقت
نموده و بحسن خلقی که با من داشتی ملازمت بجد کرده عاقبت بخیر باد بهمدرین محل مولانا شهاب الدین
خدمت مولانا مظفر بلخی آبادی و مولانا نصیر الدین جونپوری دام تقواهما را یاد دهانیدند و عرضداشتند
که حضرت مخدوم درباب مولانا مظفر و مولانا نصیر الدین چه فرمان میشود بندگی مخدوم قدس الله
سره العزیز باخوشی تمام بر لفظ مبارک راندند و تبسم کنان فرمود باشارت جمیع انگشتان بجانب
سینه مبارک خود که مظفر جان من است و جانان من است و مولانا نصیر الدین هم همچنین فرمود
آنچه خلافت و مقتدای را میباید در ایشان موجود است آنکه بگفتم آن مسکینان را از فتنه خلق
باز داشتم درین محل مولانا شهاب الدین پسر خود را آورده بشرف پابوس مشرف گردانید
و عرضداشت خدمت مخدوم این را قبول فرمایند فرمود قدس الله سره العزیز قبول کردم این
چه باشد من خلف تو تمام قبول کردم بعده پسر او طاقیه ارزانی داشت و باز التماس به تجدید بیعت نمود که مخدوم تجدید
بیعت این بنده را مشرف گردانند بر لفظ مبارک فرمود من هم به تجدید قبول کردم بعده قاضی مینا دام علمه
بیامد پاے مبارک ببوسید هلال تعریف داد که قاضی مینا است فرمود قدس الله سره العزیز
قاضی مینا قاضی لبیک عرضداشت و بر کف دست مبارک بوسه داد بندگی مخدوم عالم
قدس الله سره العزیز دست مبارک بر روے و ریش و رخساره او فرود می آورد و میفرمود خدای
بر تو رحمت کند و بر زبان مبارک ارزانی میداشت که با ایمان باشی و با ایمان روی و این شفقت
هم ارزانی فرمود که مینا از آنِ من بود و مولانا ابراهیم دام تقواه آمد شرف پاے بوس مشرف شد
دست راست بر ریش مولانا ابراهیم فرود آورده و فرمود که خدمت مرا نیکو کرده و موافقت تمام

نمودگو با آبروخواهی بود مولانا ابراهیم عرضداشت که مخدوم شیخ البیاض از من خوشنود هستند فرمود ما از همه خوشنود هستیم باید که شما از ما خوشنود باشید هرچه هست از جانب من است بعده قاضی نورالدین برادر قاضی شمس الدین نور الله قلبهما بنور العلم والادب بیآمد و بسعادت دست بوس و قدم بوس مشرف شد بندگی مخدوم جهان قدس الله سره العزیز دست قاضی نورالدین بگرفت و بشفقت تمام بر ریش در روے و رخساره و دست آناه کنان چندکرت بوسه داد چنانکه روی مبارک سلطان العارفین بر روے و رخساره قاضی نورالدین رسید فرمود تو در صحبت من بسیار بوده و خدمت بسیار کرده من از تو خوشنودم انشاء الله تعالی فردا یکجا خواهیم بود بعده مولانا نظام الدین دهی کوبی بقدمبوس مشرف شد فرمود قدس الله سره العزیز بیچاره از آنجا که قصد کرده بود و بجوار ما آمده بود و طاقیه از سر مبارک کشیده بدو داد و انعام کرد و دعا عاقبت در باب او و در کار داشت و فرمود حق تعالی ترا به مقصود رساند و همه غریبان را معذرت کرد و فرمود یاران را برسید و غم ایمان و دین خود بخورید و مشغول بدان شوید بعده بیچاره یعنی زین بدر عربی سر بر زمین نهاد ترسان و لرزان نیت تجدید بیعت و توبه از گناه نمود دست مبارک سلطان العارفین قدس الله سره العزیز بگرفت بوسید و بر چشم و سر و هر دو مک دیده فرو د آورد و فرمان شد کیست این عرضداشت که بیچاره سگ کهین آستانه علیا توبه میکند و خواستم که عرضداشت کنم بندگی مخدوم قدس الله سره العزیز به تجدید قبول فرمایند از آنجا که نور باطن همه وقت در اشراق است بر حکم اشراق دریافت بر فور بر زبان مبارک ارزانی داشت بر و ترا قبول کردم و خانه ترا تمام قبول کردم و خیلخانه تو تمام بر من بسته اند همه را قبول کرده ام خاطر جمع دار اگر و آبروے خواهد بود من هیچکس را گذاشتنی نیام بیچاره عرضداشت که مخدوم بندگان مخدوم را آبرو است فرمود امیدها است قدس الله سره العزیز قاضی شمس الدین دام تقواه بیاید پهلوی بندگی حضرت مخدوم قدس الله سره العزیز بنشست مولانا شهاب الدین دبالال و عتیق عرضداشت مخدوم در باب قاضی شمس الدین چه فرمان میشود فرمود قدس الله سره العزیز قاضی شمس الدین را چه خواهیم فرمود قاضی شمس الدین فرزند من است چندین جاے فرزند نبشته ام در مکتوب برادرم نوشته ام و سبب انظار علم در دلیشی آزاد شده است و بواسطه او چندین گفتن و نوشتن

پیش آمده است وگرنه که نبشتی بعده خدمت شیخ جلیل الملة والدین برادر خادم خاص دام جلالته در
پہلوے مخدوم قدس الله سره العزیز نشسته بود دست مبارک مخدوم گرفته روے مبارک بجانب
شیخ جلیل الملة والدین آورد فرمود جلیل خاطر جمع دار تا علما و درویشان نخواهند گذاشت و ملک نظام
الدوله والدین خواجه ملک خواهد آمد سلام و دعا از من به رسانی و معذرت بسیار کنی و بگوے
که من از تو خوشنودم و خوشنود میروم و تو هم خوش خواهی بود فرمود که تا ملک نظام الدین است
نخواهد گذاشت شیخ جلیل الملة والدین به شکستگی تمام از انجا که بود برادری است بر قوت دیدار پیر شفیق آب در دیده کردن گرفت چون
مخدوم قدس الله سره العزیز چون شکستگی دل ایشان معاینه کرد بشفقت تمام فرمود که خاطر جمع
دار دل قوی دار بعده فرمود قدس الله سره العزیز کیست بلال عرضداشت که مولانا محمود صوفی است
بندگی مخدوم قدس الله سره العزیز بر طریق تاسف بلیغ بر زبان مبارک ارزانی داشت بیچاره
غریب است ما غم از این می آید بیچاره کس ندارد بعده دعاے عاقبت بخیر او در کار داشت بعد ازان قاضی خان
خلیل بشرف پاے بوس مشرف شد فرمود بیچاره قاضی خان یار قدیم است بسیار در صحبت من
بود حقتعالی ثواب بدهد و عاقبت بخیر گرداند فرزندان او هم دوستان من اند عاقبت بخیر باد و از
دوزخ حق تعالی خلاص دهد بعده خدمت خواجه معز الدین آمد و قدم بوس کرد عرض داشت فرمود
عاقبت بخیر باد و بعده مولانا فضل الله آمد و پاے مبارک مخدوم قدس الله سره العزیز بوسه داد
فرمود بہله بہله خداے تعالی عاقبت بخیر کناد بعده فتوح مطبخی خاص عتیق خدمت مخدوم قدس
الله سره العزیز و نور مضجعه گریه کنان آمد در پاے مبارک افتاد فرمود بیچاره فتوحا بود چنانکه بود
ازان من بود دعاے عاقبت در باب او مرحمت فرمود بعده مولانا شهاب الدین زرین بشرف
پابوس مشرف شد بلال تعریف داد مولانا شهاب الدین برادر حاجی رکن الدین است فرمود عاقبت
بخیر باد بر لفظ مبارک ارزانی داشت غم ایمان بخور ید و امیدوار رحمت حق گردانیده برخواند لَا
تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا بعد از زمانے به نزدیک نماز
پیشین خدمت سید نصیر الدین با پسر عم دام سیادته بشرف ملاقات مشرف شد خدمت حضرت

مخدوم قدس الله سره العزیز سید ظهیر الدین را کنار گرفت بلطف و شفقت تمام فرمود سینه بسینه گفتم
عاقبت این عاقبت است در مقام تواضع نزول فرمود دعا بازسه کرت در کنار گرفت و آخر این آیت
برخواند لا تقنطوا من رحمة الله ان الله یغفر الذنوب جمیعا و حاضران را امیدوار
رحمت و مغفرت خداوند گردانید بعده سید ظهیر الدین را اموارت فرمود و از پیش برخواست هم در رواق
درونی نشست بعده سلطان شه پرگنه دار راجگیر بالسر بشرف پابوس مشرف گشت روغن باد
شکن دران محل آورده بود بر زبان مبارک فرمود که مولانا نظام الدین هم آورده انه بعده شربت
و تنبول دهانید و معذرت کرد و بعده منور برادر خلیل گفت اشرف توبه و بیعت میخواهد که مشرف شود
فرمان شد بیا کو دست مبارک بجانب او دراز کرد و قرین توبه و بیعت مشرف گردانید مقراض راند و طاقیه
پوشانید و فرمود برو دوگانه بگذار بعده پسر او را بیعت کرد و کلاه پوشانید گفت برو دوگانه بگذار بیعت
توبه هم برایشان ختم بود بعده قاضی عالم احمد مفتی برادر مولانا نظام الدین مفتی که یکے از مریدان
خاص است دام علمه و حکمته بشرف پاے بوس مشرف شد بزانوے ادب مقابل روے مبارک
مخدوم جهان قدس الله سره العزیز نشست همدران محل امیر شهاب الدین برادر ملک حسام الدین
با پسر بیامد بشرف قدم بوس مشرف شد و بنشست و نظر مبارک مخدوم قدس الله سره العزیز بر پسر او
افتاده فرمود پنج آیت خواهی خواند حاضران مجلس علیا عرضداشتند که خورد است بعده پسر سید
ظهیر الدین مفتی حاضر بود بلال چون رغبت استماع کلام ربانی از جانب مخدوم قدس الله سره العزیز بدید پسر
ظهیر الدین را طلب کرد براے پنج آیت خواندن خدمت ظهیر الدین هم چون رغبت معاینه کرد به پسر اشارت
کرد برو پنج آیت پیش مخدوم جهان پسر سید ظهیر الدین پیش رفت و با ادب بنشست و این آیت معظم
خواندن برگرفت که محمد رسول الله والذین معه خدمت مخدوم قدس الله سره العزیز تکیه
فرموده بود برخواست و با ادب زانو بر طریق قدیم بحضور تمام استماع کردن گرفت چون دراین محل
در تلاوت رسید که سیماهم فی وجوههم من اثر السجود بندگی مخدوم قدس الله سره العزیز درین
محل رسید لیغیظ بهم الکفار دهشت خورده ماند بندگی مخدوم قدس الله سره العزیز بر زبان

مبارک تلقین کرد و یاد و بانید بعده چون این آیت تمام خواند فرمود ادا خوب میکند ولی دہشت میخورد
بعده درین محل ذکر درویش مغربی کرد که او را قرآن خواندن گاہے خوش آمدی وگاہے نیامدی وقت
از وقت شنیدی و وقت از وقت نشنیدی بعده قاضی عالم را بشرت و قبول دادن فرمود
و معذرت کرد و پیراہن از وجود مبارک کشیدن گرفت و برائے وضو آب طلبید و آستین مبارک
گرد آورد و مسواک نیز طلبیده و تسمیه بلند بر خواند و وضو آغاز کردند و ادعیه در ہر محلی میخواندند و ہر دو دست
شست تا آرنج و در شستن روئے مبارک سہو افتاد خدمت جلیل الملة والدین دام جلاله یاد دہانید
که بندگی مخدوم روئے مبارک نشستہ اند بعده بندگی مخدوم قدس الله سره العزیز وضو کردن
از سر نوع اعادت نمود و تسمیه و ادعیه چنانکه آمده است در ہر محلے میخواند با حتیاط تمام چنانکه
سید ظہیر الدین و الملة مفتی و حاضران مجلس معائنه میکردند و متعجب میشدند و ہر یکے میگفتند
که در این چنین حالت این احتیاط قاضی زاہد دام زہده و ورعه قصد در شستن پائے مبارک
دست دراز کرد خواست که یاری نماید مخدوم قدس الله سره العزیز دست قاضی زاہد باز داشت
و فرمود بایستید بعده ہم از خود وضو تمام کرد و بعد از تمام وضو شانه طلب کرد و در محاسن مبارک
شانه کشید بعده مصلا طلبید نماز شروع کرد و بدو رکعت سلام داد بعد زمانے جہت سستی
قالب مبارک استراحت فرمود بعده شیخ جلیل الملة والدین عرضداشت که مخدوم سلامت
در رواق شوند که وقت سرد شده است بندگی مخدوم قدس الله سره العزیز برخاست کفش در پای مبارک
کرد و روان شد یکدست مبارک خود بر گردن مولانا زاہد و دوم دست مبارک بر گردن مولانا شہاب الدین بنہاد
به سلامت درون رواق شد و ہم بر زمین بالائے نطع چرم شیر آسایش فرمود بعده شمود
برادر خلیل بزرگ است بشرف نیت بیعت توبه میخواہد که مشرف شود فرمان شد بیا کف دست
بجانب او فراز کرد به شرف توبه و بیعت مشرف گردانید و مقراض در ہر دو جانب راند و طاقیه پوشانید
و فرمود برود دوگانه بگذارد و بیعت و توبه بر ایشان ختم بود و درین محل عورتے باد و پسر ہم دولت
پائے بوس حاصل کرد و باز گشت بعد از نماز دیگر نزدیک نماز شام یاران عرضداشتند که مخدوم

با دولت بالاے کھٹ شوند بندگی مخدوم قدس الله سره العزیز بالاے کھٹ شدند و استراحت
میفرمودند بعد از گذاردن نماز شام شیخ جلیل الملة والدین و قاضی شمس الدین و مولانا شهاب الدین
و قاضی نور الدین و بلال و عقیق و بعضے یاران دیگر و خدمتگاران که خدمت و ملازمت داشتند
گرد بگرد کھٹ مبارک نشسته بودند بندگی مخدوم قدس الله سره العزیز بعد زمانے تسمیه بلند آغاز کرد
چند کرت تسمیه بار بار اعادت میفرمود بعد تسمیه این تسبیح خواند لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ
مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ بعده بار بار بسم الله الرحمن الرحیم باواز بلند گفته کلمه شهادت برخواند اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ
اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ بعده بلفظ مبارک لَا حَوْلَ
وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ و کلمه شهادت نیز برین طریق بزبان مبارک جاری میداشت
بسم الله الرحمن الرحیم لا اله الا الله محمد رسول الله چند کرت این کلمه بزبان مبارک راند بعد گفتن
کلمه با حرز بلیغ و با قوت دل و با شتیاق تمام چند کرت همچنین بزبان مبارک راند محمد محمد محمد و بعده
درود گفت اللهم صل علی محمد و علی آل محمد الی آخره و این آیت برخواند رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَةً مِّنَ
السَّمَآءِ تا آخر و این دعا نیز خواندن گرفت رَضِیْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ
عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَبِیًّا الی آخره بعده سه کرت کلمه طیبه بزبان مبارک تمام ارزانی داشت لَا اِلٰهَ اِلَّا
اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ بعده دست مبارک سوے آسمان دراز کرد و با شوق تمام بطریق مناجات
این دعا خواندن آغاز کرد اللهم اصلح امت محمد اللهم ارحم امة محمد اللهم اغفر امة محمد
اللهم تجاوز عن امة محمد اللهم اغث امة محمد اللهم انصر من نصر دین محمد اللهم فرج علی امة محمد
اللهم فرجا عاجلا اللهم اخذل من خذل دین محمد برحمتك یا ارحم الراحمین بعد
دعا امت محمد صلی الله علیه وسلم سخن مبارک ساکت شد این آیت مسموع میشد که بزبان مبارک ارزانی
داشت لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ لا اله الا الله بس لا اله الا الله بس بسم الله
الرحمن الرحیم گفت و جان بحق تسلیم کرد و از دار دنیا بدار عقبی رحلت فرمود و از حجاب بیرون آمد و بمشاهده
دوست به پیوست بحکم آنکه الموت یوصل الحبیب الی الحبیب از سراے فانی بسراے باقی

بجوار رحمت حق نقل کرد بر قضیه اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰهِ لَا یَمُوْتُوْنَ بَلْ یَنْقَلُوْنَ مِنْ دَارٍ اِلٰی دَارٍ شیخ اب
امد بحکم این آیت لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ
فَرِحِیْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ شب پنجشنبه ماه ششم شوال ۷۸۲ سنه اثنی وثمانین وسبعمائة بوقت نماز
خفتن نقل سلطان العارفین بود روز پنجشنبه بوقت نماز چاشت تدفین برهان المحققین واقع شد
تمام شد وفات نامه قدوة السالکین زبدة العارفین سراج الملة والدین پیر دستگیر کبیر حضرت مخدوم
شیخ شرف الحق والحقیقة والهدی والدین احمد بن یحیی منیری قدس الله سره العزیز

۲۷ ربیع الاول روز چهارشنبه ۱۳۲۱ ھ

اخوان الصفا

دار المصنفین

دو یار زیرک و ، از بادۂ کہن دومنی
فراغتی ، و کتابی ، وگوشۂ چمنی
من ایں مقام بدنیاؤ عاقبت نہ دہم
اگر چہ در پیم افتند خلق انجمنی !

(لسان الغیب)

ذیل میں شمس العلما مولانا شبلی نعمانی کی ایک تحریر درج کی جاتی ہے۔

جو تجویز پیش کی گئی ہے وہ برسوں سے پیش نظر ہے۔ بارہا اس بارے میں مشورے ہوئے اور نقش امید کے بہت سے خاکے بنائے گئے :

یک " کاشکے " بود کہ بصد جا نوشتہ ایم !!

مولانا کا خیال تھا کہ دار العلوم ندوہ کے ساتھہ ایک مخصوص عمارت اُن مہاجرین علم کی بھی ہوگی جو علم و پرستاری علم کی خاطر اپنے تئیں عام زندگی سے الگ کر لینگے - اور اسکا انتظام کچھہ مشکل نہ تھا - لیکن اب تو خود دار العلوم ندوہ ھی کا قیام مشکل ہوگیا ہے :

او خویشتن گم ست کرا رھبری کند ؟

فی الحقیقت یہ ایک نہایت ھی اہم تجویز ہے جو اگر پوری ہوگئی تو موجودہ سنین عمل کا ایک عظیم الشان کام ہوگا - یہ بڑی ھی غم کرنے کی بات ہے کہ ہم میں بہت سے کثیر المصارف کام ہورہے ہیں اور بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کردی گئی ہیں ' مگر ابتک تمام قوم ایک چھوٹا سا جھونپڑا بھی ایسا نہ بنا سکی جو علم اور مشاغل علمیہ کیلیے مخصوص ہو اور جہاں عشاق علم و شیفتگان فن جمع ہوکر شب و روز تحقیق و مطالعہ اور تصنیف و تالیف پر مشغول رہتے ہوں :

فراغتی و کتابی و گوشۂ چمنی !

بڑی مصیبت یہ ہے کہ جسقدر قابلیتیں موجود ہیں ' فقدان اسباب و صحبت کی وجہ سے ضائع جارھی ہیں ' اور نئی قابلیت پیدا نہیں ہوتی - علم کیلیے پہلی چیز صحبت و اجتماع ہے -

چوتھی صدی ھجری میں متوکل عباسی کی بد مذاقی اور تشدد و تعصب نے علماے بغداد کو ترک وطن پر مجبور کیا - مورخین نے اس عہد کو " ھجرت علم " کے لقب سے یاد کیا ہے کہ مشرق سے تمام اہل علم مغرب (اندلس و افریقہ) کی طرف چلے گئے - اسی زمانے میں بعض علما و حکما کی ایک خفیہ مجلس اس غرض سے قائم ہوئی تھی کہ علوم حکمیہ و الہیہ میں ایسے رسائل مدون کر دیے جائیں ' جنکی وجہ سے وہ علوم محفوظ

رهیں - " اخوان الصفا " اس مجلس کا نام تھا ' اور اسکے رسالے موجود ھیں -

آج بھی ضرورت ھے کہ ایک مجلس " اخوان الصفا " قائم ھو - ھماری سر زمین سے علم ھجرت کرچکا ھے - اب دوبارہ آسے دعوۃ دیکر بلانا چاھیے :

ھزار بار برو صد ھزار بار بیا !

پچھلے دنوں کسی ایسی صحبت کا خیال ھوا تھا اور اسی لیے " اخوان الصفا " لکھوا کر اسکا بلاک بھی بنا لیا تھا - جناب مولانا کی تجویز اسی کے ذیل میں شائع کر دیتا ھوں - اگر قابل اطمینان صورت اختیار کرلے تو میں اپنا پرائیوٹ کتب خانہ جسمیں تقریباً اکثر علوم اسلامیہ و عربیہ کا ذخیرہ ھے اور جسکی قیمت سات آٹھہ ھزار روپیہ سے کسی طرح کم نہوگی ' دار المصنفین کیلیے وقف کر دینے کیلیے طیار ھوں -

تقریباً ھر ماہ اسمیں کتابوں کا اضافہ ھوتا رھتا ھے -

پانچ سو روپیہ کا ایک نیا ذخیرہ مطبوعات یورپ کا عنقریب پہنچنے والا ھے - اس طرح ممکن ھے کہ پیشکش کے وقت اسکی حیثیت موجودہ حالت سے المضاعف ھو -

افسوس کے نقد اعانۃ سے مجبور ھوں ورنہ مولانا کا اتباع کرتا - '

ایک اھم تجویز

خدا کا شکر ھے کہ ملک میں تصنیف و تالیف کا مذاق پھیلتا جاتا ھے اور قابل قدر ارباب قلم پیدا ھوتے جاتے ھیں ' لیکن با ایں ھمہ اس گروہ میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ھے جنکو مصنف کے بجاے مضمون نگار یا انشا پرداز کہنا زیادہ موزوں ھوگا ' کیونکہ ان کی مستقل تصنفیں نہیں ھیں ' بلکہ معمولی رسالے یا مضامین ھیں -

اسکي وجه یه نہیں هے که ان کو اعلی درجه کي تصنیف کي قابلیت نہیں' بلکه اصل وجه یه هے که اعلی درجه کی تصنیف کے لیے جو سامان درکار هے وہ مهیا نہیں هے - ان میں سے اکثر کے پاس کتابوں کا ذخیرہ نہیں' جو انتخاب اور استنباط و اقتباس کے کام آے - اتفاق سے اگر کوئي مقامي کتب خانه موجود هے تو دل جمعي کے اسباب نہیں که اطمینان سے چند روز وهاں رهکر کتابوں کا مطالعه اور اس سے استفادہ اور نقل و انتخاب کرسکیں - ان باتوں کے ساتھه کوئي علمي مجمع بهي نہیں که ایک دوسرے سے مشورہ اور مبادله خیالات هوسکے -

ان مشکلات کے حل اور تصنیف و تالیف کي ترقي کے لیے ضرور هے که ایک وسیع دار التصنیف اصول ذیل کے موافق قایم کیا جاے :

(۱) ایک عمدہ عمارت " دار التصنیف " کے نام سے قایم کي جاے جسمیں ایک وسیع هال کتبخانه کے لیے هو اور جسکے حوالي میں ان لوگوں کے قیام کے لیے کمرے هوں جو یہاں رہ کر کتبخانه سے فائدہ اٹھانا اور تصنیف و تالیف میں مشغول رهنا چاهتے هوں -

(۲) یه کمرے خوبصورت اور خوش وضع هوں' اور اُن مشہور مصنفین کے نام سے موسوم هوں جو تصنیف کي کسي خاص شاخ کي موجد اور باني فن هیں -

(۳) ایک عمدہ کتب خانه فراهم کیا جاے جس میں کثرت تعداد هي پر نظر نهو بلکه یه امر بهي ملحوظ رهے که جس فن کي کتاب هو' نادر اور کامیاب هو -

(۴) تصنیفي وظایف قائم کیے جائیں اور وظیفه عطا کنندہ کے نام سے موسوم کیا جاے' یه وظایف یا ماهوار هونگے یا کسي تصنیف و تالیف کے صله کے طور پر دیے جائینگے -

(۵) جو لوگ کم از کم پانسو روپیه یکمشت عطا فرمائینگے ان کے نام اس عمارت پر کندہ کیے جائینگے - میں یه تجویز بالکل ایک سرسري صورت میں پیش کرتا هوں' اور چاهتا هوں که سردست

محض ایک خاکہ کے طور پر اسکی بنیاد قائم ہو جائے جو رفتہ
رفتہ خود بخود وسعت حاصل کرتی جائیگی - اس بات کا مجھکو
اطمینان ہے کہ ریاست ہائے اسلامی سے اس کے لیے ماہواریں
مقرر ہوسکینگی - سردست ہم کو صرف دس ہزار روپیہ درکار ہے جس
سے ایک مختصر تعمیر کی بنیاد ڈال دی جائے - اصلی فنڈ کیلیے
پچاس ہزار روپیہ کا تخمینہ کیا گیا ہے -

(۶) دس ہزار کی رقم میں، میں سردست ایک ہزار روپیہ
اپنا پیش کرتا ہوں - اور میں اسبات کا بھی مستدعی ہوں کہ جن
بزرگوں کو میری تجویز سے دلچسپی ہو مجھ سے خط و کتابت
فرمالیں، اور مناسب مشورہ سے میری ہمت افزائی کریں - نیز
ایڈیٹران ہمدرد، وطن، پیسہ اخبار، مشرق، البشیر، وکیل، وغیرہ
سے درخواست ہے کہ اس تجویز کو اپنے اپنے اخباروں میں شائع
فرمادیں - (شبلی نعمانی - لکھنو)

الهلال

۱۰ - جمادي الاخر ۱۳۳۲ ھ

اسئلة واجوبتها

بعض احاديث مشهوره

موضوعات كي اشاعت

احاديث مندرجۂ احياء العلوم

حضرت مولانا - السلام عليكم - چند احاديث كي صحت و عدم صحت كے متعلق بعض علما سے دريافت كيا ليكن مختلف اور متضاد باتيں كہي گئيں - يعنے اكثر نے تو صحيح كہا اور بعض نے ضعيف - يه حديثيں حضرة امام غزالي رحمة الله عليه كي احياء العلوم ميں ميں نے پڑھي هيں' اور اكثر واعظان دين نے بهي بيان كيا هے - اب جناب سے ملتمس هوں كه انكي نسبت محققانه جواب مرحمت هو - كيونكه بعض علما فرماتے هيں كه بڑي بڑي مشهور كتابوں ميں يه حديثيں موجود هيں جو تمهاري نظر سے نہيں گذريں - آپ جو كچهه فرمائينگے اس پر سب سے زياده مجهے اعتماد هے - (اسكے بعد وه احاديث نقل كي هيں اور بعض كا صرف مطلب لكهديا هے - چونكه جواب ميں وه سب آجائينگي اسليے يہاں مكرر نقل نہيں كي گئيں - الہلال)

خاكسار محمد علي پيش امام و خطيب - از بهاؤ نگر

الهلال:

احادیث کی صحت و عدم صحت کا معاملہ بہت نازک اور محتاج علم و نظر ہے - جب تک اس فن عظیم و مقدس سے واقفیت نہو، اور تمام علوم متعلقۂ حدیث پر نظر نہو، نیز تمام کتب معتبرۂ قوم و طبقات محدثین و رواۃ پیش نظر، و تصریحات ائمۂ فن و طریق تخریج و نقد و درایت کی پوری پوری من الباب الی المحراب خبر نہو، اس وقت تک کچھہ پتہ نہیں چلتا - محض چند کتب حدیث کا سامنے رکھہ لینا اس بارے مفید نہیں -

آجکل بڑی مصیبت یہ ہے کہ علم و جہل میں کچھہ تمیز نہیں رہی - ہر واعظ محدث اور ہر خواندہ زبان محقق ہے - نتیجہ یہ ہے کہ عوام میں اس کثرت سے موضوع و بے اصل حدیثیں مشہور ہو گئی ہیں کہ اگر ان سب کو جمع کیا جاے تو ایک نئی کتاب الموضوعات لکھنی پڑے - یہ ایک بڑی آفت ہے اور قوم کی ضلالت دینی کا بہت بڑا سبب ہوی - پھر اس سے بھی بڑھکر آفت یہ ہے کہ ہر عربی کا جملہ جو کسی واعظ کی زبان سے نکل جاے اور اس نے کتب مواعظ و قصص میں پڑھہ لیا ہو، اسدرجہ اصح الحدیث اور کالوحی و القران سمجھا جاتا ہے کہ اگر انکو بے اصل کہیے تو لوگ جنگ و جدل کیلیے آستینیں چڑھا لیتے ہیں!

(قصاص و واعظین)

یہ قصاص و وُعاظ کئی صدیوں سے مسلمانوں کیلیے سب سے بڑی مصیبت ہیں اور موجودہ عصر جہل نے اس مصیبت کو اور زیادہ عام و شدید کر دیا ہے - نہ تو انہیں قران کی خبر ہے نہ

حدیث و آثار کی - نہ کتابیں پڑھی ہیں اور نہ علم و فن کی صورت دیکھی ہے - صرف چند قصے اور اشعار یاد کرلیے ہیں جو یا تو اپنے بزرگوں سے سنتے آے ہیں یا کسی وعظ کی کتاب میں دیکھ لیے ہیں !

وعظ کی اصلی قوت دماغ کی جگہ انکے گلے میں ہوتی ہے. ایک مطرب و مغنی کی طرح گانا شروع کر دیتے ہیں ' اور پھر عربی کا ہر غلط سلط جملہ جو انکی زبان سے نکل سکتا ہے ' بے تکلف اور بے خوف "حدیث" کے لقب سے بیان کردیا جاتا ہے. غریب سننے والے جو موسیقی کے قدرتی تاثر سے پہلے ہی مرعوب ہوچکے ہیں ' شوق اور عقیدت سے سنتے ہیں' اور انکی تمام خرافات کو حدیث رسول یقین کر لیتے ہیں ! نعوذ باللہ من شر الجہل و الفساد !

آج اصلی مصیبت یہی ہے کہ قرآن و حدیث ہی اسلامی تعلیم کا اصلی سر چشمہ ہیں مگر انکی صحیح و حقیقی معلومات حاصل ہونے کا عوام بیچاروں کے پاس کوئی وسیلہ نہیں - واعظین جاہلین اور قصاص دجالین نے ہر طرف سے انکا محاصرہ کر لیا ہے - علماء حق اول تو قلیل ہیں ' پھر جتنے بھی ہیں ' اصلاح عوام کی اصلی تدابیر سے بے پروا :

کار از دوا گذشتہ و افسوں نکردہ کس !

(احادیث احیاء)

آپنے حضرۃ حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی احیاء علوم الدین کا ذکر کیا ہے' اور اُن احادیث کی نسبت خاص طور پر پوچھا ہے جو بکثرت اسمیں درج کی گئی ہیں - احیاء العلوم ایک ایسی کتاب جلیل و عظیم ہے کہ اگر تاریخ اسلام کی تمام تصنیفات سے صرف اعلی ترین کتابوں کی ایک بہت ہی منتخب فہرست بنائی جاے' تو بلا شبہ احیاء العلوم ان سب میں ایک خاص ممتاز کتاب ہوگی -

تاہم یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر عالم و مصنف کی حیثیت

علمي کا ایک خاص دائرہ ہوتا ہے اور اس سے باہر اسکی وہ حیثیت باقی نہیں رہتی - امام مالک محدث تھے اور فقیہ ' لیکن مورخ نہ تھے - پس تاریخ میں انکا قول بمقابلہ مورخ کے ارجح نہوگا - اسی طرح ابن خلدون بہت بڑا مورخ ہے' لیکن اگر حدیث و فقہ میں اسکی سند دی جاے تو اسے کوئی بھی تسلیم نہیں کریگا۔ ابن خلدون نے مقدمہ میں لکھدیا ہے کہ حضرۃ امام ابو حنیفہ کو صرف سترہ حدیثیں معلوم تھیں مگر آپ اسے تسلیم نہیں کرسکتے۔ ہرفن اپنی بحث و نظر کیلیے ایک خاص جماعت رکھتا ہے اور اسکے خاص خاص اصول ہیں - فن تاریخ کی بحث ہو تو مورخین کی سند لائیے - ادب کے مسائل ہوں تو ائمۂ ادب کی طرف رجوع کیجیے - یہ نہ کیجیے کہ بحث تو فقہ کی ہو' لیکن معتبر سمجھیں آپ کسائی اور سیبویہ کو کیونکہ وہ فن نحو میں امام تھے ! اکثر لوگ اس نکتے کو بھول جاتے ہیں اور سخت ٹھوکر کھاتے ہیں -

حضرۃ امام غزالی فلسفۂ و کلام کے ماہر' منقول و معقول میں تطبیق دینے والے' تصوف و سلوک کے سب سے بڑے اور سب سے بہتر معبر و ترجمان' اور علم اسرار الدین کے بہترین ذخیرہ کے جامع ہیں ' مگر محدث نہیں ہیں - محدثین و ارباب نقد نے صاف صاف لکھدیا ہے کہ احیاء العلوم میں اکثر حدیثیں ضعیف ' اور بہت زیادہ بے اصل و سند ہیں - اسی لیے شارحین احیاء نے اُن احادیث کی تخریج میں بڑی محنت اٹھائی' اور صحیح کو ضعیف سے اور حدیث کو غیر حدیث سے الگ کرنا چاہا - علامۂ ابن تیمیہ کا یہ قول احیاء کی نسبت مشہور ہے :

کلامہ فی الاحیاء غالبہ جید لکن فیہ اربع مواد فاسدۃ : مادۃ فلسفیہ و مادۃ کلامیہ و ترہات الصوفیہ و الاحادیث الموضوعہ -	امام غزالی کا اکثر بیان احیاء العلوم میں عمدہ اور معتبر ہے الا چار باتیں جو بطور مواد فاسد کے اسمیں شامل ہوگئی ہیں : فلسفیانہ مطالب' کلامیہ انداز' ترہات صوفیہ ' اور موضوع حدیثیں -

علامۂ موصوف کو مسلمان فلسفیوں اور متکلموں کے گروہ سے سخت نفرت تھی، اور انکی غیرت شریعت بعض متصوفین کے ترہات و شطحیات کی سماعت کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی، اسلیے انہوں نے ابتدائی تین چیزوں کو بھی احیاء کا مواد فاسد قرار دیا، مگر در حقیقت یہ رائے زیادتی سے خالی نہیں - البتہ آخری چیز یقیناً قابل ذکر ہے، یعنے نقل احادیث میں بے احتیاطی -

حضرت امام ہی پر موقوف نہیں - عموماً صوفیاء کرام نے نقل احادیث میں بڑی بد احتیاطیاں کی ہیں، اور یہی سبب ہے کہ انکے مخالفین کو تشدد و تعصب کا زیادہ موقع ملگیا ہے، اور حق یہ ہے کہ محدثین کرام اپنے اس تشدد میں حق بجانب ہیں -

(کتب موضوعات)

پس آپ احیاء العلوم وغیرہ پر اس بارے میں اعتماد نہ کریں، اور انکا بدلہ کتب موضوعات ضرور پیش نظر رکھہ لیں - حضرۃ شاہ ولی الله قدس الله سرہ نے حجۃ الله البالغہ میں طبقات حدیث و محدثین پر جو کچھہ لکھا ہے بہت نافع ہے - محدث ابن جوزی، حافظ سیوطی، ملا علی قاری، اور امام شوکانی کی کتب موضوعات چھپ گئی ہیں، اور ان میں عام زبانوں پر چڑھی ہوئی حدیثوں کا تذکرہ آگیا ہے - صاحب سفر السعادۃ کے تشدد کی اس بارے میں شکایت کی جاتی ہے مگر حقیقت اسکے خلاف ہے - شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی شرح سفر السعادۃ منگوا لیجیے - مع رد کے اسکا خاتمہ نظر سے گذر جائیگا اور فائدہ بخشے گا - شیخ عبد الرحمن بن علی شیبانی کی " التمیز فی ما یدور علی السنۃ الناس من الحدیث " بھی چھپ گئی ہے، اور اسمیں تمام مشہور حدیثوں کی کامل طریقہ پر تخریج کی گئی ہے - علامۂ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی تصنیفات میں بھی اسکا مواد بہت ہے - علی الخصوص مجمع الذخائر اور مجموعۂ رسائل جلد اول و دوم میں جو حال میں مصر میں چھپ گئے ہیں -

امام شوکانی کی موضوعات میں قدما کی تمام کتابوں کو

ضبط و اعتدال کے ساتھہ جمع کرنے کی کوشش کی ہے - اگر اسے آپ دیکھہ لیں تو عام و مشہور احادیث کے متعلق اچھی بصیرت حاصل ہو جائیگی -

(احادیث مسئولہ عنہا)

اب میں فرداً فرداً آپکی تحقیق کردہ احادیث کی نسبت عرض کرتا ہوں :

---

(۱) حب الدنیا راس کل خطیۃ - یعنی دنیا کی محبت تمام خطاؤں کی جڑ ہے -

بیہقی نے شعب الایمان میں حسن بصری سے روایت کی ہے - ابو نعیم حلیۃ الاولیا میں اسے حضرت عیسی کا قول کہتے ہیں (دیکھو حلیہ ترجمۂ ابو سفیان) مالک ابن دینار کی طرف بھی منسوب ہے - علامۂ ابن تیمیہ نے اسے جندب البجلی کا قول کہا ہے - بہر حال یہ جملہ معناً تو بالکل صحیح ہے، مگر لفظاً حدیث نہیں ہے -

---

(۲) ما وسعنی ارضی و لا سمائی و لکن وسعنی قلب عبدی المومن - یعنی خدا کہتا ہے کہ نہ تو مجھے زمین اٹھا سکی نہ آسمان، مگر میرے مومن بندے کے دل میں میں سما گیا :

در دل مومن بگنجم اے عجب
گر مرا جوئی دران دلہا طلب

معناً یہ جملہ بہت صحیح اور قران کریم کی اس آیت کا بیان ہے : انا عرضنا الامانۃ علی السموت و الارض و الجبال فابین ان یحملنہا و اشفقن منہا و حملہا الانسان - لیکن حدیث نہیں ہے - کسی کا قول ہے - محدثین نے تو اسے اسرائیلیات میں سے شمار کیا ہے -

---

(۳) " گوشت کو چھری سے کاٹ کر کھانے کی ممانعت "

غالباً آپ کا مقصود اس حدیث سے ہوگا : لا تقطعوا اللحم بالسکین فان ذلک من صنیع الاعاجم - یعنی گوشت کو چھری سے کاٹ کر نہ کھاؤ کیونکہ یہ عجمیوں کی ایجاد ہے -

بیہقی نے شعب الایمان میں اسے روایت کیا ہے - نیز ابو داود نے سنن میں، لیکن امام شوکانی لکھتے ہیں :

قال احمد : لیس بصحیح و قد کان النبی یحتز من لحم الشاة — امام احمد کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں کیونکہ آنحضرة کا بکری کے گوشت کاٹنا ثابت ہے -

پھر اس کی روایت میں ابو معشر ہے اور امام احمد کہتے ہیں کہ " لیس بشي " وہ کوئی چیز نہیں -

(۴) العلم علمان . علم الابدان و علم الادیان - علم دو ہیں : ایک وہ علم جس سے بدن انسانی کا تعلق ہے یعنے فن طب، اور ایک وہ جو شریعتوں اور دینوں کا علم ہے -

اسکی بھی کوئی اصلیت نہیں - ضعیف سے ضعیف سند سے بھی کسی نے روایت نہیں کیا - تعجب ہے کہ کیونکر یہ جملہ حدیث مشہور ہوگیا ؟

(۵) " رجب خدا کا مہینہ ہے اور شعبان پیغمبر کا اور رمضان میری امت کا "

فضائل ایام و شہور میں موضوعات کا بڑا ذخیرہ ہے - غالباً آپکا مقصد اس حدیث سے ہوگا : رجب شهر الله و شعبان شهري و رمضان شهر امتي، فمن صام في رجب يومين فله من الاجر ضعفان الخ -

لیکن محققین و ثقات فن نے اسے موضوع قرار دیا ہے - اسکے اسناد میں ابوبکر ابن الحسن النقاش ہے جو متہم ہے - اور کسائی نامی بھی ایک راوی ہے جو مجہول ہے -

(صلواة التسبیح)

(۶) " صلوة التسبیح اور اسکے فضائل "

" صلوة التسبیح " سے مقصود ایک خاص نماز نفل ہے جو چار رکعتوں میں ختم ہوتی ہے - ہر رکعت میں فاتحہ اور سورة

کے بعد " سبحان الله ، و الحمد لله ، و لا اله الا الله ، و الله اکبر " پندرہ پندرہ مرتبہ پڑھتے ہیں - پھر رکوع اور قومہ اور دونوں سجدوں میں بھی دس دس مرتبہ یہی کلمات پڑھے جاتے ہیں - اس طرح ہر رکعت میں ۷۵ مرتبہ کلمۂ تسبیح پڑھا جاتا ہے -

اس نماز کے متعلق متعدد طرق سے حدیث مروی ہے - سب سے زیادہ مشہور دو طریقہ ہیں : ایک حضرت ابن عباس کی روایت ہے، دوسرا ابی رافع کی روایت ہے - پہلی روایت کو ابو داؤد، ابن ماجہ ، اور حاکم نے درج کیا ہے - دوسری ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے - دار قطنی نے بھی حضرۃ عباس سے مرفوعاً روایت کیا ہے -

لیکن اس حدیث کے متعلق محققین فن میں اختلاف ہے - محدث ابن جوزی نے موضوعات میں شمار کیا ہے - حافظ ابن حجر اسکا رد کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ابن عباس والی روایت مضبوط اور شرط حسن پر ہے - نیز ابن داؤد نے اسے اسناد " لا باس " بہ سے روایت کیا ہے، اور فضل بن عباس، ابن عمر، علی ابن ابی طالب، جعفر ابن ابی طالب ، ام سلمہ ، ان سب سے روایتیں موجود ہیں - ایسی حالت میں ابن جوزی کا موضوع کہنا کس قدر زیادتی کی بات ہے ؟ چنانچہ لکھا ہے کہ " و قد اساء ابن الجوزی بذکرہ فی الموضوعات "

علاوہ حافظ ابن حجر کے ابن منده ، خطیب ، ابن الصلاح، اور نووی نے بھی اسے صحیح یا حسن قرار دیا ہے اور اسکی تصریح کی ہے - تاہم ایک بڑی جماعت محدثین کی اسے ضعیف بھی کہتی ہے، اور موضوع کہنے والوں میں ابن جوزی کے علاوہ عقیلی بھی ہیں :

و قال العقیلی : لیس فی صلواۃ التسبیح حدیث یثبت - و قال ابن العربی : لیس فیها حدیث صحیح و لا حسن

اور عقیلی نے کہا کہ صلواۃ تسبیح کے بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں - نیز ابن عربی کہتے ہیں کہ اس بارے میں نہ

(الفوائد المجموعة للشوكاني) تو کوئی حدیث صحیح مروی ہے اور نہ حسن -

حتی کہ حافظ سیوطی اللآلی میں لکھتے ہیں :

"والحق ان طرقہ کلہا ضعیفۃ وان حدیث ابن عباس یقرب من شرط الحسن الا انہ شاذ لشدۃ الفردیۃ فیہ وعدم المتابع والشاہد من وجہ معتبر، ومخالفۃ ہیئتہا لہیئۃ باقی الصلوۃ -

"اور حق یہ ہے کہ اس حدیث کے تمام طریقے ضعیف ہیں - ابن عباس والی حدیث البتہ شرط حسن کے قریب پہنچتی ہے مگر اسمیں بھی یہ کمی ہے کہ شاذ ہے، کیونکہ کمال درجہ اپنے بیان میں فرد ہے، اور اسکا تابع اور شاہد کوئی نہیں جو کوئی وجہ معتبر رکھتا ہو - نیز یہ بات بھی ہے کہ جس نماز کی اسمیں ترکیب بتلائی گئی ہے اسکی صورت باقی نمازوں کے مخالف ہے"

حافظ موصوف کا قول اس حدیث کیلیے سب سے بہتر اور معتدل قول فیصل ہے - اسی سے آپ رائے قائم کر لیں - رہا صلوۃ تسبیح کا حکم اور فضائل، تو وہ بہر حال ایک نفل نماز ہے اور بس طریق تسبیح سے عبادت کرنا کسی دوسرے نص کا معارض بھی نہیں - مختصر یہ کہ اسپر عمل کرنا قابل اعتراض نہیں ہوسکتا ا وھذا ھو الحق عندی -

(بعض دیگر موضوعات مشہورہ)

(۷) "حب الوطن من الایمان" محبت وطن کی ایمان میں سے ہے -

یہ ایک اچھا اور صحیح جملہ ہے، مگر اسے حدیث کہنا بالکل کذب و افترا ہے - کسی غیر معروف سند سے بھی مروی نہیں -

(۸) "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" میری امت کے علماء ایسے ہیں جیسے بنی اسرائیل کے نبی -

بالکل بے اصل ہے - حافظ ابن حجر نے صاف لکھ دیا ہے کہ "لا اصل لہ" البتہ "العلماء ورثۃ الانبیاء" کو احمد اور ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے -

سفرنامہ حجاز

مولانا مولوی ظفر احمد عثمانی

(تصنیف: ۱۳۵۲ھ)

تھانہ بھون کے **ظفر احمد عثمانی** جو رنگون کے مدرسہ
محمدیہ میں پڑھاتے تھے، ۳۰ر شوال ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۵ر فروری
۱۹۳۴ء بروز جمعرات براہ کراچی حجاز کے لیے روانہ ہوئے۔
یہ ان کا تیسرا سفر تھا۔ قبلاً یہ عہد عثمانیہ میں ۱۹۱۲ء میں اور پھر
عہد شریف حسین میں ۱۹۲۲ء میں بھی آچکے تھے۔

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا

حج بیت اللہ شریف کے مبارک سفر میں مفید معلومات بہم پہنچانے کیلئے رسالہ

سفرنامہ حجاز

و

زیارت حرمین شریفین

جس میں

استاذ العلماء حضرت مولانا مولوی ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی ظلہم العالی نے اپنے سفر حج ۱۳۵۲ھ کے مفصل حالات درج فرما کر حاجیوں کیلئے نہایت بصیرت افروز معلومات کا ذخیرہ جمع فرماتے ہوئے بہت سی ایسی ہدایات فرمائی ہیں جن کا مطالعہ عام مسلمانوں کے علاوہ آیندہ سفر کرنیوالوں کیلئے

نہایت مفید ہے

باہتمام احقر ظہور الحسن کسولوی ناظم کتبخانہ امداد الغرباء سہارنپور شائع ہوا

صرف سرفرق خیرخواہ سرکار پریس میں طبع ہوا

سفر حجاز و زیارت حرمین شریفین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

شکر للہ کہ نمردیم و رسیدیم بدوست
آفریں باد بریں ہمتِ مردانۂ ما

اللہ تعالیٰ شانہ کا ذکر کس زبان سے ادا کروں اور کہاں سے اُس کیلئے الفاظ لاؤں کہ باوجود میری نااہلی کے حضرت حق کی طرف سے انعامات کی ایسی موسلا دھار بارش ہو رہی ہے کہ عقل بعض دفعہ دنگ ہو جاتی ہے۔ کہ ایک نالائق غلام پر یہ لطف و کرم ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل نسیم صبح تیری مہربانی

دسمبر ۱۹۳۳ء میں بندہ نے مدرسہ محمدیہ ماندبیریہ (رنگون) سے ۶ ماہ کی رخصت اس خیال سے لی تھی کہ رخصت کا زمانہ وطن مالوف میں حضرت سیدی حکیم الامۃ دامت کاتہم کے سایۂ عاطفت میں گذاروں گا۔ ہاں تمنا کے درجہ میں جو ہر قلب مسلم میں ہمیشہ رہتی ہے یہ خیال بھی آتا تھا کہ اگر اسباب مہیا ہو گئے تو اسی زمانہ میں زیارت حرمین سے مشرف ہونے کی بھی کوشش کروں گا۔ مگر یہ خیال تمنا ہی کے درجہ میں آیا اور سینہ میں نہاں ہو گیا۔ کیونکہ بظاہر اس کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی نہ اسباب مہیا تھے۔

وطن سے روانگی

مگر رمضان کے بعد جبکہ دو ماہ سے زیادہ وطن میں قیام ہو چکا دفعۃً غیب سے سامان ہوا۔ اور حضرت حکیم الامۃ دام مجدہم کی عنایات و توجہات کے ساتھ بر اپنی بھتیجی کو ہمراہ لیکر جس پر حج فرض تھا ۳۰ شوال سنہ ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۵۔ فروری سنہ ۱۹۳۴ء بروز جمعرات بارادہ

حج بیت اللہ وزیارت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تھانہ بھون سے براہ سہارنپور کراچی کو روانہ ہوا۔ اور بھی چند احباب معہ چند مستورات کے ہمراہ ہو گئے تھے کراچی پہنچا ہمارا قافلہ ۱۴-۱۵- آدمیوں پر مشتمل تھا۔ تھانہ بھون سے سہارنپور تک حضرت سیدی حکیم الامتہ دامت برکاتہم ہم لوگوں کی مشایعت کیلئے تشریف لائے تھے۔ حضرت کی ہمراہ خانقاہ امدادیہ کے چند ذاکرین شاغلین اور اہلِ قرابت میں سے بھی متعدد افراد تھے۔ سہارنپور پہنچتے ہی حضرت والا کی تشریف آوری کی خبر بجلی کی طرح شہر میں پہنچ گئی۔ اور تھوڑی ہی دیر میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے ناظم صاحب اور شیخ الحدیث اور صدر مدرس اور بہت سے طلبہ اور عمائد شہر اسٹیشن پر جمع ہو گئے۔ ۸ ۱/۲ بجے شب کے ٹرین روانہ ہوئی اور سب حضرات نے دعائیں دیتے ہوئے ہمیں الوداع کیا۔ صبح کو ۶ بجے گاڑی لاہور پہنچی۔ میرے محترم دوست حافظ سخاوت علی صاحب منیجر یو۔ پی سوڈا واٹر فیکٹری لاہور اور ڈاکٹر عزیز احمد جلال الدین دندان ساز لاہور مع چند احباب کے پلیٹ فارم پر تشریف فرما تھے وہ اپنی موٹر میں لاہور لیگئے۔ جمعہ کی نماز شہر کی مسجد شیرانوالہ میں جس کے پیش امام مولانا احمد علی صاحب ہیں پڑھی اور نماز کے بعد مولانا کے اصرار پر کچھ بیان بھی کیا۔ عشا کے بعد بھی ایک مسجد میں احباب کی درخواست پر بیان کرنا پڑا۔ ان سب بیانات کا موضوع حج اور اس کی فرضیت اور مسلمانوں کو ادائے حج کی ترغیب تھا۔ شنبہ کی صبح کو بتاریخ ۱۰- فروری کراچی میل میں سوار ہو کر ۱۱- فروری کراچی پہنچا۔ یہاں بھی بعض مخلصین اسٹیشن پر موجود تھے۔ جن میں خصوصیت کے ساتھ حکیم مولوی عبد الحق صاحب فتحپوری کا سب سے زیادہ شکر گذار ہوں کہ آپ سکھر سندھ سے ایک دن پہلے ہی ہمارے استقبال کو کراچی پہنچ گئے تھے۔ شیخ عبد الکریم صاحب سشن جج سکھر سندھ کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کہ مولانا موصوف کو جناب ہی نے تحائف کے ساتھ کراچی بھیجا۔ اُن کی ہمراہ حاجی عبد الغنی صاحب چیرمین حج کمیٹی کراچی کے مکان پر پہنچا۔ ممدوح بہت ہی شریف۔ اخلاق اور بہترین عادت کے سچے مسلمان اور خادم حجاج ہیں۔ مجھے اس کے پہلے آپ سے ملاقات کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ مگر غیر

سنتے ہی کہ میرا قافلہ کراچی پہنچنے والا ہے۔ آپ نے اپنے صاحبزادہ کو اسٹیشن پر بھیجا اور اپنے مکان کا ایک قطعہ میرے قافلہ کیلئے مخصوص کر کے ایک ملازم کو ہماری خدمت

کراچی کا قیام

پر مامور فرما دیا۔ جہاز کی روانگی میں ۵-۶ دن کی دیر تھی۔ اس لئے کراچی میں بھی بہت سے احباب روزانہ ملتے رہے۔ ایک رات بعد عشا کے بیان بھی کیا اور حاجی عبد الغنی صاحب کی وجہ سے یہ قیام ذرا بار خاطر نہوا۔ حاجی صاحب موصوف کی ذات سے کراچی میں حجاج کو عام طور پر جس قدر راحت پہنچتی ہے وہ اُن تکالیف کا پورا کفارہ ہے جو کلکتہ اور بمبئی کے حاجیوں کو پہنچا کرتی ہیں۔ جس دن حاجی جہاز پر سوار ہوتے ہیں وہ دن اُن کیلئے قیامت صغریٰ سے کم نہیں ہوتا۔ ادھر اُدھر دھکے کھاتے پھرنا گھنٹوں تمازت آفتاب سے پسینہ میں شرابور ہو جانا اُس دن کے لوازمات میں سے ہے۔ مگر کراچی میں

جہاز پر سوار ہونا

ان تکالیف کا نام بھی نہیں تھا۔ ہمنے صبح ہی ایک آدمی کے ہاتھ اپنا تمام سامان جہاز پر بھیجدیا۔ وہ قلی کے حوالہ کر کے اُس کا نمبر نوٹ کر کے ۹ بجے واپس آگیا۔ ناشتہ اور کھانے سے فراغت پا کر ۱۲ بجے ہمنے جہاز پر چلنے کا تہیہ کیا۔ سوا بارہ بجے جٹی پر پہنچے تو سب حاجیوں کو ایک وسیع ہوا دار مسقف ہال میں بٹھلا دیا گیا۔ عورتوں کیلئے اسی قسم کا پردہ دار ہال جدا تھا۔ اُسی وقت حج کمیٹی کے رضا کاروں نے حاجیوں کے سامنے چائے پیش کی۔ چائے پی چکے تو شمار کرنے والے آئے اور گنتی کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر آیا اور سب کے سینہ پر ہاتھ رکھتا ہوا۔ چہرہ کا معاینہ کرتا ہوا پاسپورٹ پر مہر لگانے لگا۔ اس سے فراغت ہوتے ہی سب کو جہاز پر جانے کی اجازت دی گئی۔ ڈیڑھ گھنٹہ میں یہ سب مراحل آرام کے ساتھ طے ہو گئے اور ۱½ بجے ہم جہانگیر جہاز پر اپنی جگہ پہنچ گئے جہاں پہلے ہی سے قلی نے سامان کو ترتیب سے لگا رکھا تھا۔

سفر حجاز

جہانگیر جہاز بہت بڑا نہیں مگر پھر بھی گیارہ سو حاجی اُس پر سوار تھے۔ بعض لوگ جگہ کی قلت سے تکلیف میں تھے۔ میں حکومت ہند سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حاجیوں کے جہاز میں تھرڈ کلاس والوں کیلئے بھی سیٹیں بنا

دینا چاہئیں۔ ایک سیٹ اتنی بڑی ہو جس پر اوسط درجہ کا بستر آجاوے۔ تختۂ جہاز پر بستر لگا کر حاجیوں کا لیٹنا اونکی صحت کو بھی خراب کرتا ہے اور جگہ بھی بعضوں کے قبضہ میں زیادہ آجاتی ہے۔ آجکل ہر شخص کو ٹکٹ کے ساتھ کم از کم ایک وقت کی دو طرفہ خوراک کی قیمت ۱۲ ادا کرنا بھی لازمی ہے۔ کیونکہ حاجیوں کو جہاز میں کھانا پکانے کی بالکل ممانعت کر دی گئی ہے۔ جہاز میں ایک ہندوستانی ہوٹل بھی تھا جس کے سب ملازم مسلمان تھے۔ جو لوگ صرف ایک وقت کی خوراک کا ٹکٹ کیساتھ لئے ہوئے تھے وہ دوسرے وقت ہوٹل سے کھانا خرید لیتے تھے، حجاج کو عام طور پر یہ شکایت تھی کہ دس آنے میں جو خوراک ہم کو جبراً دی جاتی ہے۔ اُس سے عمدہ اور لذیذ تر خوراک ۵ ؍ میں ہوٹل سے مل جاتی تھی قیمہ کی پلیٹ ۳ ؍ میں ایسی لذیذ ملتی تھی کہ جہاز کا سالن اُس کے سامنے ہرگز کسی قابل نہ تھا میں نے دوسروں کی زبانی یہ شکایت روزانہ سنی۔ مگر خود اس شکایت میں شریک نہیں ہوں۔ کیونکہ مجھے ہوٹل کا کھانا جہازی کھانے سے بہت زیادہ اچھا معلوم نہوتا تھا

۲۲۔ فروری کو ۲ ½ بجے جہاز نے لنگر اُٹھایا۔ دو روز ہوا کی تیزی سے جہاز کو زیادہ حرکت رہی جس کی وجہ سے بعض لوگ چکر اور امتلاء کی شکایت میں مبتلا رہے تیسرے روز عام طور سے سب لوگ اچھے خاصے خوش و خرم نظر آتے تھے۔ اس جہاز میں بمبئی سے مولانا محمد شفیع صاحب بجنوری بھی سوار ہوئے تھے۔ جو حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی قدس سرہ کے خاص خدام میں سے ہیں اور جذب کی ایک خاص شان اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اُن کو کسی طرح میری خبر لگ گئی۔ تلاش کرتے کرتے میرے دن میرے پاس پہنچے۔ مولانا سے مل کر بہت جی خوش ہوا کیونکہ میں اُن کو ایک بابرکت بزرگ سمجھتا ہوں۔ پھر میں بھی مولانا کی قیامگاہ پر گیا اور مولانا کے اصرار سے حج اور آداب زیارت رسول پر دو گھنٹہ تک تقریر کی جس سے عام طور پر سب حاجی بہت محظوظ ہوئے اور اسکے بعد جہاز ہی میں احکام حج و اسرار حج پر مجھے متعدد بیان کرنا پڑے۔

یہ سفر بہت پر لطف رہا سمندر میں بھی سکون تھا اور حجاج میں بھی سکون تھا کسی طرف سے لڑنے جھگڑنے کی آواز مطلق نہ آتی تھی جو ایسی پر ہجوم جہاز میں روزانہ کانوں کو تکلیف

دیا کرتی تھی -

باب مکہ جدہ

۴ - مارچ کو ہمارا جہاز کامران پہنچا - اور دو تین گھنٹہ ٹھیرا رہا ڈاکٹر نے جہاز کا اور حاجیوں کی صحت کا معائنہ کیا - اس کے بعد آگے جانے کی اجازت دیدی گئی جو لوگ پہلے مدینے جانیوالے تھے اُنہوں نے احرام نہیں باندھا - جو پہلے مکہ جانیوالے تھے اُنہوں نے کامران ہی میں یا اس سے نکل کر احرام باندھ لیا - اس وقت جہاز کے گوشہ گوشہ سے لبیک اللھم لبیک کی دلکش صدائیں جارہی - اور روح کو مست بادہ الست بنارہی تھی" میں نے اور میرے رفقار نے پہلے مدینۃ الرسول کی حاضری کا ارادہ کیا تھا - اس لئے ہم ابھی محرم نہ ہوئے تھے -

۵ - مارچ کو دس بجے دن کے قریب ہمارا جہاز ساحل جدہ پر لنگر انداز ہوا - اس وقت کی خوشی کا اندازہ کچھ وہی لوگ کرسکتے ہیں جو اس منظر کا نظارہ کررہے تھے ؎

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک آتش شوق تیز تر گردد

۱۱ بجے کے درمیان ہم جہاز سے اُترکر ایک چھوٹی ڈکشتی میں سوار ہوئے جس میں صرف میرے رفقار ہی تھے - دوسرا کوئی نہ تھا - کنارہ پر پہنچکر ہم ایک دروازہ سے داخل ہوئے اور کشتی مع سامان کے دوسری طرف کسی قدر فاصلہ سے کنارہ پر کھڑی ہوگئی - معلم کا نام پوچھا گیا - ہمنے اپنے معلم کا نام یحیٰی محبوب بتلادیا تو ٹکٹ اور پاسپورٹ ہم سے لے لیا گیا - اور معلم کے وکیل نے اپنی ساتھ لیکر سامان کے پاس پہنچا دیا مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ سامان کے ساتھ ہم سے کوئی بھی نہ تھا مگر کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کو ہاتھ بھی لگا سکے - گاڑی کرایہ کرکے وکیل نے مع سامان کے ایک مکان پر پہنچا دیا - وہاں مستورات نے ظہر کی نماز پڑھی - ہم ساحل ہی پر نماز سے فارغ ہوچکے تھے - جدہ میں داخل ہوکر میں نے محسوس کیا کہ اس وقت پہلے سے زیادہ رونق اور آبادی ہے - دوبار اس سے پہلے بھی میں اس مبارک سرزمین میں حاضر ہوچکا تھا - اُس وقت اس قدر رونق اور آبادی نہ تھی - ہاں ترکی زمانہ میں لوگ عام طور سے خوش حال نظر آتے تھے اور اس وقت زیادہ تر مفلوک الحال تھے - لیکن بازاروں میں چہل پہل پہلے سے کم نہ تھی ؎

وکیل جدہ نے ٹیلیفون پر معلم کو مکہ ہماری اطلاع کر دی تھی۔ اگلے روز معلم صاحب تشریف لے آئے اور بہت تپاک سے ملے۔ حجاز کی اقتصادیات پر دیر تک گفتگو رہی پھر وہ ہمارے لئے روانگی مدینہ کے واسطے موٹر لاری کا بندوبست کرنے چلے گئے

مدینہ منورہ کا سفر

۱۷۔ مارچ کو بعد ظہر کے جدہ سے مدینہ کی طرف لاری روانہ ہوئی ظہر کی نماز جدہ سے باہر نکل کر پڑھی راستہ میں منزل دعبان پھر منزل طوال آئی۔ یہاں عصر کی نماز پڑھی گئی، پھر روانہ ہوئے تو منزل سے پہلے ہی مغرب کا وقت آگیا۔ میں نے ڈرائیور سے جس کا نام علی جاوی تھا کہا کہ نماز کیلئے موٹر روک دے۔ وہ چونکہ شافعی المذہب تھا کہنے لگا مغرب وعشا دونوں جمع کر لینا۔ میں نے کہا میرے مذہب میں اسکی اجازت نہیں کہنے لگا آج مذہب شافعی پر عمل کر لو۔ کیونکہ مذاہب سب برحق ہیں۔ اس کا میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ مگر تھوڑی دور چلکر موٹر خراب ہو گیا اور ڈرائیور خود ہی کہنے لگا کہ آپ مغرب کی نماز پڑھ لیں۔ موٹر ابھی نہیں چل سکتا، ہم نے فراغت کے ساتھ مغرب کی نماز ادا کی تھوڑی دیر میں ایک خالی لاری آئی جس میں موٹر کے پرزے پیٹرول کا ذخیرہ اور ایک مہندس (موٹر بنانے والا) موجود تھا تحقیق سے معلوم ہوا کہ حکومت کی طرف سے یہ انتظام کیا جاتا ہے کہ لاریوں کے قافلہ کے پیچھے ایک خالی لاری مکمل سامان کے ساتھ رہے۔ تاکہ راستہ میں کوئی موٹر خراب ہو جائے یا پیٹرول ختم ہو جائے۔ تو اُس کو امداد دی جائے۔ اور کسی کی کوئی چیز گر پڑے تو اُٹھا لی جائے۔ غرض اس لاری کے آنے سے ہمارا موٹر درست ہو کر اس تیزی سے چلا

منزل رابغ

کہ عشا کے وقت رابغ پہنچ گیا۔ موٹروں کے اڈے پر سقف قہوہ خانے بنے ہوئے ہیں۔ جہاں مسافروں کیلئے پلنگ بچھے ہوتے اور کھانے پینے کا سامان۔ روٹی۔ سالن۔ چائے وغیرہ دوکان پر موجود تھی قیمت دیکر جو چاہو خریدو۔ اور کھا پی کر آرام کرو۔ پہلے زمانہ میں منازل پر یہ سامان نہ تھا۔ آسمان کے نیچے سونا پڑتا اور خود کھانا پکانا پڑتا تھا، ہم لوگ قہوہ خانہ میں پہنچے۔

تو معلوم ہوا کہ مستورات کیلئے پردہ دار کمرے الگ بنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ مستورات نے پردہ کے مکان میں اُتر کر اطمینان سے نماز ادا کی اور نماز کے بعد روٹی کھا کر چائے پی کر سب نے آرام کیا۔ ہمارا سامان موٹر پر لدا ہوا تھا جس کا کسی قدر فکر تھا۔ مگر قہوہ خانہ والے نے اطمینان دلایا کہ آپ کی کوئی چیز ضائع نہوگی۔ بیفکر سو جائیے سامان کا میں ذمہ دار ہوں۔ مجھے اس بات سے بڑی حیرت ہوئی۔ کیونکہ پہلے کسی کی مجال نہ تھی کہ اس جرأت کے ساتھ سامان کی ذمہ داری لیکر حاجیوں کو مطمئن کر دیتا۔ ہم بے فکر سو گئے اور سامان موٹر ہی میں رہا۔ الحمد للہ کوئی چیز ضائع نہیں ہوئی +

حکومت کا انتظام

میں نے عموماً حجاج کو راستہ کے امن و آسایش کی تعریف کرتے ہوئے اور انتظام حفاظت پر حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے پایا۔ جو درحقیقت حکومت عربیہ سعودیہ کا نمایاں کارنامہ ہے۔ رابغ سے نماز فجر کے بعد ناشتہ کرکے موٹر پر سوار ہوئے۔ اور دو تین گھنٹہ میں منزل ستورہ پر پہنچے وہاں پندرہ منٹ کیلئے قیام ہوا کسی نے پانی پیا کسی نے چا نوشی کی۔ جدہ سے رابغ تک راستہ بہت اچھا تھا۔ ساحل بحر کے قریب سے زمین نرم ہے اور موٹروں کے چلنے سے راستہ ہموار بھی ہوگیا۔ رابغ سے ستورہ تک بھی

رابغ سے مدینہ تک

راستہ اچھا ہے۔ مگر کہیں کہیں ریتلا میدان بھی آجاتا ہے۔ ستورہ سے منزل بنی الحصان تک ریت بہت زیادہ ہے۔ اور ریت کے نیچے پتھر بھی دبے ہوئے ہیں۔ جن کی وجہ سے موٹر زیادہ اُچھلتا ہے، جو لوگ لاری کے پچھلے حصے میں بیٹھے ہوتے ہیں اُن کو تکلیف کا سامنا ہوتا ہے۔ کاش حکومت سعودیہ اس قطعہ کی مرمت کردے۔ تو حجاج کو بڑا آرام ہو جائے۔ ستورہ سے ابجے روانہ ہو کر ایک بجے منزل بنی الحصان میں پہنچے وہاں دو گھنٹہ قیام ہوا کیونکہ کھانے کا بھی وقت تھا اور ظہر کی نماز کا بھی۔ مستورات کیلئے یہاں بھی پردہ دار کمرے قہوہ خانے میں موجود تھے۔ پلنگ اور بورئیے بچھے ہوئے تھے سب نے اطمینان سے کھانا کھایا۔ ظہر کی نماز پڑھی آرام کیا پھر موٹر میں سوار ہوئے۔ اس مقام پر

حکومت سعودیہ کے اس انتظام کی داد نہ دینا انصاف کا خون کرنا ہی کہ آجکل تقریباً ہر منزل پر پولیس کی چوکی اور حکومت کا دفتر بنا ہوا ہی جس حاجی کو جو شکایت ہو وہ محکمہ پولیس سے رپورٹ کر کے اپنی شکایت کا ازالہ کر سکتا ہے۔ پہلے یہ انتظام نہ تھا بلکہ مکہ سے مدینہ تک سب حاجی بدوؤں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیے جاتے تھے۔ بنی الحصان سے مدینہ منورہ تک راستہ کے دونوں طرف مسلسل پہاڑ ہیں راستہ پختہ ہے جو موٹر کیلئے بہت موزوں ہے مگر صفائی اور مرمت کی ضرورت ہی۔ اگر راستہ سے بڑے پتھروں کو ہٹا دیا جائے اور چھوٹے چھوٹے پتھروں کو کٹوا دیا جائے۔ تو معمولی خرچ میں سڑک بہت عمدہ ہو جائیگی۔

مدینہ کے پہاڑ

حجاج اس راستہ میں شروع ہی سے درود شریف کی کثرت رکھتے ہیں۔ مگر منزل بنی الحصان سے روانہ ہو کر یہ ورد ترقی پذیر ہو جاتا ہے دونوں طرف پہاڑ ایسے خوشنما نظر آتے ہیں کہ دل بیتاب ہو جاتا اور کشش باطنی کو خاص طور پر محسوس کرنے لگتا ہے۔ اللہ اللہ اس راستہ کے انوار و برکات کا کیا کہنا جس میں کبھی نور مجسم صلے اللہ علیہ وسلم نے ناقہ قصوا پر سوار ہو کر سفر کیا اور اپنی نظر انور سے ان پہاڑوں کو مشرف فرمایا تھا آج ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد بھی نظر انور کے انوار و برکات ان پہاڑوں میں نمایاں اور عشاق کے دلوں کو بیتاب کرنے کیلئے کافی سے زیادہ نمایاں ہیں۔ اللھم صل وسلم وبارک علیہ وعلی آلہ بقدر حسنہ وجمالہ ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است — اُفتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہردم ہزار بوسہ زنم دست خویش را — کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

؎

در منزلیکہ جاناں روزے رسیدہ باشد — با خاک آستانش داریم مرحبائے

منزل بنی الحصان کے بعد مریشہ پھر شیجہ پھر بیر عباس پھر ابیار علی چند منازل آتی ہیں جہاں تھوڑی دیر موٹر ٹھیرتا ہے تاکہ حجاج ضروریات سے فارغ ہو سکیں اور نماز کا وقت ہو تو نماز پڑھ لیں۔ اکثر منازل پر پولیس کی چوکی بھی خوبصورت بنی ہوئی ہے جہاں ڈرائیور کو اپنا پاس دکھلانا اور آگے جانے کیلئے دوسرا پاس لینا ہوتا ہے۔ ایک آدمی

سواریوں کو شمار بھی کرتا ہے تاکہ لاری میں قانون کے خلاف زیادہ سواریاں نہ سوار ہو سکیں

منزل بیر علی

منزل ابیار علی کا قدیم نام ذو الحلیفہ ہے۔ اسی جگہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا احرام باندھا تھا اور آج بھی اُسی مقام پر مسجد بنی ہوئی ہے۔ جہاں حضور نے احرام کی دو رکعتیں پڑھکر لبیک کی صدا بلند فرمائی تھی۔ یہاں سے مدینہ منورہ یعنی طیبہ مدینۃ الرسول ۶۔۷ میل کے قریب ہی۔ جب ہماری لاری اس منزل سے گذری ہی تو دل کی جو حالت تھی زبان قلم اُس کو بیان نہیں کر سکتی۔ کوئی درود شریف پڑھ رہا تھا۔ کوئی غلبۂ شوق میں اشعار نعتیہ پڑھ رہا تھا۔ کوئی ہیبت وجلال وکمال و جمال کی تجلی سے بیساختہ رو رہا تھا۔ کوئی عربی بارگاہ نبوی سے اس طرح عرض معروض کر رہا تھا ے

یا خیر من دفنت بالقاع اعظمہ	فطاب من طیبہن القاع والاکم
نفسی الفداء بقبر انت ساکنہ	فیہ العفاف وفیہ الجود والکرم
انت الحبیب الذی ترجی شفاعتہ	عند الصراط اذا ما زلت القدم

ے

امر علی الدیار دیار لیلے	اقبل ذا الجدار وذا الجدارا
وما حب الدیار شغفن قلبی	ولکن حب من سکن الدیارا

لوگ اپنے ولولہ اور شوق وذوق میں مست تھے اور موٹر اپنی برقی روشنی سے راستہ کو روشن کرتا ہوا تیزی کے ساتھ فراٹے بھر رہا تھا کہ عشا کے وقت دیار حبیب کی روشنی نے آنکھوں کو منور۔ دلوں کو مجلا ومطہر اور عقول کو حیرت زدہ بنا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے

مدینہ منورہ میں داخلہ

مدینے منورہ کا دروازہ باب العنبریہ سامنے آگیا۔ اور ہم سب موٹر سے اُتر کر پیادہ پا ہو گئے کہ اس مقدس سرزمین میں سوار ہو کر چلنا خلاف ادب تھا۔ حق تو یہ تھا کہ سر کے بل چلتے اور آنکھوں کو فرش راہ بنا دیتے۔ مگر اللہ رے عنایت ورحمت کہ امت کے غلاموں کو پیادہ پا چلنے کی بھی اجازت دیدی گئی ے

ان جئتکم قاصدًا اسعیٰ علی بصری　　لم اقض حقا وای الحق ادیت

واللہ قدم قدم پر یہ خیال آ کر کہ یہاں کسی وقت حضور کے قدم مبارک پڑے تھے آپ اس مبارک سرزمین میں آمد و رفت رکھتے تھے بدن میں سناٹا نکل جاتا تھا کہ ہم اس مقدس سرزمین پر کیونکر سر رکھیں اور کس طرح چلیں ؎

بتقاضیکہ نشانِ کفِ پائے تو بود　　سالہا سجدۂ صاحب نظران خواہد بود

باب العنبریہ پر حجاز ریلوے کا خوشنما خوبصورت اسٹیشن بنا ہوا ہے جو ترکی حکومت کی یاد دلوں میں تازہ کر کے چٹکیاں لیتا رہتا ہے۔ کیونکہ اب نہ وہ ریل ہی ہے نہ اُس کی آمد و رفت ہے۔ صرف اسٹیشن باقی ہے ؎

یہاں موٹر پہنچا ہی تھا کہ مزورین نے اور اُن کے آدمیوں نے حجاج کا استقبال کیا ہمارے مزور شیخ احمد تواب تھے۔ اُن کے آدمی ہماری پیشوائی کو آئے ہوئے تھے۔ مستورات اور سامان کے لئے ایک گاڑی کرایہ کر کے اُن کو سوار کر دیا گیا۔ اور ہم سب پیادہ پا درود شریف پڑھتے ہوئے مدینۃ الرسول میں داخل ہو کر اُس مقدس سرزمین میں چلنے لگے۔ جہاں ساڑھے تیرہ سو سال پہلے نورِ مجسم نورٌ من انوار اللہ کا داخلہ ہوا تھا تو مدینہ کے در و دیوار چمک اُٹھے تھے اور ننھے ننھے بچوں کے دلوں میں مسرت و بہجت کی ایسی موجیں۔ لہریں مارنے لگی تھیں کہ چہروں سے خوشی کے پھول جھڑنے اور مُنہ سے یہ اشعار موتی کی طرح بکھرنے لگے تھے ؎

طلع البدر علینا من ثنیۃ الوداع　　وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع

ایّھا المبعوث فینا جئت بالامر المطاع

اور بچیوں کی زبان پر یہ ترانہ تھا ؎

نحن جوارٍ من بنی النجار یا حبذا محمد من جار۔ اللھم صل وسلم و بارک علیٰ ھذا النبی الکریم و علیٰ اٰلہ واصحابہ ازکی صلوٰۃ وافضل تسلیم۔

ہم کسی خیال میں مست چلے جا رہے تھے۔ کبھی اپنی قسمت پر ناز کرتے کہ کہاں سے کہاں پہنچے۔ کبھی ہیبت و جلال سے لرزنے لگتے کہ یہ وہ بارگاہ ہے جس کے خادم بڑے بڑے

فرشتے ہیں۔ یہ وہ دربار ہے جس کی غلامی کی آرزو بڑے بڑے انبیاء علیہم السلام کو بھی تھی خوش نصیب ہم مسلمانوں کا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمکو حضور کے غلاموں میں داخل اور آپ کی امت میں شامل فرمادیا ہے

طوبیٰ لنا معشر الاسلام ان لنا	من العنایۃ رکناً غیر منہدم	ے
چہ غم دیوار امت را کہ باشد چو تو پشتیباں	چہ باک از موج بحر آں را کہ باشد نوح کشتیباں	

راستہ میں ایک مزدور سے میں نے دریافت کیا کہ مدینہ والوں کی آجکل کیا حالت ہی؟

مزدور- کیا آپ نے اس سے پہلے بھی مدینہ کی زیارت کی ہی؟

میں- ہاں! میں ایک بار ۱۳۲۲ھ میں حاضر ہوا ہوں جبکہ یہاں ترکی حکومت تھی اور دوبارہ ۱۳۳۳ھ میں حاضر ہوا ہوں جبکہ شریف حسین خود مختار بنے ہوئے تھے۔

مزدور- آبدیدہ ہوکر! اگر آج ترکی حکومت یہاں ہوتی تو میں آپکے ساتھ پیادہ دیا نہوتا۔ بلکہ میرے پاس اور ہر متوسط الحال کے پاس ایک ایک موٹر ہوتا۔ آپ خود مشاہدہ کرلیں گے کہ مدینہ میں اس وقت کس قدر افلاس ہے۔ مگر بہر حال ہم شاکر وصابر ہیں اور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے زندہ نظر آتے ہیں۔

مجھ پر اس تقریر کا جو کچھ اثر ہوا اس کو میرا دل ہی جانتا ہی۔ واقعہ یہ ہے کہ مدینہ ومنازل مدینہ میں افلاس بہت زیادہ ہی۔ میں نے خود دیکھا کہ حجاج کھانا کھاتے ہوئے جس ہڈی کو پھینک دیتے تھے غریب بچے اُس کو اُٹھا لیتے اور صاف کرکے چوسنے لگتے تھے۔ ایک ایک لقمہ کے لئے وہ ترستے ہیں مگر صبر وشکر کا یہ حال ہے کہ ایک بچہ سے جس کی عمر دس گیارہ سال سے زیادہ نہ ہوگی میں نے کہا تم ہندوستان چلو تو تم کو کھانا کپڑا بھی دیں گے اور ماہوار وظیفہ بھی مقرر کردیں گے۔ اُس نے بیساختہ جواب دیا کہ یہ تو ناممکن ہی جس مقدس سرزمین میں ہزاروں روپے جمع کرکے تم آتے ہو ہم اُس کو چھوڑ کر باہر نہیں جاسکتے۔

میں اسباب افلاس کے متعلق اپنا خیال آیندہ اوراق میں ظاہر کردوں گا۔ اس وقت واقعات کے ضمن میں اجمالی تذکرہ ہی کافی ہی۔

مسجد نبوی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم باب مجیدی پر پہنچے جو مسجد نبوی کا عالیشان دروازہ

ہے۔ یہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ عشا کی نماز ہو چکی اور مسجد کے دروازے بھی بند ہو گئے ہیں۔ اس لئے یہ رائے قرار پائی کہ پہلے جائے قیام تجویز کرلی جائے مستورات اور سامان کو وہاں اُتار کر اطمینان سے مکان ہی پر عشار کی نماز جماعت سے ادا کرنی چاہیے، چنانچہ مولٰنا سید احمد صاحب فیض آبادی مہتمم مدرسہ شرعیہ مدینہ منورہ کو اطلاع دی گئی۔ مولانا تشریف لائے اور چند مکانات مجھے دکھلائے جو حرم نبوی سے متصل تھے میں نے ایک مکان کو جو باب النساء کے قریب اور مدرسہ شرعیہ سے ملا ہوا تھا پسند کیا۔ مولٰنا سید احمد صاحب ہنسکر فرمانے لگے کہ میں تو پہلے ہی سمجھتا تھا کہ تم اپنے مرشد کے مکان کو چھوڑنے والے نہیں ہو۔ یہ معلوم کرکے میری خوشی کی کچھ انتہا نہ رہی کہ جس مکان کو میں نے پسند کیا تھا وہی میرے مرشد حضرت سیدی مولائی مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ مہاجر مدنی شارح ابوداؤد کی قیامگاہ اور جس کمرہ کو میں نے اختیار کیا تھا وہی کمرہ مولانا کی آرامگاہ تھا۔ اُسی میں مولانا نے اپنی عمر کی آخری گھڑیاں تمام کی ہیں۔ چنانچہ فوراً مستورات کو وہاں اُتارا گیا۔ باہر کے کمروں میں مردوں نے قیام کیا اور وضو و غسل سے فراغت کرکے نماز عشا جماعت کے ساتھ ادا کی۔ اُسی وقت مولانا سید احمد صاحب کے گھر سے ہم سب لوگوں کیلئے کھانا آگیا۔ کھانے سے فراغت کرکے تھوڑی دیر کیلئے سو رہے اور صبح سے پہلے ہی دربار نبوی میں

بارگاہ رسالت میں حاضری

صلوٰۃ و سلام عرض کرنے کیلئے جاگ اُٹھے کیونکہ مسجد نبوی کے دروازے تہجد کے وقت کھل جاتے ہیں۔ جس وقت مسجد نبوی میں قدم رکھا ہے تو دل پر جو حالت و کیفیت گذری، وہ زبان قلم سے بیان نہیں ہو سکتی، تحیۃ المسجد ادا کرکے مواجہہ شریف میں صلوٰۃ و سلام عرض کرنے کیلئے کھڑا ہوا تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے احسانات و انعامات کو یاد کرکے بیاختہ آنکھوں سے آنسو بہنے اور زبان سے یہ کلمات جاری ہونے لگے :-

الصلوٰۃ والسلام علیک یانبی اللّٰہ الصلوٰۃ والسلام علیک یا صفوۃ اللّٰہ الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللّٰہ والحمد للّٰہ الذی ھدانابک من ضلالتنا۔ وانقذنا بک من الشرک والجھالۃ الصلوٰۃ والسلام علیک یا

یا حبیب الله الصلوٰة والسلام علیک یا خیر خلق الله الصلوٰة والسلام
علیک یا خاتم النبیین الصلوٰة والسلام علیک یا شفیع المذنبین الصلوٰة
والسلام علیک یا رحمة للعلمین الصلوٰة والسلام علیک یا قائد الغر المحجلین
یا سید المرسلین الصلوٰة والسلام علیک یا سید الخلائق اجمعین الصلوٰة والسلام
علیک وعلی آلک واهل بیتک الطیبین الطاهرین وعلی ازواجک
وذریتک واصحابک واولیائک اجمعین وعلی سائر الانبیاء والمرسلین
وعلی جمیع عباد الله الصالحین جزاک الله عنا یا رسول الله افضل
ما جزی به نبیا عن قومه ورسولا عن امته وصلی علیک کلما ذکرک
الذاکرون وغفل عن ذکرک الغافلون افضل واکمل ما صلی علی احد
من الخلق اجمعین اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شریک له واشهد
انک عبده ورسوله وخیرته من خلقه واشهد انک قد بلغت
الرسالة وادیت الامانة ونصحت الامة وکشفت الغمة وجاهدت
فی الله حق جهاده فالحمد لله الذی هدانا بک من الضلالة وانقذنا
بک من الشرک والجهالة ونور قلوبنا بک من انوار التوحید وشرفنا بک
وکرمنا ووعدنا المزید ونجانا بک من النار والخزی والعار ومن کل
بلاء الدنیا والآخرة یا رسول الله ان الله تعالیٰ یقول ولو انهم اذ ظلموا
انفسهم جاؤک فاستغفروا الله واستغفر لهم الرسول لوجدوا الله
توابا رحیما فجئتک یا رسول الله وقد ظلمت نفسی واستغفر الله و
اتوب الیه بین یدیک فاستغفر لی الله واسئله ان یغفر لی ذنبی
کله دقه وجله ویتوب علی ویرضی عنی رضاء لا یسخط بعده ابدا

یا خاتم الانبیاء جئتک قاصدا ارجو رضاک ومنتی بجوارک

الا یا رسول الله کنت رجاءنا وکنت بنا برا ولم تک جافیا

وکنت رحیما ھادیا ومعلما ... لیبک علیک الیوم من کان باکیا

فلوان رب الناس التی نبینا ... سعدنا ولکن امرہ کان ماضیا

۵

یا خیر من دفنت بالقاع اعظمہ ... فطاب من طیبہن القاع والاکم

نفسی الفداء لقبر انت ساکنہ ... فیہ العفاف وفیہ الجود والکرم

انت الحبیب الذی ترجی شفاعۃ ... عند الصراط اذا ما زلت اقدام

یا رسول اللہ اسألک الشفاعۃ یا رسول اللہ اسألک الشفاعۃ یا رسول اللہ اسألک الشفاعۃ لی ولاھلی واولادی وآبائی وامھاتی واخوانی واخواتی واعمامی وعماتی واخوالی وخالاتی ولعشیرتی وقرابتی ومشائخی واساتذتی ولاحبابی واصحابی ولکل من سألنی الدعاء لہ ولجمیع المؤمنین والمؤمنات والمسلمین والمسلمات اللھم آت سیدنا محمد الوسیلۃ والفضیلۃ وابعثہ مقاما محمودا الذی وعدتہ وارزقنا شفاعتہ وآتہ نہایۃ ما ینبغی ان یسألہ السائلون اللھم صل علی سیدنا محمد نبیک ورسولک النبی الامی وعلی آل سیدنا محمد وازواجہ وذریتہ کما صلیت علی سیدنا ابراھیم وعلی آل سیدنا ابراھیم فی العالمین انک حمید مجید =

صلوۃ وسلام کے وہ صیغے جو اُس وقت زبان سے نکلے تھے بیساختہ قلم سے نکل گئے میں نے قلم کو اس واسطے نہ روکا کہ زبان سے نکلا ہوا جلد فنا ہو جاتا ہے اور قلم کا لکھا مدت تک قائم رہتا ہے تو جبتک یہ الفاظ کاغذ میں لکھے رہیں گے انشاء اللہ مجھے برابر اس درود کا ثواب ملتا رہیگا"

پھر حضرات شیخین کی خدمت میں سلام عرض کیا اور اس سے فارغ ہو کر قبر شریف کے سرہانے قبلہ رُخ ہو کر اپنے لئے اور اپنے گھر والوں اور دوستوں اور رشتے والوں اور سب اگلوں پچھلوں کیلئے دل سے دعا کی پھر اسلام اور مسلمانوں کی عزت و ترقی د

صلاح و فلاح کیلئے بھی بہت دعا کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں روزانہ عرض کرتا رہا کہ امت مرحومہ بہت کچھ پستی اور ذلت کا مزا چکھ چکی ہے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ اب اُس کے دن پھیر دے اور اپنے دین کی محبت والفت دلوں میں ڈال کر مسلمانوں کو پھر وہی عروج عطا فرمایئے جو سلف صالحین کو عطا فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ سے اُمید قوی ہے کہ یہ دعائیں قبول ہو گئی ہیں کیونکہ اس مقدس دربار میں دعاؤں کو رد ہوتے ہوئے نہیں دیکھا

مواجہ شریفہ میں سپاہیوں کا تعین

مواجہ شریفہ میں حکومت کی طرف سے دو نجدی سپاہی ہر وقت تعینات رہتے ہیں تاکہ کوئی دیواروں اور جالیوں کو ہاتھ لگانے بوسہ دینے یا سجدہ وغیرہ کرنے کی جرأت نہ کرے کہ یہ سب امور شرعاً ممنوع ہیں۔ حکومت کے اس اقدام کو ضرور مستحسن کہا جائے گا مگر بعض دفعہ یہ سپاہی بہت سختی سے کام لیتے ہیں۔ ایک بار میرے سامنے ایک مصری عورت نے مقدس جالیوں کو ہاتھ لگا دیا تھا۔ نجدی سپاہی نے اس زور سے اُس کو دھکا دیا کہ چاروں خانے چت گری اور درد سے بیتاب ہو گئی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مواجہ میں اس قدر سختی سے کام لینا ہرگز بہتر نہیں ہے۔ جاہلوں کو نرمی سے سمجھا دینا چاہئے شور و شغب اور ضرب و دخاع سے اس مقام پر احتراز کرنا چاہئے! خصوصاً جبکہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ اور بعض علماء نے قبر شریف کو چھونے کی اجازت دی ہے۔ گو اُن کا قول ضعیف ہی ہو۔ البتہ سجدہ کرنے والوں کو سختی سے روک دینے کا مضائقہ نہیں۔ مگر سجدہ وہاں کون کرتا ہے

مدرسہ شرعیہ کا معائنہ

نماز اشراق سے فارغ ہو کر بدون کسی کی طلب کے خود ہی مدرسہ شرعیہ کا معائنہ کیا جس کے بانی اور مہتمم مولانا سید احمد صاحب فیض آبادی برادر بزرگ مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہم ہیں مدرسہ کی عمارت اور تعلیمی حالت بہت اچھی ہے۔ جس سے دل خوش ہوا ایک عمارت بہت عالیشان زیر تعمیر ہے اُسکے مکمل ہو جانیکے بعد مدرسہ میں بہت وسعت ہو جائیگی اور تنگئی مکان کی وجہ سے اس وقت جو دشواریاں پیش آتی ہیں ایک حد تک رفع ہو جائیں گی۔ اس مدرسہ کی

امداد کرنا سب مسلمانوں پر لازم ہی۔ تاکہ منبع علم وحکم کے ہمسایہ اس دولت سے محروم نرہیں۔ مدرسہ شرعیہ مدینہ منورہ اور مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ میں تعلیم پانے والے زیادہ تر مدینہ اور مکہ کے شہری بچے ہیں۔ جو اکثر مہاجرین کی اولاد ہیں، خالص عربی خاندانوں کے بچے بہت کم نظر آتے ہیں۔ اور یہ دونوں مدرسے تمام آبادی کیلئے کافی بھی نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ضرورت ہی کہ دیہات اور منازل مدینہ میں بھی مدارس قائم کئے جائیں جن میں بدوؤں کی اولاد کی تعلیم کا انتظام ہو جبتک بدوؤں کی اولاد تعلیم یافتہ نہ ہوگی اُس وقت تک عرب کو ترقی نہ ہوسکیگی۔

بدوؤنکو تعلیم یافتہ بنانے کی ضرورت

نیز مکہ مدینہ اور جدہ وطائف میں شبینہ مدارس قائم کرنے کی بھی ضرورت ہے جن میں مزدور پیشہ جماعت کے جوانوں اور بوڑھوں کو اسلامی تعلیم وتہذیب سے آراستہ کیا جائے۔ یہ منظر کس قدر افسوسناک ہے کہ جدہ وغیرہ میں حوض کے کنارہ پر ایک شخص وضو کر رہا ہے۔ اور اُس کے پاس ہی دوسرا حوض کی نالی میں پیشاب کر رہا ہے۔ جس قوم نے تمام دنیا کو علم وتمدن وتہذیب کا درس دیا تھا۔ آج وہ تہذیب وعلم سے اتنی دور ہو جائے تو رونے کی جگہ ہے یا نہیں؟ میں حکومت سعودیہ کو بہت زور کے ساتھ مشورہ دیتا ہوں کہ اہل عرب کے افلاس کو اگر وہ دور نہیں کر سکتی تو کم از کم اس جہل ہی کو دور کر دے۔ جس نے قوم عرب کو حضیض ذلت میں دھکیل دیا ہی۔

حکومت سعودیہ کو مشورہ

اہل خیر ہندوستانیونکو مشورہ | ہندوستان کے اہل خیر حضرات کو بھی میں یہی صلاح دوں گا اہل حجاز کی مالی امداد سے زیادہ ضروری اور مقدم اُنکی علمی امداد ہی جس کی آسان صورت یہ ہی کہ ہر گاؤں میں ایک مکتب قائم کر دیا جائے اور ابتداء میں ہندوستان سے عربی جاننے والے مخلص علماء بھیجے جائیں۔ یا مولانا سید احمد صاحب فیض آبادی کے ذریعہ سے ان مدارس کا انتظام کیا جائے ایک مکتب کا سالانہ خرچ بارہ سو روپے سے زائد نہو گا پچیس ہزار سالانہ سے بیس مدرسے دیہات میں قائم ہو سکتے ہیں مجھے یقین ہی کہ پانچ سال کے اندر اہل عرب کی ایسی اصلاح ہو جائیگی کہ مسلمانوں کا دل اُسے دیکھ کر خوش ہو گا اور انشاء اللہ تعالیٰ افلاس بھی دور ہو جائیگا کیونکہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم رکھنے والا مجبور کاہل نہیں رہ سکتا۔

عصر کے بعد جنت البقیع کی زیارت کی۔ یہاں پہلے بہت قبے بنے ہوئے تھے۔ اب کسی قبہ کا نام ونشان باقی نہیں البتہ اجلّہ صحابہ و اہلبیت کی قبروں کا امتیاز قائم اور سُرخ سنگریزے بچھا کر قبروں کا نشان اب بھی موجود رکھا گیا ہے۔ بنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و ازواج مطہرات اور امام حسن رضی اللہ عنہ اور اپنے جد امجد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مزارات پر سلام عرض کر کے فاتحہ پڑھ کر حضرت مرشدی سیدی مولانا خلیل احمد صاحب مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہ کے مزار پر حاضر ہوا مولانا کی قبر کا نشان ایک سفید پتھر سے بعض احباب نے قائم کر لیا ہے۔ ورنہ قبر زمین کے برابر ہی ہے۔ اور پاس ہی حضرت کی اہلیہ مرحومہ بھی مدفون ہیں۔ جنت البقیع میں بھی حکومت کی طرف سے دو تین سپاہی تعینات ہیں جو زائرین کو تقبیل و سجدہ وغیرہ بدعات سے

حکومت سعودیہ کے سپاہی

روکتے رہتے ہیں۔ یہ سپاہی کسی سے کچھ سوال نہیں کرتے۔ لیکن اگر کوئی کچھ دینا چاہے تو لیتے ہیں وہ بھی اس وجہ سے کہ سُنا گیا کہ دس بارہ مہینے کی تنخواہیں حکومت کی طرف سے اُن کو نہیں ملیں۔ کیونکہ جنگ نجد و یمن کی وجہ سے حکومت سرحدی استحکامات میں مشغول ہے فوجی رسد اور اسلحہ کی فراہمی میں بہت روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے!! اس جگہ نجدی قوم کی اس وفاداری کی داد دینا چاہیئے کہ باوجود مدت سے تنخواہ نہ ملنے کے ہر سپاہی اپنے کام پر موجود اور فرائض منصبی میں مستعد تھا۔ نجدی قوم اطاعت سلطان کو ایسا ہی سمجھتی ہے جیسا دیگر فرائض شرعیہ کو۔ نجدی قوم کا اتحاد و اتفاق بھی اہلِ حجاز کو مسلم ہے اور جس قوم میں باہم اتحاد و اتفاق اور بادشاہ کے ساتھ وفاداری و اطاعت کا

مادہ ہوگا وہ علی رغم الحسود ترقی اور کامیابی حاصل کرکے رہیگی۔ اللّٰھم ایدہ وایدہ عساکرہ وکن اللّٰھم حامیہ وحافظہ وناصرہ۔

مسجد نبوی میں ہر نماز کے وقت آجکل ایک ہی جماعت ہوتی ہے پہلے کی طرح متعدد جماعتیں نہیں۔ امام صاحب مدینہ منورہ کے رہنے والے ایک بزرگ عالم ہیں جو مذہباً حنبلی ہیں اور تمام مذاہب کا پورا احترام کرتے ہیں۔ اُن کے چہرہ پر خاص انوار نظر آتے ہیں بہت کم گو اور پابند معمولات ہیں۔

حرم نبوی کا ایک واقعہ

ہمارے مدینہ پہنچنے سے دو دن پہلے یہ قصہ پیش آیا کہ ایک ہندوستانی غیر مقلد صاحب نے جو حکومت کی اجازت سے مسجد نبوی میں بزبان اردو وعظ کہا کرتے ہیں یہ مسئلہ بیان کیا کہ مدینہ آنے والوں کو صرف زیارت مسجد کی نیت کرنا چاہئے۔ زیارت رسول یا زیارت قبر رسول کی نیت نہ کرنا چاہئے۔ اس مسئلہ کی تقریر میں کوئی لفظ بارگاہ رسالت کی شان کے خلاف اُن کی زبان سے نکل گیا۔ تو سرحدیوں افغانیوں۔ ہندوستانیوں نے ملکر ان کو خوب پیٹا۔ نجدی سپاہیوں نے اردو وعظ تو سمجھا نہیں۔ صرف یہ دیکھ لیا کہ واعظ کو سامعین پیٹ رہے ہیں۔ اُنھوں نے بیتوں سے لوگوں کو مار مار کر ہٹایا۔ واعظ صاحب کو تو بچا کر عدالت میں لیگئے۔ اور چند آدمیوں کو گرفتار کرکے حوالات بھیجدیا حکومت نے چار پانچ آدمیوں کو سزائے قید کی اور سپاہیوں کو دھمکایا کہ تم نے مسجد کے اندر کسی پر ہاتھ کیوں اُٹھایا۔ تم کو لازم تھا کہ ان سب کو مسجد سے باہر نکال کر لاتے جو مجرم ہوتا اُس کو سزا دیتے۔ یہ سب کچھ ہوا مگر واعظ صاحب سے کچھ باز پرس نہوئی۔ وہ اچھے خاصے پھر اگلے دن وعظ کہنے لگے۔

حکومت سعودیہ کو مشورہ

پھر اس مقام پر حکومت نجد کو مطلع کر دینا چاہتا ہوں کہ بعض مسلمانان ہندوستان کو اُسکی طرف سے بدگمانی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اُس نے اپنے یہاں ہندوستانی غیر مقلدین کو جو اپنے آپ کو اہل حدیث کہتے ہیں زیادہ دخل دے رکھا ہے۔ حکومت نجد ان کو اپنا

جیسا اہل حدیث سمجھتی ہی مگر واقعہ اس کے خلاف ہے"۔ ہندوستان کے اکثر غیر مقلدین جنھوں نے اپنا امام المحدیث رکھ لیا ہے۔ آئمہ اربعہ کی ویسی عظمت نہیں کرتے جیسی حکومت نجد کرتی ہے۔ اور امام مالک و امام شافعی و امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی شان اقدس ہیں۔ بالخصوص امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں تو یہ لوگ اس طرح زبان طعن دراز کرتے ہیں کہ حکومت نجد و علمار نجد اس کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ تقلید آئمہ کو شرک قرار دیتے ہیں اور حنفیوں کی نماز کو اس لئے کہ وہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتے بالکل باطل اور کالعدم سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حکومت نجد اور علمار نجد اور امام احمد بن حنبلؒ ایسا نہیں سمجھتے۔ وہ تقلید کو لازم اور کم از کم مستحسن سمجھتے اور اپنے کو امام احمد بن حنبل کا مقلد کہتے ہیں۔ ہندوستانی غیر مقلدین تقلید کا جوا گردن سے اُتار کر ایسے آزاد مجتہد بنے ہیں کہ اُن سے ایک بہت بڑے عالم نے مسلمانوں کیلئے ۱۸ عورتوں سے نکاح جائز کر دیا اور ایک مجتہد نے کافر کے پیچھے نماز کیلئے صحیح ہونیکا فتویٰ دیدیا ان لوگوں کی اسی آزادی اور بیباکی اور گستاخی نے ہندوستان کے اندر عام مسلمانوں کی نظروں میں ان کو بہت خطرناک بنا دیا ہے۔ اور اسی وجہ سے مسلمانوں کی اکثریت ان کو وہابی کے لقب سے یاد کرتی اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہی" اب جب مسلمانوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نجد کے دربار میں ان لوگوں کا بہت زیادہ رسوخ ہے تو وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ حکومت نجد اور اُس کی رعایا اور اُس کے علمار بھی ایسے ہی وہابی ہیں جیسے یہ ہندوستانی وہابی۔ پس اگر حکومت نجد عام مسلمانوں کے دلوں سے اُس نفرت کو نکالنا چاہتی ہے جس کا اُسے خود بھی احساس ہے تو ان لوگوں کو اپنے دربار اور اپنی ادارات میں اسقدر رسوخ نہ دے جس سے لوگوں کو یہ خیال پیدا ہونے لگے کہ ہندوستانی غیر مقلدین اور حکومت نجد باہم شیر و شکر ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سارے غیر مقلد گستاخ اور بے باک ہی ہوتے ہیں۔ نہیں نہیں ان میں بعضے اہل انصاف اور باادب بھی ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اکثریت ایسے ہی افراد کی ہے۔ جیسے وہ حضرت واعظ صاحب تھے جنھوں نے حرم نبوی میں بیٹھ کر مسئلہ شد رحال پر تقریر کی اور ایسے عنوان سے تقریر کی جس سے

سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص شان مترشح ہوتی تھی۔

حکومت سعودیہ کو مشورہ

حکومت نجدیہ کو میں یہ مشورہ بھی دونگا کہ وہ مسئلہ توسل اور مسئلہ شد رحال پر تقریر عام کرنے کی بالکل ممانعت کردے کیونکہ یہ مسائل ایسے ہیں جن میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے زمانہ سے علماء میں اختلاف چلا آرہا ہے اور حقیقت میں یہ صرف نزاع لفظی ہے جس توسل کو شیخ الاسلام حرام فرماتے ہیں کہ وسیلہ کو کارفرما اور با اختیار سمجھا جائے اُس کو کوئی جائز نہیں کہتا اور جو توسل علماء اہل سنت کے نزدیک جائز ہے یعنی کسی نبی یا ولی پر اللہ تعالیٰ کی جو نظر عنایت و محبت ہے اُس کو وسیلہ قرار دینا اسکو شیخ الاسلام کسی دلیل سے حرام نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس میں حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نظر عنایت و محبت کو وسیلہ بنایا گیا ہے نہ غیر خدا کو پس جیسا دوسرے مختلف فیہ مسائل میں حکومت جملہ مذاہب کو برحق سمجھتی ہے اور کسی کے مذہب کی تنقیص نہیں کرتی اسی طرح مسئلہ شد رحال اور مسئلہ توسل کو بھی سمجھنا چاہئے اور واعظین کو ان مسائل پر تقریر کرنے سے بالکل روک دینا چاہئے کہ اس کا نتیجہ بجز فتنہ و فساد اور حکومت نجدیہ کی طرف سے بدگمانی پھیلنے کے اور کچھ نہیں۔

جلالۃ الملک کی تواضع اور حق شناسی

مدینہ منورہ میں میرے ایک دوست مولوی محمد موسیٰ صاحب پانچ چھ سال سے مقیم ہیں وہ کہتے تھے کہ جلالۃ الملک سلطان ابن سعود خلد اللہ ملکہ سے جب میں پہلی بار ملا تو سلطان نے مجھ سے فرمایا کہ اگر میرے اعمال میں کوئی بات خلاف سنت آپکو معلوم ہوتی ہو تو بے تکلف مطلع فرمائیے۔ میں نے کہا کہ خلاف سنت تو آپ بہت کم کرتے ہیں ایک ادنیٰ بات تو یہی ہے کہ آپ موٹر پر سوار ہو کر یوں یوں کرتے ہوئے روضۂ اقدس نبوی پر حاضر ہوتے ہیں کیا ادب کا یہی طریقہ ہے؟ وہ کہتے تھے کہ سلطان نے اس بات کو سنکر فرمایا کہ مولانا درحقیقت تم لوگ سچے موحد ہو اور ہمارے علماء تو نام کے موحد ہیں کسی نے آجتک مجھے اس بدعت پر متنبہ نہیں کیا۔ آج سے انشاءاللہ میں ایسا نہیں کروں گا۔ یہ واقعہ اگر صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو اس سے سلطان کی انصاف پسندی تواضع اور سلامت طبع کا جس درجہ ظہور ہو رہا ہے اسکے بیان کی حاجت نہیں مجھے امید ہے کہ اسی انصاف کیساتھ میری معروضات پر بھی توجہ کی جائیگی۔

مسجد نبوی میں درس بخاری شریف

مسجد نبوی میں شیخ عبدالرؤف آفندی مصری بخاری شریف کا درس دیتے ہیں اور بہت فصیح عربی بولتے اور اچھا درس دیتے ہیں ایک دوبار مجھے اُن کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا میں اُن کے لطف کو ابتک محسوس کرتا ہوں اللہ تعالیٰ اُنکے علم وعمل میں ترقی عطا فرمائے۔

افلاس کا جانکاہ نظارہ

مسجد نبوی میں یہ نظارہ بہت جانکاہ تھا کہ بھیک مانگنے والے بکثرت نظر آتے تھے جو بعض دفعہ لوگوں کی تلاوت قرآن اور نمازیں بھی حارج ہوتے تھے، حکومت حجاز و نجد کو اس طرف بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہے جبتک اہل مدینہ واہل مکہ کی تکالیف کا ازالہ نہوگا حکومت کو راحت و اطمینان نصیب نہوگا اور سب سے مقدم جبریہ تعلیم کا اجراء ہے تاکہ اہل حرمین قرآن وحدیث کی دولت سے مالا مال ہوکر دنیا سے مستغنی ہوجائیں۔

اس مرتبہ ۲۴ر ذی قعدہ کو ہمارا قافلہ مدینہ منورہ پہنچا تھا اس لئے حجاج کا ہجوم زیادہ نہ تھا کیونکہ قرب حج کی وجہ سے زیادہ تر مکہ معظمہ جاچکے تھے اس لئے محراب نبوی اور مصلےٰ نبوی میں نوافل پڑھنے کا بکثرت اتفاق ہوا میں اس جگہ کے انوار کو کن لفظوں میں بیان کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

مصلےٰ نبوی کے انوار و برکات

مگر غالباً اتنی بات تو سب کی سمجھ میں آجائے گی کہ اُن مقامات پر جتنی نمازیں پڑھی گئیں وساوس سے بالکل پاک تھیں اور میں محسوس کرتا تھا کہ قصد وارادہ کے ساتھ بھی اس مقام پر وسوسہ لانے کی گنجائش نہیں۔ اللہ اللہ! ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد بھی جس نور مجسم کی محراب ومصلے میں اس قدر انوار ہیں کہ وہاں غیر اللہ کا وسوسہ بھی دل میں نہیں آسکتا تو خود اُس نور مجسم کی صحبت میں بیٹھنے والوں کا کیا حال ہوا ہوگا اور خود حضور کے قلب انور و اطہر کی کیا حالت ہوگی ؎

ساقی ترا مستی سے کیا حال ہوا ہوگا
جب تونے یہ مے شاہا شیشہ میں بھری ہوگی

مسجد قبا

یہ دن جمعہ کا تھا۔ اگلے دن سنیچر کو مسجد قبا کی زیارۃ کے لئے مع رفقاء کے گیا۔ کیونکہ سیدنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سنیچر کے دن ہی قبا تشریف لیجایا کرتے تھے اور یہ وہ متبرک مقام ہے۔ جہاں ہجرت کے موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے[1] چودہ دن یا چار دن قیام فرمایا تھا اور اپنے دست مبارک سے ایک مسجد کی بنیاد ڈالی تھی جو اسلام میں سب سے پہلی مسجد ہے جس کی کرامت و بزرگی کو اللہ تعالےٰ نے قرآن شریف میں بھی بیان فرمایا ہے۔ لمسجد اسس علی التقویٰ من اول یوم احق ان تقوم فیہ ، فیہ رجال یحبون ان یتطھروا ، واللہ یحب المطھرین ۞

حضرت سیدنا حمزہ کی زیارت

اس سے پہلے جمعرات کے دن حضرت سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ اور شہداء احد کی زیارت کو جانا ہوا تھا۔ ان دونوں مقامات نے ابتدائے عروج اسلام کی تصویر نگاہوں کے سامنے کردی۔ حضرت سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کے مزار پر قبہ تو نہیں ہے مگر قبر ہنوز پختہ ہے جو نہ معلوم حکومت سعودیہ کے ہاتھوں سے کیونکر بچ گئی۔ ہم لوگ جمعہ کے روز عشاء کے بعد مدینہ منورہ میں داخل ہوئے تھے۔ سنیچر کو پورے آٹھ دن ہوگئے اور اتوار کے دن مکہ معظمہ کی طرف روانگی طے پائی۔

مدینے سے مکہ کو روانگی

موٹر والوں نے خبر دی کہ موٹر صبح ہی کو روانہ ہو جائے گا۔ اس لئے رات ہی سے سامان باندھ دیا گیا۔ صبح کی نماز کے بعد دربار نبویہ میں رخصتی سلام عرض کرنے کیلئے حاضر ہوئے اُسوقت مسلمانوں کی جو کیفیت ہوتی ہے۔ اُس کو دیکھنے والا ہی سمجھ سکتا ہے۔ یہ آٹھ دن ایسے گذر گئے۔ کہ معلوم بھی نہ ہوئے۔ اب رخصتی سلام کا وقت آیا تو حسرت بھرے دل سے سلام عرض کیا اور دوبارہ توفیق حاضری کے لئے بہت بہت دعائیں کیں اور جو کچھ مانگنا تھا مانگ لیا

[1] اگرچہ اس وقت مدینہ میں اسلام پھیل چکا تھا اور قبیلہ اوس و خزرج کے اکثر افراد حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے مگر پھر بھی کچھ لوگ کفر و شرک پر قائم تھے اور یہودی قبائل کی بھی مدینہ میں خاصی تعداد تھی اس لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دفعتہً مدینہ میں داخل ہونا پسند نہ فرمایا کہ مبادا مشرکین اور یہود کچھ فساد برپا کریں بلکہ مدینے سے متصل قبا میں جہاں مہاجرین کی زیادہ تعداد میں تھے چند روز قیام فرمایا تاکہ مشرکین و یہود مدینے کی حالت کا پورا موازنہ ہو جائے۔ چنانچہ جب اطمینان ہو گیا کہ اوس و خزرج کی طاقت کافی ہے اور گروہ مخالف کی طاقت کمزور ہے اس وقت حضور نے مدینے میں داخل ہونے کی تیاری کی۔ حضور کی ہر ہر بات میں حکمت اور تدبر و دانائی کا نمایاں پہلو ہوتا ہے جس کو سمجھنے کے لئے عقل سلیم کی ضرورت ہے۔ ۱۲ ۔ ط

الحمد للہ کہ اس وقت بھی احباب واصحاب کے ساتھ تمام مسلمانوں کے لئے فلاح دارین اور شفاعت کی دعائیں کی گئیں اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں" پھر نودعك یا رسول اللہ غیر مودع ولا عن راضین بفلا قلث کہتے ہوئے چشم گریاں وسینہ بریاں کیساتھ مدینے کی گلیوں کو پیادہ پا طے کرتے ہوئے نو ۹ بجے باب العنبریہ پہنچے۔ جہاں موٹر ہم سے پہلے پہنچ چکا تھا۔ یہاں کئی گھنٹہ ٹھیرنا پڑا۔ کیونکہ سب موٹروں کو ساتھ روانہ ہونا تھا۔ یہ چند گھنٹہ کا قیام اس لئے گراں ہوا کہ مدینے سے نکلنے کو کسی کا جی ہی نہ چاہتا تھا۔ قبہ خضرا سامنے تھا۔ جس کو دیکھ دیکھکر دل اُمڈا چلا آتا تھا۔ اور یہ تصور سوہان روح ہورہا تھا کہ تھوڑی دیر میں یہ بھی نظروں سے اوجھل ہوجاویگا۔ گھڑی میں بارہ بجے اور موٹر یکے بعد دیگرے روانہ ہونے لگے۔ میں اس وقت بیر استقیا کی زیارت کررہا تھا۔ جو باب العنبریہ کے متصل ہی مدینے سے باہر ایک کنواں ہے جس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اکثر تشریف لایا کرتے اور اس کا پانی پیا کرتے تھے۔ جب موٹر روانہ ہونے لگے تو میں بھی سوار ہوگیا اور ساڑھے بارہ بجے کے قریب مدینے سے باہر سنگستانی میدان میں موٹر تیزی کیساتھ چلنے لگا۔ اس وقت بے ساختہ زبان پر یہ اشعار آگئے۔

لوکنتِ ساعۃ بیننا ما بیننا	ورأیت کیف نکرر التودیعا
لعلمتِ ان من الدموع حدیثا	وعلمت ان من الحدیث دموعا

ھ

وکنت اظن ان القرب یطفی ۔ لہیب الشوق فازداد اللہیب

پندرہ بیس منٹ کے بعد مدینے کے درودیوار آنکھوں سے اوجھل ہوگئے اور صرف مدینے کے پہاڑ اور وادی عقیق کا میدان دل کی تسلی کے لئے باقی رہ گیا

ذوالحلیفہ پر احرام باندھنا

گھنٹہ بھر میں منزل ابیار علی پر پہنچے جس کا قدیم نام ذوالحلیفہ ہے موٹر قہوہ خانہ پر ٹھیرا۔ یہاں سے وہ جگہ ذرا فاصلہ پر تھی جہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے احرام باندھا تھا اور یادگار کے طور پر اس جگہ مسجد بنادی گئی ہے۔ اکثر حجاج کو تو

اس کی خبر ہی نہ تھی اور جن کو خبر تھی وہ بھی فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے سستی کر گئے اس لئے تقریباً تمام لوگوں نے قہوہ خانہ ہی میں ظہر کی نماز پڑھکر احرام باندھ لیا[1] مگر اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے رفقاء نے جن میں مستورات بھی تھیں سستی سے کام نہیں لیا بلکہ سب کے سب اس مسجد میں پہنچے جہاں سے حضور نے حجۃ الوداع میں احرام باندھا تھا۔ مسجد کے قریب ہی گیہوں اور جو کے کھیت تھے جن میں پانی دینے کیلئے کنواں چل رہا تھا۔ سب نے پانی کی گول پر وضو کیا۔ شیریں پانی تھا۔ پیاس لگ رہی تھی۔ وضو کرکے پانی خوب پیا۔ پھر ظہر کی نماز جماعت سے پڑھ کر احرام قرآن کی نیت کی گئی اور لبیک بحجۃ و عمرۃ لبیک اللھم لبیک لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد والنعمۃ لک والملک لا شریک لک بلند آواز سے کہکر محرم بن گئے میرے ہمراہی سب کے سب قارن ہی تھے اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم شامل حال رہا کہ اس سفر میں سنتوں پر عمل ہو گیا۔ اب راستہ بھر لبیک کا ورد تھا اور حاضری حرم کا اشتیاق لبیک پڑھتے ہی اس بے چینی میں سکون کی شان پیدا ہونے لگی ہے جو مفارقت مدینہ سے ہوئی تھی۔

موٹر کمپنی کا وکیل

آج ہمارے موٹر میں موٹر کمپنی کا وکیل بھی سوار تھا۔ اس لئے رفتار بہت تیز تھی۔ عصر اور مغرب کی نمازیں راستہ میں ادا ہوئیں۔ خیال تھا کہ نماز عشا منزل پر پڑھکر سو رہیں گے مگر وکیل صاحب نے نہ مانا۔ انہوں نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ منزل مستورہ اور رابغ کا درمیانی حصہ جو بہت زیادہ ریگستانی ہے رات ہی میں طے کر دیا جائے تاکہ دن میں تمازت آفتاب سے تپتے ہوئے ریگستان میں سفر کرنے کی زحمت نہ ہو۔ رائے تو معقول تھی مگر موٹر میں بیٹھے بیٹھے ٹانگیں درد کرنے لگیں اور جی گھبرا گیا تھا۔

[1] اس مقام پر اگر حکومت سعودیہ کے انتظام کی داد نہ دیجائے تو سخت بے انصافی ہوگی کیونکہ پہلے زمانوں میں قافلہ سے علیحدہ ہونا سخت خطرہ کا سبب تھا مگر اس وقت ہمکو قافلہ سے الگ کرکے ذوالحلیفہ تک جانے میں کسی خطرہ کا وسوسہ بھی نہیں آیا۔ نہ یہ وہم ہوا کہ موٹر پر ہمارا سامان ہے اور ساتھیوں میں سے وہاں کوئی بھی نہیں سامان کا کیا حشر ہوگا۔ اس قسم کے خطرات کا بالکل انسداد ہو گیا ہے کسی کی مجال نہیں کہ حاجی کو یا اس کے سامان کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ ۱۲ ظ

اس لئے میں نے زبردستی آدھ گھنٹہ کیلئے مستورہ میں موٹر ٹھیرایا اور اطمینان سے نماز عشا پڑھی۔ چائے پی۔ پھر سوار ہوئے۔ عشا کے ایک گھنٹہ بعد رابغ پہنچے اور پہنچتے ہی قہوہ خانہ کی چارپائیوں پر قبضہ کرکے بستر جما دیے۔ بستر پر سر رکھنا تھا کہ ایسے سوئے جیسے سوداگر گھوڑے بیچ کر سوتا ہے مگر حکومت سعودیہ کے انتظام کی داد دینا چاہیے کہ حجاج تو ایسی غفلت کی نیند میں مست تھے اور سامان سے لدے ہوئے موٹر قہوہ خانے کے باہر کھڑے تھے۔ مگر کیا مجال کہ ایک چیز کو بھی کوئی ہاتھ لگا لے۔

امید نہ تھی کہ آج وقت پر آنکھ کھلے گی۔ مگر آفرین ہو بعض شب بیدار رفقاء کی ہمت پر کہ اخیر ہی شب میں اُٹھ ہی بیٹھے ان کی دیکھا دیکھی میں بھی اٹھا تہجد سے فارغ ہو کر صبح کی نماز پڑھی۔ پھر اس خیال سے کہ شاید موٹر جلدی ہی روانہ ہو جائیگا ناشتہ کی فکر ہوئی کچھ سامان ساتھ تھا اُسے قہوہ خانہ کی دوکان پر گرم کیا۔ روٹی گرم گرم خریدی ناشتہ کرکے چارپائی بستر پر لیٹے اور موٹر کی روانگی کا انتظار کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ ابھی روانگی میں دیر ہے۔ کیونکہ راستہ میں ایک موٹر خراب ہو گیا ہے۔

رابغ میں ۱۵ گھنٹہ قیام

کمپنی کا وکیل جو ہمارے موٹر میں ٹھہرا ہوا تھا ہندس (مستری) کو ساتھ لیکر اُسے درست کرانے گیا ہے۔ جبتک وہ واپس نہ آئیگا یہ موٹر بھی نہ چل سکیگا۔ میں نے پوچھا کہ آخر تخمیناً کتنی دیر کا کام ہے کہا گیا یہی ایک دو گھنٹہ کا۔ مگر وہ ایک دو گھنٹہ اس بلا کے تھے کہ آفتاب نکلا بھی بلند بھی ہوا سر پر بھی آ گیا۔ ظہر کی نماز بھی پڑھ لی۔ عصر کا وقت بھی قریب آ گیا۔ دو گھنٹے پورے نہ ہوئے

رئیس محکمہ سے گفتگو

یہ صورت حال دیکھ کر مجھے تکلیف محسوس ہوئی تو سیدھا رئیس محکمۂ تفتیش کے دفتر میں پہنچا جو قہوہ خانہ کے قریب ہی ایک معمولی سے مکان میں تھا۔ مگر دروازہ پر سائن بورڈ لگا ہوا اور ایک سنتری دونالہ بندوق لیے ہوئے کھڑا تھا۔ میں نے اُس سے کہا کہ مجھے رئیس محکمہ سے ملنا ہے۔ اُس نے اطلاع کی تو بجائے بلانے کے رئیس صاحب خود ہی باہر تشریف لائے اور سلام و معانقہ کے بعد عربی میں اس طرح گفتگو ہونے لگی۔

میں - جناب والا میں آپ سے اس تکلیف کی شکایت کرنے آیا ہوں کہ ہمارا موٹر جس میں کمپنی کا وکیل بھی سوار ہے رات عشا کے بعد یہاں پہنچ گیا تھا اور ہمکو امید تھی کہ آج عصر کے وقت تک مکہ معظمہ پہنچ جائیں گے۔ مگر افسوس کہ رابغ میں عصر کا وقت ہو گیا۔ اور موٹر ڈرائیور چلنے کا نام نہیں لیتا۔ حج کا وقت قریب ہے۔ آج ۳ ذی الحجہ ہے پھر بھی اس قدر تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔

رئیس - غالباً آپ اُس موٹر کے سوار ہیں جس میں بہت سے عجمی لوگ ہیں۔

میں - جناب ہم عجمی نہیں۔ میں عثمانی ہوں۔ میرے بعض رفقا علوی ہیں بعضے صدیقی ہیں۔ ہاں یہ خطا ضرور ہے کہ ہم ہندوستان میں کسی وقت جا بسے تھے

رئیس - ہنس کر معاف کیجئے گا میری مراد عجمی سے عجمی النسل نہ تھی بلکہ عجمی السکونت تھی۔

میں - تو جناب کو عجمی کی جگہ ہندی فرمانا چاہئے تھا۔ بیشک میں اُسی موٹر کا ایک سوار ہوں جس میں بہت سے ہندی ہیں۔

رئیس - غالباً آپ کو معلوم ہو گا کہ ایک موٹر راستہ میں خراب ہو گیا ہے اور کمپنی کے وکیل کا فرض ہے کہ اُس کی سواریوں کو اپنے ساتھ لیجائے۔ اس لئے وہ موٹر درست کرنے اور اُس کی سواریوں کو ساتھ لانے گیا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ آپ سے زیادہ تکلیف میں ہیں۔

میں - بیشک وکیل کا فرض ہے کہ حجاج کی راحت رسانی کی فکر کرے مگر اس کی دوسری صورت بھی ہو سکتی تھی۔ جس میں ہمکو بھی تکلیف کا سامنا نہ ہوتا۔

رئیس - وہ صورت کیا تھی۔

میں - وکیل صاحب کسی دوسری موٹر کار میں اُن کے ساتھ آجاتے اور ہماری موٹر کو اپنی آمد تک محبوس نہ کرتے۔

رئیس غالباً وکیل کو یہ خبر نہ تھی کہ اُس لاری کی مرمت میں اتنی دیر ہو جائیگی کہ آپ کو یہاں عصر کا وقت ہو جائے گا۔ بہت اچھا میں ابھی حکم دیتا ہوں کہ آپ کی موٹر روانہ ہو جائے۔ وکیل کسی دوسری موٹر میں آ جائیگا۔

اس گفتگو کے بعد رئیس صاحب کا شکریہ ادا کر کے میں دفتر سے باہر نکلا اور عصر کی

نماز کا بندوبست کرنے لگا تو ڈرائیور دوڑتا ہوا آیا کہ جلد سوار ہو جایئے اب میں دیر نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا کہ عصر کا وقت آگیا ہے میں دو رکعتیں پڑھ کر سوار ہونگا۔ ڈرائیور نے کہا کہ آپ یہاں سے باہر نکل کر بھی عصر پڑھ سکتے ہیں۔ اب تاخیر کرنے میں مجھے خطرہ ہے میں سمجھ گیا کہ رئیس نے میرے پیچھے پیچھے ہی حکم بھیجدیا ہے۔ اس لئے ڈرائیور کے حواس بجا نہیں رہے۔ مگر میں نے سہولت اسی میں دیکھی کہ عصر کی نماز پڑھکر سوار ہوں۔ اس لئے اُس کے تقاضے کی پروا نہ کر کے جماعت کے ساتھ عصر کی نماز ادا کی مستورات نے بھی اپنے کمرہ میں نماز پڑھی اور سوار ہو گئے۔ اُس وقت ڈرائیور نے مجھے اپنے پاس جگہ دی جہاں کمپنی کا وکیل پہلے بیٹھا تھا۔ اس واقعہ سے غالباً ناظرین نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ حکومت سعودیہ نے حجاج کی راحت کا کیسا عمدہ انتظام کیا ہے اور اُن کی ذرا ذراسی شکایت پر سعودی حکام کس قدر توجہ کرتے ہیں۔ غرض مغرب کے وقت منزل طوال میں پہنچے اور عشاء کے وقت دہبان میں آئے۔ اس وقت رفقا میں اختلاف رائے ہوا کہ عشا کی نماز پڑھ کر اسی جگہ آرام کریں یا جدہ پہنچکر رات گذاریں کثرت رائے اس طرف ہوئی کہ جدہ پہنچے پر اگر دروازہ شہر کھلا ہوا نہوا تو بہت تکلیف ہوگی۔ اس لئے صبح کی نماز پڑھکر یہاں سے روانہ ہونا چاہئے میں ابتدا میں بتلانا بھول گیا کہ مدینے اور منازل مدینے میں سردی کے موسم میں سخت سردی ہوتی ہے چنانچہ مدینہ میں سخت سردی کا سامنا ہوا مگر بحمداللہ سامان کافی تھا۔ اس لئے کوئی تکلیف نہیں ہوئی البتہ جن حضرات نے مدینہ کو مکہ پر قیاس کر کے گرم ملک سمجھ لیا اور سردی کا سامان کافی نہ لیا تھا اُن کو تکالیف کا سامنا ہوا۔ مدینہ سے واپسی پر راستہ میں بھی بہت سردی ملی۔ چنانچہ دہبان میں تو ایسی سردی تھی کہ کمبل وغیرہ سے بھی گرمی پیدا نہوئی۔

جدہ میں داخلہ اور علمار کرام سے ملاقات

صبح کی نماز پڑھ کر معمولی ناشتہ کیا چاے پی اور جدہ کو روانہ ہو گئے۔ دو گھنٹے کے بعد شہر آگیا۔ ہم اپنے وکیل عبدالکریم بخش کے مکان پر پہنچے تاکہ مدینے کے تبرکات اُس کے گھر پر چھوڑ دیں اور ہلکے ہو کر مکہ معظمہ چلے جائیں۔ میں وکیل کے مکان پر پہنچا ہی تھا کہ اُس کے ملازم نے خبر دی کہ

ہندوستان کے بعض علماء تمہاری تلاش میں ہیں۔ میں نے اُن کے نام دریافت کئے تو کہا ایک تو مولانا مرغوب احمد صاحب ہیں جو رنگون سے آئے ہیں ایک مولوی عتیق الرحمٰن صاحب دیوبندی ہیں۔ ایک مولوی عرفان صاحب ہیں۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اوّل مولانا مرغوب احمد صاحب سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیئے پھر مولوی عتیق الرحمٰن صاحب بھی تشریف لے آئے۔ سب حضرات سے ملکر جی خوش ہوا اور معلوم ہوا کہ آپ کل ہی رضوانی جہاز سے جدہ اُترے ہیں اور آج ہی مکہ معظمہ جانیوالے ہیں میں نے کہا میں بھی ایک دو گھنٹہ کیلئے جدہ میں ٹھیرا ہوں۔ ابھی جانیوالا ہوں۔ پھر ہم سب اسباب کی درستی میں لگے۔ جو سامان یہاں چھوڑنا تھا چھوڑ دیا۔ باقی کو موٹر میں رکھنے کے لئے الگ کر لیا۔ اس سے فراغت ہو کر کھانے کا انتظام کیا۔ مستورات تو موٹر سے اُترتے ہی وکیل کے مکان میں پہنچکر آرام کر رہی تھیں ہمنے اُن کو بازار سے کھانا لا کر دیا اور خود بھی کھایا۔

جدہ سے مکہ کو روانگی

اتنے ہی میں موٹر تیار ہو کر آگیا۔ اور ۱۲ بجے سوار ہو کر جدہ سے روانہ ہو گئے۔ آج منگل کا دن تھا اور ذی الحجہ کی چار تاریخ تھی۔ جدہ سے ایک منزل تک راستہ بہت اچھا ہے جو موٹر کیلئے موزوں ہے ظہر کی نماز منزل بحیرہ پر پڑھی۔ یہاں سے چار پانچ میل تک راستہ بہت ریگستانی تھا جہاں موٹر کا چلنا اس مقدس زمین کی کرامت ہی سمجھنا چاہئے۔ مولانا مرغوب احمد صاحب اور اُن کے رفقاء کی لاری ہم سے پہلے روانہ ہو چکی تھی۔ مگر راستہ میں فیل ہو کر پیچھے ہو گئی۔ ہماری موٹر کو بھی ریتیلے میدان میں دقت کا سامنا ہوا۔ مگر فیل نہیں ہوئی۔ ریگستانی میدان ختم ہوتے ہی اعلام یعنی حد حرم کے نشان نظر آنے لگے۔ جن کو دیکھ کر دل کی جو کچھ کیفیت ہوئی زبان قلم اُس کے بیان سے عاجز ہے۔ دل میں یہ خیالات موجزن تھے۔ کہ اب ہم اللہ کی پناہ میں یعنی حرم میں داخل ہونے والے ہیں۔ جس کی بابت قرآن میں فرمایا گیا ہے و من دخله کان امنا۔ بیساختہ زبان سے لبیک اللھم لبیک نکلا اور دل کہیں سے کہیں پہنچ گیا موٹر ریتیلے میدان سے نکل کر تیزی کے ساتھ ہوا سے باتیں کر رہا تھا کہ اعلام حرم پر پہنچے

ہی ڈرائیور نے بلند آواز سے کہا ھذہ اعلام الحرم اور ہم نے اس کے جواب میں لبیک اللّٰھم لبیک کا نعرہ بلند کیا۔ اس کے بعد منزل شمیشیہ آئی جس کا قدیم نام حدیبیہ ہے۔ جدہ سے نیت باندھ کر چلے تھے کہ حدیبیہ میں اُتر کر دو رکعت نفل پڑھیں گے اور اُس کنوئیں سے جس کا پانی غزوۂ حدیبیہ میں لشکر اسلام کیلئے ناکافی ہو گیا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکال کر اُس میں گڑوا دیا تھا جس سے دفعۃً پانی جوش مارنے لگا اور تمام لشکر کو کافی ہو گیا تھا۔ پانی پئیں گے۔ مگر حدیبیہ کے آتے ہی مستورات نے پیاس پیاس کہنا شروع کیا اور قہوہ خانے والے ٹھنڈے پانی کی صراحیاں سامنے لے آئے اُن کے خریدنے اور مستورات کو پانی پلانے میں اتنی دیر لگ گئی کہ موٹر کے قیام کا وقت ختم ہو گیا کیونکہ یہاں دس بارہ منٹ سے زیادہ وقفہ نہیں ہوتا۔ تھوڑی دور موٹر چلا تھا کہ سامنے جبل النور نظر آنے لگا جس کا قدیم نام جبل حرا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدت تک خلوت نشینی اختیار کی تھی اس کو دیکھ کر ابتداء نبوت کا منظر نگاہوں میں پھرنے لگا اور بے اختیار درود شریف زبان پر جاری ہو گیا۔ اللّٰھم صل وسلم وبارک علی سیدنا محمد النبی الامی وعلی اٰلہٖ واصحابہٖ کما تحب وترضیٰ"۔ ۳ بجے کے قریب جبل جرول سامنے آیا جس کے پیچھے مکۂ معظمہ آباد ہے۔ اس پہاڑ کی چڑھائی پر موٹر کا چلنا بھی ایک کرامت ہے

مکۂ معظمہ کا داخلہ

اس سے اُترتے تو پولیس کی چوکی پر موٹر ٹھیرا جہاں حجاج کی شمار کی گئی اور اسی جگہ معلم کے آدمی ہمارے استقبال کو آ گئے۔ حاجی عبد الستار ہمارے رفیق سفر بھی یہیں ملے جو ہم سے پہلے مکۂ معظمہ آ گئے تھے اور خرچ کی کمی کی وجہ سے مدینہ منورہ نہ جا سکے تھے مستورات کو موٹر سے اُتار کر گھوڑا گاڑی میں سوار کیا گیا۔ گاڑی کے ساتھ حاجی عبد الستار کو روانہ کیا تاکہ مستورات کو اُس مکان میں اُتار دیں جو معلم نے ہمارے واسطے حرم کے متصل باب الزیادہ پر پہلے سے تجویز کر رکھا تھا اور ہم سب رفقاء پیادہ پا مکہ میں داخل ہوئے۔ مکۂ معظمہ کی آبادی بھی اس وقت شریف حسین کے زمانہ سے زیادہ معلوم ہوئی اور

مسجد الحرام اور بیت اللہ کی زیارت

رونق بھی بہت تھی تقریباً آدھ گھنٹہ میں ہم مسجد الحرام کے دروازہ پر پہنچ گئے بیت اللہ پر نظر پڑتے ہی سفر کا تمام تکان جاتا رہا۔ اور

اللھم زد بیتک ھذا تشریفا و تعظیما و تکریما و مھابۃ وزد من شرفہ و عظمہ ممن حجہ او اعتمرہ تشریفا و تعظیما و مھابۃ و برا لا الہ الا اللہ واللہ اکبر پڑھا

طواف قدوم

سے نکلا پھر قریب جاکر حجر اسود کا استلام کیا۔ اور طواف قدوم شروع کر دیا۔ جس میں داہنا شانہ کھول کر تین شوط دوڑتے ہوئے پورے کئے اور چار آہستہ آہستہ۔ اسوقت کی حالت کا موازنہ وہی کر سکتا ہے جس نے یہ منظر اپنی نگاہوں سے دیکھا ہے کہ آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے ہیں۔ اور دل کسی کے مشاہدہ میں محو ہوتا ہے اور جب بے شمار مخلوق کو جس میں امیر بھی ہوتے ہیں غریب بھی۔ بوڑھے بھی جوان بھی بچے بھی۔ عورتیں بھی۔ عربی بھی عجمی بھی۔ مصری بھی۔ ہندی بھی۔ جاوی بھی سندی بھی۔ ترکی بھی۔ افریقی بھی۔ گورے بھی کالے بھی۔ بیت اللہ کے گرد گھومتے ہوئے دیکھا جاتا ہے۔ تو بے ساختہ حافظ شیرازی۔ کے یہ اشعار زبان پر آجاتے ہیں۔

غلام نرگس مست تو تاجدارانند … خراب بادۂ لعل تو ہوشیارانند
نہ من بر آں گل عارض غزل سرایم و بس … کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزارانند

طواف قدوم کے بعد دو رکعتیں پڑھی گئیں۔ پھر دعا مانگ کر عصر کی نماز رفقا کیساتھ جماعت سے ادا کی۔ اس کے بعد سعی کا ارادہ ہوا مگر وقت کی قلت کی وجہ سے سعی کو مغرب کے بعد پر ملتوی کیا گیا۔ اب ہم حرم ہی میں بیٹھے ہوئے بیت اللہ کے نظارے سے آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو راحت و سکون پہنچاتے رہے۔ تھوڑی دیر میں مغرب کی اذان ہوئی۔ امام حرم کے پیچھے نماز پڑھی۔ پھر سنتیں پڑھ کر سعی کے واسطے روانہ ہوئے اول جبل صفا پر پہنچے اور حدیث کی دعائیں پڑھ کر سعی شروع کی میلین اخضرین کے درمیان رب اغفر وارحم انت الاعز الاکرم کہتے ہوئے تیزی کے ساتھ دوڑ لگائی یہ عمل حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی سنت اور اُن کی یادگار ہے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حق تعالیٰ کے حکم سے اُن کو اس سرزمین مقدس میں جو اُس وقت بے آب و گیاہ تھا۔ یہاں تنہا چھوڑ گئے انکی گود میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام شیرخوار بچہ بھی تھے چند روز میں پانی کا مشکیزہ خالی ہو گیا۔ کھجوریں ختم ہو گئیں دودھ خشک ہو گیا تو حضرت اسمٰعیل بھوک و

پیاس میں ایڑیاں رگڑنے لگے۔ اور حضرت ہاجرہ کا کلیجہ اپنے بچہ کی بے تابی دیکھ کر منہ کو آنے لگا۔ تو وہ پانی کی تلاش میں اوّل صفا پہاڑ پر چڑھیں وہاں پانی کا نشان نہ ملا تو مروہ کی طرف چلیں۔ کچھ حصہ زمین نشیب میں واقع تھا جس میں چلتے ہوئے بچہ نگاہ سے اوجھل ہو جاتا تھا تو وہ اس حصہ کو دوڑ کر طے کرتی تھیں۔ مروہ پر بھی پانی نہ ملا تو پھر گھبرا کر صفا پر آئیں اسی طرح سات چکر لگائے حق تعالیٰ کو اُن کی یہ ادا پسند آگئی تو قیامت کیلئے صفا مروہ کی سعی تمام مخلوق پر لازم کردی گئی۔ تاکہ سوچنے والے سوچیں۔ سمجھنے والے سمجھیں کہ ایک عورت ذات نے خدا کی اطاعت اور اُس کی رضا میں کیسی جوانمردی اور ثبات قدمی وصبر و استقلال کا ثبوت دیا تھا۔ مردوں کو اس سے سبق لینا چاہیے اور عورتوں کو اُن کے اتباع کی کوشش کرنی چاہیے۔ سعی سے فارغ ہو کر مکان پر گیا۔ کھانا کھایا۔ جو معلم صاحب کے مکان سے بطور ضیافت کے آیا تھا۔ پھر نماز عشا ادا کی اور عشا کے بعد دوسرا طواف عمرہ کیلئے کیا۔ کیونکہ حنفیہ کے نزدیک قارن پر دو طواف اور دو سعی لازم ہیں۔

سلطان کا طواف اور سعی کیلئے تشریف لانا

طواف سے فارغ ہو کر سعی کرنے گیا تو صفا سے مروہ تک راستہ کے دونوں طرف نجدی سپاہیوں کا سنگین پہرہ تھا کیونکہ جلالۃ الملک سلطان ابن سعود بھی آج ہی نجد سے تشریف لائے اور عشا کے بعد طواف وسعی کرنے بیت اللہ میں آئے تھے جس وقت میں طواف کر رہا تھا اُس وقت تک کسی کو مطاف سے باہر نہیں نکالا گیا تھا۔ مگر تھوڑی دیر کے

مطاف وسعی کو خالی کرانے پر اعتراض

بعد ہی مطاف کو سلطان اور اُن کے رفقا کیلئے خالی کرا دیا گیا۔ اور علما خصوصاً علما ہند نے سلطان کے اس فعل کو بنظر کراہت دیکھا۔ کیونکہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے اپنے واسطے کبھی مطاف کو خالی نہیں کرایا بلکہ ہمیشہ سب کی ساتھ مل جلکر طواف کیا ہے۔ خلفائے راشدین کے بعد بھی کسی خلیفہ وقت کے لیے تاریخ میں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ پس یقیناً یہ فعل سنت کے خلاف ہے اور

بدعت میں داخل" ممکن ہی یہ کہا جائے کہ سلطان کو سب کیساتھ طواف کرنے میں کچھ خطرہ ہوگا۔ مگر یہ تاویل اس لئے غلط ہے کہ مسجد حرام سے زیادہ مجمع عرفات کی مسجد نمرہ میں ہوتا ہے اور سلطان صرف پانچ چھ سپاہیوں کے سنگین پہرہ میں وہاں تشریف لائے اور مسجد کو خالی نہیں کرایا گیا اور اگر فرض کرلیا جائے کہ سلطان کو سب کے ساتھ طواف کرنے میں خطرہ ہے تو اس صورت میں آپ کو ہر سال طواف و سعی کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ فریضۂ حج تو ادا کر چکے ہیں۔ صرف حج نفل کیلئے اس بدعت کے ارتکاب کی کوئی ضرورت نہیں جو ہر سال دنیا کی نظروں میں کھٹکتی ہے۔ اور اگر ایسی ہی ضرورت ہو تو آدھی رات کو بھیس بدل ایسے وقت بھی وہ طواف کرسکتے ہیں جب حرم میں اس پانچ غریبوں کے سوا کوئی نہ ہو اور اس صورت سے کرسکتے ہیں کہ کسی اُن کی اطلاع ہی نہو۔

اُمید ہے کہ جلالۃ الملک سلطان ابن سعود خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ میری اس خیرخواہانہ گذارش پر پوری توجہ فرمائیں گے۔ چونکہ جلالۃ الملک کو اتباع سنت کا بہت خیال ہے اس لئے دل چاہتا ہے کہ آپ کی کوئی ادا ایسی نہو جو سنت نبویہ سے واقفکار نظروں میں منکر و بدعت ہو کر ظاہر ہو۔

شاہی ضیافت میں شرکت

۵۔ ذی الحج کو جلالۃ الملک سلطان کی طرف سے دعوتی خط موصول ہوا جس میں ۶۔ ذی الحجہ کو عصر کے بعد قصر شاہی میں تناول طعام اور تقریر شاہی سُننے کیلئے بلایا گیا تھا۔ سلطان کی عادت ہے کہ ہر سال عمائد حجاج کو قصر شاہی میں مدعو فرمایا کرتے ہیں اور عمائد کا علم معلمین و مطوفین کے ذریعے انکو ہوتا ہے معلمین اپنے حاجیوں میں جس کو علم یا دولت میں بڑھا ہوا دیکھتے ہیں اُس کا نام سلطان کے سکرٹری کے پاس بھیج دیتے ہیں سلطان کی طرف سے اُسکے نام دعوتی خط معلم کے ذریعہ سے پہنچ جاتا ہے۔ میرے معلم نے میرا نام بھی بھیج دیا تھا۔ اس لئے مجھے بھی شاہی مہمان بننے کی عزت حاصل ہوئی۔

سلطان قصر شاہی میں

یہاں اس بات کا ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ نجدی قوم جلالۃ الملک سلطان ابن سعود کو قصر شاہی سے باہر تو سلطان

کی شان میں ظاہر کرتی ہے کہ اول راستہ کے دونوں طرف سنگین پہرہ ہو جاتا ہے موٹروں کا ایک سلسلہ بندھ جاتا ہے۔ جن میں بڑے بڑے افسر یکے بعد دیگرے آتے ہیں پھر سلطان کا موٹر آتا ہے اور تمام افسر اور فوجی سر و قد ہو جاتے ہیں مگر گھر کے اندر وہ سلطان سے ایسا معاملہ کرتے ہیں جیسا گاؤں کے کاشتکار اپنے زمیندار یا چودھری سے کیا کرتے ہیں دیکھنے والے کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ان میں بادشاہ کون ہے اور وزیر کون ؟ اور خادم کون ممکن ہے کہ کسی کو یہ طرز ناپسند ہوا ہو اور میں دیکھ رہا تھا کہ بعضے ہندوستانی بات بات پر اعتراض کر رہے تھے۔ مگر میں دل سے اسی کا خواہاں تھا اس لئے مجھے اس سے مسرت ہوئی کہ سلطان بھی اپنی رعایا کی طرح ایک آدمی ہے۔ بس اتنا فرق تھا کہ دوسرے معمولی آدمی تھے اور سلطان ایک خاص درجے کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ بہرحال اسلامی مساوات کی ایک نمایاں جھلک نظر آتی تھی جس سے مجھے خاص حظ حاصل ہوا۔

حمیدیہ میں اجتماع

عصر کے بعد تمام مہمانوں کو اول حمیدیہ میں جمع کیا گیا جو کسی زمانہ میں ترکی عدالت تھی اور اب بھی اُس کا نام ترکوں کی یاد کو تازہ کر دیتا ہے۔ یہ عمارت مسجد حرام سے ملی ہوئی بڑی عالیشان ہے وسیع وسیع کمرے بنے ہوئے ہیں مگر سامان زینت و آرائش زیادہ نہیں ہے سادگی برتی ہے۔ تقریباً ۴۵ منٹ تک ہم یہاں بیٹھے رہے پھر سلطانی موٹریں مہمانوں کو لینے کیلئے آئیں اور یکے بعد دیگرے ایک ایک موٹر روانہ ہوئی

قصر شاہی میں داخلہ

مغرب کے قریب ہم قصر شاہی میں پہنچے۔ دروازے پر سپاہیوں کا پہرہ تھا اور ایک نقیب بھی کھڑا ہوا تھا۔ جو ہر مہمان سے دعوت نامہ طلب کرتا اور دستخط کر کے اندر جانے کی اجازت دیتا تھا۔ بہت سے مہمان احرام باندھے ہوئے ننگے سر ننگی اور چادرہ پہنے ہوئے تھے اُن کو ایسی حالت سے اندر جانے کی اجازت دیدی گئی۔ جو بغیر احرام کے تھے وہ پورا لباس پہنے ہوئے سر پر عمامہ یا ترکی ٹوپی رکھے ہوئے قصر شاہی میں داخل ہونے کے بعد ایک پر فضا باغیچہ نظر پڑا جو سرزمین حجاز میں نئی چیز تھی گملوں میں بھی قسم قسم کے پھول لگے ہوئے تھے اس باغیچہ سے گذرتے ہوئے ایک زینہ پر چڑھے جس کی سیڑھیوں پر قیمتی مخملی قالین بندھی

ہوئی اور پیتل کی سلاخوں سے جمائی ہوئی تھی منزل پر مختلف بڑے بڑے کمرے تھے جن میں مہمانوں کیلئے کرسیاں بچھی ہوئی اور قیمتی مخملی قالین جوتوں کے تلے تھے۔ یہ تکلف اور سامان زینت دیکھ کر مجھے افسوس ہوا اگر رعایائے حجاز میں افلاس کا غلبہ نہوتا تو یہ سمجھ لیا جاتا کہ آج کل شان سلطانی لوازمات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قیمتی مخملی قالین جوتوں میں روندے جائیں مگر جس ملک کی رعایا ایسی مفلس ہو کہ حاجیوں کی چوسی ہوئی پھینکی ہوئی ہڈیوں پر بھی گرتی پڑتی ہو۔ فاقے پر فاقے کرتی ہو۔ بدن چھپانے کیلئے کپڑا میسر نہ ہو اس کا بادشاہ اپنے محل کی سیڑھیوں اور فرش پر مخملی قالین کا غلاف چڑھائے جائے حیرت ہی

علمائے نجد کو مشورہ

نہ معلوم علمار نجد نے سارا اتباع سنت مسئلہ شد رحال اور مسئلہ توسل اور ہدم بنا علی القبور ہی میں کیوں منحصر کر دیا۔ کیا یہ عجمی تکلفات اور اسرافات اتباع سنت کیخلاف نہیں۔ اگر حکومت سعودیہ کتاب اللہ اور سنت رسول پر واقعی چلنا چاہتی ہے تو اس کو ان تکلفات سے یکلخت الگ ہو جانا چاہیے اور ان قالینوں کو فروخت کر کے حجاز کی مفلس رعایا میں روپیہ تقسیم کر دینا چاہیے"!

جلالۃ الملک سلطان سے معروض

جلالۃ الملک سلطان ابن سعود کو حضرت سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا واقعہ یاد کرنا چاہیے۔ کہ جس وقت حجاز میں سخت قحط اور افلاس رونما ہوا تو آپ نے گھی کو چھوڑ کر زیتون کا تیل کھانا اختیار فرمایا تھا۔ یہاں تک کہ تیل کے استعمال سے آپکے چہرہ کا رنگ بدل گیا اور غذا اتنی کم کر دی تھی کہ دیکھنے والوں کو آپ پر رحم آتا تھا۔ رعایا کی بدحالی اور مفلسی کے زمانہ میں سلطان اسلام کو ایسا ہی کرنا چاہیے"!

میں نے سنا ہے کہ آجکل پائے تخت ریاض میں بھی عالیشان عمارتوں کی تیاری پر بیدریغ روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو میں اس پر بھی اپنے دلی رنج و افسوس کا اظہار کیے بغیر نہ رہوں گا جلالۃ الملک کو عالی شان قصر و محل کی اصلا ضرورت نہیں۔ بلکہ سب سے زیادہ ضرورت رعایا کی اقتصادی حالت سنبھالنے کی ہے تاکہ قلوب رعایا میں سلطان کی محبت پیوست ہو جائے مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک اہلِ حجاز کے

دلوں میں جلالۃ الملک کی محبت نے گھر نہیں کیا۔ حجاز میں دس سال سے زیادہ مدت اُن کی حکومت کو ہوگئی ہے۔ اور اس کے اسباب میں دوسری وجوہ کیساتھ اس کو بھی بڑا دخل ہے کہ رعایا پروری اور تالیف قلوب کے اُصول سے کام نہیں لیا گیا' اہلِ حجاز کے قلوب پر رعب حکومت کا سکہ تو خوب جما ہوا ہے مگر محبت والفت کی مہر نہیں لگی۔ حالانکہ استحکام و استقلال سلطنت کیلئے دونوں کی ضرورت ہے۔"

قہوہ کا دور

مغرب سے پہلے ایک دور قہوہ کا چلا میں نے اور میرے ہمراہی علماء نے تو نہیں پیا کیونکہ ہمیں اس کی عادت نہیں باقی اکثر لوگوں نے پیا اس کے بعد محل شاہی میں سے اذان کی سنائی دی اور سب مہمان قصر شاہی کے بالائی حصہ پر پہنچ گئے۔ جہاں کھلی ہوئی چھت پر جانمازیں بچھی ہوئی تھیں۔ اذان ختم ہونے کے بعد سلطان اپنے ایڈیکانگ کے ساتھ چند سپاہیوں کے درمیان تشریف لائے۔ صف اول میں کھڑے ہو گئے۔ امام آگے بڑھا اور نماز شروع ہو گئی۔ نماز کے بعد سلطان نے سنتیں ادا کیں۔ میں نے خوب غور سے دیکھا کہ آپ نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے لباس سادہ تھا۔ اور خالص عربی۔ ایک مشلح نجد کا بنا ہوا پہنے تھے جس کی گردن پر تین اُنگل چوڑا زردوزی کام تھا۔ سر پر عقال تھا۔ کسی قسم کا تکلف لباس میں نہ تھا۔ میرے قلب پر سلطان کی سادگی اور باخشوع نماز نے گہرا اثر کیا۔ سنتوں سے فراغت کے بعد سب مہمانوں نے سلطان سے مصافحہ کیا۔

قصر شاہی میں جماعت مغرب

سلطان کی نماز

جلالۃ الملک سے مصافحہ اور ملاقات

میں بھی آگے بڑھا اور السلام علیک یا سلطان المسلمین کہکر مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھائے اس وقت سلطان کے چہرہ پر تبسم آمیز بشاشت جلوہ گر تھی آپ کا قد لمبا ہے۔ چہرہ رعب دار نہیں۔ مگر دلوں کو اپنی طرف کشش کرنے والا ہے۔ مہمانوں سے ملاقات فرما کر سلطان ایک کمرہ میں تناول طعام کیلئے تشریف لیگئے اور مہمانوں نے دوسرے کمروں میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے میں ترکی تمدن کا اتباع کیا گیا تھا۔ میز پر کھانا لگا ہوا تھا۔ کرسیاں بچھی ہوئی تھیں کھانے کے

کھانا

ساتھ چھری کانٹا بھی رکھا ہوا تھا۔ اور خالی پلیٹیں بھی۔ غنیمت ہوا کہ ہم لوگوں کو چھری کانٹے کے استعمال کی نوبت نہیں آئی۔ کیونکہ سلطانی میزبان ہر چیز اپنے ہاتھ سے کاٹ کاٹ کر ہمارے سامنے رکھتا جا رہا تھا کھانا بہت عمدہ تھا اور مختلف انواع و اقسام پر مشتمل تھا۔ مٹھائیاں اور میوے بھی قسم قسم کے تھے۔ ہاں سالن میں مرچ کا نام نہ تھا۔ مجھے اس بات سے افسوس ہوا کہ عربی و اسلامی تمدن چھوڑ کر ترکی تمدن اختیار کیا گیا تھا۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ سلطان آیندہ اپنے تمام کاموں میں اسلامی سادگی اختیار فرمایا کریں گے۔ کہ خیر و برکت اور کامیابی و کامرانی اسی میں مضمر ہے۔

کھانے سے فراغت پا کر ہم سب اُسی بالائی حصہ پر جہاں نماز مغرب ادا کی تھی پہنچ گئے۔ کیونکہ سلطان کی تقریر ہونے والی تھی۔ یہاں اب جا نمازوں کی جگہ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ جن پر مہمانوں نے قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ ایک تخت پر سلطان کیلئے بلند کرسی رکھی ہوئی تھی تاکہ آسانی سے سب کو آواز پہنچ سکے۔

تقریر سلطانی کا نظارہ

دس پندرہ منٹ کے بعد سلطان تشریف لائے۔ اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئے، اس وقت اگر سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہتے تو سب کو اچھی طرح آواز پہنچ جاتی۔ مگر سلطان کے تشریف لاتے ہی لوگوں نے قریب پہنچنے کی کوشش کی کوئی کرسی آگے بڑھانے لگا۔ کوئی آگے بڑھکر کھڑا ہو گیا۔ کوئی کرسی ہی پر کھڑا ہو گیا غرض مجلس کا نظام ایسا مختل ہوا کہ سلطانی تقریر مسلسل سُننے میں نہ آئی کوئی بات سنائی دی تو کوئی رہ گئی، اس لیے میں اس مقام پر اپنی یاد سے تقریر سلطانی کا جو خلاصہ لکھونگا وہ مسلسل تقریر کا خلاصہ نہیں ہے بلکہ جس قدر سُنا ہے اُسی کا ماحصل ہے۔ یہ تقریر ام القری میں بزبان عربی شائع ہو چکی ہے اگر میرے بیان میں کوئی بات اس کے خلاف ہو تو ام القری ہی کے بیان پر اعتماد کرنا چاہیے کیونکہ اس میں سلطانی ذمہ داری کے ساتھ ہر بات شائع کی جاتی ہے، جلالۃ الملک سلطان ابن سعود بہت اعلےٰ درجہ کے مقرر ہیں جوش کے ساتھ آپکی تقریر جذبات سے بھی لبریز ہوتی ہے بڑی روانی اور سلاست بیانی کے ساتھ آپ خطبہ دیتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی

کہ جلالۃ الملک عربی شجاعت کیساتھ عربی فصاحت کے بھی جامع اور صاحب السنان ہونے کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے صاحب اللسان بھی ہیں۔ خواہ کوئی کچھ ہی کہے۔ مگر میں تو سلطان کو اس وقت بینظیر سلطان سمجھتا ہوں۔ جلالۃ الملک میں وہ سب باتیں موجود ہیں۔ جو ایک سلطان اسلام کی شایان شان ہیں۔ کاش اُن کے مشیر اور وزرار بھی اُن ہی جیسے دیندار اور مدبر و شجاع ہوں تو پھر سلطنت سعودیہ کی طاقت کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔ اس تمہید کے بعد سلطانی تقریر کا خلاصہ ملاحظہ ہو:-

تقریر سلطانی کا خلاصہ

سلطان نے حمد و صلوٰۃ کے بعد ارشاد فرمایا کہ دنیا کو بتادینا چاہتا ہوں کہ پہلے مسلم ہوں پھر عربی ہوں مجھے اپنے عربی ہونے پر کچھ فخر نہیں بلکہ اس پر فخر ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ عربی اور عجمی سب انسان ہی ہیں۔ اگر عربی کو عجمی پر فضیلت ہو سکتی ہے تو اُسی وقت جبکہ وہ مسلم اور متقی ہو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقکم۔ میرے اندر عربی خون ہے عربی حمیت و غیرت ہی۔ مگر یہ سب باتیں اسلام اور صرف اسلام کی وجہ سے موجب عزت ہیں ورنہ اس میں کچھ بھی عزت نہ تھی۔ میں سب مسلمانوں کو اپنا بھائی اور دست و بازو سمجھتا ہوں کسی کو اپنے سے کم نہیں سمجھتا۔ یہ حکومت اور سلطنت جو میرے پاس ہی محض خدا کی دی ہوئی ہے کسی دوسرے کو اس میں اصلا دخل نہیں۔ میرے ایک ہاتھ میں کتاب اللہ ہے۔ دوسرے ہاتھ میں تلوار ہے۔ اس لئے خدا کی مدد اور طاقت میرے ساتھ ہی اور اسی کی برکت سے مجھے یہ سلطنت ملی ہے اور جب تک کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میر انصب العین ہی۔ مجھے یقین ہے کہ خدا میری ساتھ ہے اور خدا کی طاقت اور مدد میری پشت پناہ ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ دو چیزیں میر انصب العین نہ رہیں تو پھر ایک ادنیٰ غلام بھی مجھے اپنا غلام بنا سکتا ہے۔ میں[۱] اہل بیت نبوت کا احترام کرتا ہوں اُن کی عزت و تعظیم کو اپنے لئے سعادت سمجھتا ہوں مگر اُسی وقت تک جبتک وہ اپنے جد امجد سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور شریعت کا احترام کرتے ہیں اور

[۱] غالباً امام یحییٰ سلطان یمن کی طرف اشارہ تھا ۱۲ ظ

اگروہ باوجود اولاد رسول ہونے کے اپنے جدامجد کی سنت وشریعت کو بھلادیں تو پھر میں اُن کو دوسروں سے زیادہ مورد ملامت اور قابل تعزیر سمجھتا ہوں۔ یہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل بیت نبوت سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اپنا احترام چاہتی ہے۔ کیونکہ اُن کے گھر میں یہ دولت نازل ہوئی ہے۔ اگروہی اس کی بیقدری کرنے لگیں تو اُن سے بڑھکر کون ظالم ہوگا۔ بعض لوگوں کو ہمارے مسلک پر کچھ اعتراضات ہیں۔ میں اُن سے کہدینا چاہتا ہوں کہ ہمارا مسلک کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنا ہے۔ میں کسی خاص مذہب کا پابند نہیں ہوں۔ اگر مجھے کسی مذہب کی کوئی بات کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے زیادہ موافق معلوم ہوتی ہے تو بے تکلف لے لیتا ہوں؛

میں مذاہب اربعہ میں سے ہر مذہب کا احترام کرتا ہوں اور باوجودیکہ ہم حنبلی ہیں۔ مگر ہم نے اپنے نصاب تعلیم میں عقیدۃ الطحاوی کو داخل کیا ہے۔ حالانکہ اُس کے مصنف بھی حنفی ہیں اور شارح بھی، مگر ہم نے اس کتاب کو قرآن وحدیث کیموافق پایا تو بے تکلف نصاب تعلیم میں داخل کردیا۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے اُمیدوار اور اُس پر عقیدہ جازم رکھتے ہیں، مجھے اُس شخص کے ایمان ہی میں کلام ہی جو شفاعت محمدیہ کا منکر ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی شخص باوجود دعوئی اسلام کے شفاعت کا انکار کیونکر کرسکتا ہی جن مسائل میں ائمہ اربعہ کا اختلاف ہے۔ اُن میں جس قول کو ہم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے زیادہ قریب سمجھتے ہیں اُس کو اختیار کرلیتے ہیں چنانچہ تارک صلوٰۃ کے متعلق ہم نے امام احمد بن حنبل کا یہ قول اختیار کرلیا ہے کہ تارک صلوٰۃ گو کافر نہیں مگر واجب القتل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہی کہ ہماری قوم میں کوئی بھی تارک صلوٰۃ نہیں ہو سکتا۔ میں سب مسلمانوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر عمل کرنے کی وصیت کرتا ہوں کہ کتاب اللہ کی خیر خواہی کرو۔ رسول کی خیر خواہی کرو۔ اور ائمہ اسلام کی خیر خواہی کرو۔ کتاب اللہ کی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کو گھر میں بند کرکے نہ رکھو بلکہ پڑھو اور اُس کے معانی وحقائق کو سمجھو اُن کے اوامر ونواہی پر کان لگاؤ۔ جن کاموں کا قرآن میں حکم ہے اُن کو بجالاؤ جن کا موں نے

منع کیا گیا ہے۔ اُن سے باز آجاؤ۔ رسول کی خیر خواہی یہ ہے کہ اُس کی سنت کو زندہ کرو سنت کی اشاعت کرو، بدعات کو عالم سے مٹادو۔ کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں جھونکنے والی ہے، ائمۂ اسلام دو قسم کے ہیں۔ ایک صحابہ وتابعین، مجتہدین و علمار کرام ان کی خیر خواہی یہ ہے...... کہ اُن کا احترام کرو اور شریعت اسلامیہ کے جو مسائل واحکام اُنھوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول...... سے استنباط کرکے بیان فرمائے ہیں اُن کو اپنا دستور العمل بناؤ۔ اپنی فہم کو اُن کی فہم سے اعلیٰ نہ سمجھو اپنی رائے کو اُن کی حکمت کے برابر نہ قرار دو کیونکہ سلف صالحین اتباع نفس واتباع ہویٰ سے پاک تھے اور ہم ہوائے نفس کے غلام ہیں۔ ہماری فہم ہماری عقل میں اُن کی برابر نور کہاں۔ وہ خیر القرون میں تھے ہم شر القرون میں ہیں، ائمۂ اسلام کی دوسری قسم وہ سلاطین وحکام اسلام ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں دین اسلام کی محافظت کرتے اُس کا بول بالا کرتے اور حدود واحکام کا اجرار کرتے ہیں۔ اُن کی خیر خواہی یہ ہے کہ اُن کی اطاعت کرو۔ جبتک وہ اللہ و رسول کی اطاعت کرتے رہیں، ان کی بیعت کو پورا کرو اور جبتک وہ کھلم کھلا شریعت کی مخالفت پر آمادہ نہو جائیں اُن سے بغاوت نکرو۔ اُن کے احکام کی تحقیر وتوہین نہ کرو۔

تقریر سلطانی کے خاتمہ پر یحیی جلالۃ الملک السلطان عبد العزیز آل السعود (زندہ باد جلالۃ الملک سلطان ابن سعود) کے نعرے بلند ہوئے۔ اور ایک شامی یا مصری لکچرار نے کھڑے ہوکر سلطان کے اُن کارناموں کا شکریہ ادا کیا جو خدمت اسلام ومسلمین میں اُنھوں نے انجام دیئے ہیں اور بہت کچھ مدح سرائی کے بعد جنگ نجد و یمن کے متعلق اسی قسم کے الفاظ کہے کہ عالم اسلامی اس جنگ کی وجہ سے بہت متفکر ہے اور نظریں اس کے نتیجہ پر لگی ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ انجام بخیر فرمائے اور جلالۃ الملک کو اپنے مقاصد میں کامیاب بنائے۔"

اس فقرہ کو سُنکر سلطان نے دوبارہ تقریر شروع فرمائی جس کا حاصل یہ تھا۔ کہ میں نے بعض مصالح کی بنا پر اس وقت نجد و یمن کی آویزش کے متعلق کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ مگر میرے ایک بھائی نے اس طرف اشارہ کر دیا ہے۔ تو اب اس کے متعلق بھی کچھ کہدینا چاہتا ہوں:

جنگ نجد و یمن کے متعلق سلطانی ارشاد

حقیقت یہ ہے کہ میں یحییٰ کو اپنا بھائی سمجھتا ہوں اور میرے دل میں اُن کی محبت و حرمت موجود ہے اور میں اُن کے لئے وہی چاہتا ہوں جو اپنے لئے چاہتا ہوں۔ مگر افسوس یحییٰ نے مجھے اپنا بھائی اور دوست نہ سمجھا۔ میں نے اُس قرطاس اخضر (سبز کتاب) کی اشاعت کا حکم دیدیا ہے جس میں وہ تمام مکاتبات و مکالمات درج ہیں جو ہمارے اور یحییٰ کے درمیان ہوئی ہیں اُس کے مطالعہ سے ہر شخص کو اندازہ ہو جائیگا کہ ظلم و تعدی کی ابتدا کس کی طرف سے ہوئی ہے۔ اس نزاع کی ابتدا قضیۂ نجران سے ہوئی ہے وہ کہتے ہیں کہ نجران میرا ہے اور میں کہتا ہوں کہ ہمارا ہے۔ میرے آبا و اجداد کی یہاں حکومت تھی اور اُن کے عمال وہاں ہمیشہ سے کام کرتے رہے ہیں۔ یحییٰ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ نجران کی زیادہ رعایا یمنی ہے اس لئے وہ یمن کا جزو ہے۔ بھلا کسی ملک میں اگر دوسرے ملک کی رعایا آکر آباد ہو جاوے تو کیا یہ ملک اس اکثریت کے ملک کا جزو ہو جائیگا۔ فرض کرو اگر مکہ مدینہ میں یمن کے باشندے زیادہ مقیم ہو جائیں تو کیا کوئی عاقل کہہ سکتا ہے کہ اس سے مکہ یا مدینہ یمن کا جزو بن جائے گا۔ میں نے یحییٰ کو بہت سمجھایا کہ جنگ کے ارادہ سے باز آجاؤ اور انصاف کے ساتھ اس نزاع کا فیصلہ کرلو۔ میں مسلمانوں کا خون بہانا نہیں چاہتا نہ تمہارا ملک دبانا چاہتا ہوں۔ یحییٰ اس کے جواب میں کید اور ضراع سے اپنی خلوص نیت اور محبت و مودت کا اظہار کرتے رہے۔ اور لکھا کہ میں اس سے بالکل بیخبر ہوں کہ نجران کی طرف یمنی افواج پیش قدمی کر رہے ہیں۔ میں اپنے ولی عہد کو اس سے روکدونگا اور صلح و مصالحت سے اس نزاع کا فیصلہ کرلوں گا۔ آپ مطمئن رہیں میری طرف سے اخوت و محبت کے سوا کچھ ظاہر نہ ہوگا۔"

ہم سے تو یہ باتیں کی جاتی تھیں۔ مگر افواج یمن برابر بڑھتی چلی جاتی تھیں۔ میں نے یحییٰ کو پھر لکھا کہ آپ کی فوج کس لئے میری حد میں بڑھ رہی ہے۔ حالانکہ آپ مصالحانہ گفتگو پر آمادہ ہیں۔ اس کا جواب بھی یہی دیا گیا کہ میں نے افواج کو پیش قدمی سے روکدیا ہے۔ آپ مطمئن رہیں میری طرف سے جنگی اقدام نہ ہوگا۔

قول یہ تھا اور عمل یہ کہ فوجیں برابر بڑھ رہی تھیں۔ یہاں تک کہ نجران پر بھی قبضہ کرلیا گیا اور چند پہاڑی علاقوں پر بھی۔ لیکن میں نے اپنی فوجوں کو حملہ سے روک رکھا تھا۔ اور کہدیا تھا کہ بدون میری اجازت کے ہرگز حملہ نہ کیا جائے۔ جب میں نے دیکھا کہ یحیٰی کا قول کچھ ہے اور عمل کچھ تو اُن کو پھر سختی سے لکھا کہ اب میں مدافعت پر مجبور رہوں ورنہ جلد اس نزاع کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ میں نے یہاں تک لکھدیا کہ میں مسلمانوں کی خونریزی سے بچنے کے لئے اس پر بھی راضی ہوں کہ نجران کو آزاد علاقہ قرار دیا جائے نہ اُس پر میرا قبضہ ہو نہ آپ کا۔ اس کے جواب میں بڑی مسرت کا اظہار کیا گیا اور لکھا گیا کہ آپ جلد مقام نہاء میں اپنا ایک وفد بھیجدیں۔ میں بھی اپنا وفد بھیجونگا۔ دونوں مل کر شرائط صلح طے کریں گے میں نے اس کے جواب میں فوراً اپنا وفد بھیجدیا۔ مگر جو کچھ اس وفد کا انجام ہوا دنیا کو معلوم ہے کہ اس وفد کو گرفتار کرلیا گیا۔ چنانچہ اس مجلس میں یہاں رئیس وفد موجود ہے جو بڑی حادثت اور حیلہ و تدبیر کے ساتھ یمن کی قید سے نکل کر آیا ہے۔ میرے وفد نے جب یحیٰی کو وہ معاہدات یاد دلائے جو اُن کے اور ہمارے درمیان پہلے سے قائم تھے تو صاف جواب دیا گیا کہ یہ معاہدات کاغذ کے اوراق میں ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی کچھ وقعت نہیں۔ جب میں نے دیکھا کہ یحیٰی کو نہ معاہدات کا پاس ہے نہ اپنے قول و قرار کا، اور اُس نے میرے وفد کو بھی گرفتار کرلیا جس کا گرفتار کرنا شریعت اور عقل اور تہذیب کے سراسر خلاف تھا۔ اور میں نے کھلی آنکھوں دیکھ لیا کہ وہ کسی طرح مصالحت پر آمادہ نہیں۔ اور مصالحت کی تمام کوششیں بیکار ہوچکی ہیں تو مجبور ہو کر میں نے اپنے ولی عہد کو پیش قدمی کا حکم دیا کہ جو علاقے ہمارے قبضہ سے نکل چکے ہیں اُن کو واپس لینے کی کوشش کی جائے۔ میں نے دس مہینے تک یحیٰی کو ڈھیل دی اور جنگ کو ٹالتا رہا۔ حالانکہ میرا اس میں مالی اور سیاسی بڑا نقصان ہوا۔ مگر میں نے صرف اس لئے ایسا کیا کہ یحیٰی ایک سلطنت سے اپنے بعض مقامات کے متعلق گفت و شنید کر رہے تھے اور اپنے مقبوضات کے استرداد و استخلاص کی کوشش کر رہے تھے۔ اگر میں اس وقت اُن کے ساتھ جنگ شروع کردیتا تو وہ ایک کافر سلطنت سے اپنے مقبوضات کی واپسی میں ناکام ہو جاتے۔ جس کو میں نے گوارا نہ کیا۔ مگر یحیٰی ادھر تو

ہم کو دھوکہ دیتے رہے اور محبت و مودت کا اظہار کرکے ٹالتے رہے ادھر اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے رہے۔ جب یہ گفت و شنید تمام ہو چکی اور وہ اپنے مقاصد میں کسی حد تک کامیاب ہوگئے تو اب ہم سے بیرخی اختیار کی اور تمام معاہدات کو پس پشت ڈال کر فوجوں کو پیش قدمی کا حکم دیدیا۔ اس حالت میں میری عربی حمیت اور شریفانہ غیرت ہرگز ذلت و عار کو گوارا نہ کر سکتی تھی اس لئے میں نے اللہ کی مدد پر بھروسہ کرکے اپنی تلوار اور اپنی قوم کی بے پناہ طاقت کو میدان میں لانے کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا اور اب تلوار ہی اس نزاع کا فیصلہ کریگی اور چونکہ میں ظلم و تعدی کا بانی نہیں ہوں۔ میری حیثیت صرف مدافعانہ ہے۔ اس لئے مجھے اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ میں ناکام نہ ہونگا لکم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ۔ لیکن پھر بھی میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ میرا ہاتھ صلح کے لئے ہر وقت بڑھا رہیگا بشرطیکہ دوسری طرف سے بھی خلوص نیت کیساتھ جذبۂ مصالحت کا اظہار کیا جائے اور اگر کسی کو اپنی طاقت پر ناز ہے تو میں اس کے جواب میں اس کے سوا کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ نجد کا بچہ بچہ جنگ کیلئے بیتاب اور جوش جہاد میں بھرا ہوا ہے جبتک ایک متنفس بھی باقی رہیگا میدان سے ہٹنے کا نام نہ لیگا اور تکبر و غرور کرنے والا کبھی فلاح نہیں پا سکتا۔

میرے پاس اس قسم کی بہت درخواستیں آرہی ہیں کہ جنگ کو ٹالا جائے اور جہانتک ہوسکے مصالحت و افہام و تفہیم سے کام نکالا جائے۔ مگر یہ سب باتیں مجھ سے کہی جاتی ہیں حجاز سے کوئی کچھ نہیں کہتا۔"

مجھے اس کا افسوس ہے کہ اس معاملہ میں سلاطین اسلام اور مسلمانوں کی بااثر جماعتوں میں سے کسی ایک نے بھی درمیان میں پڑکر حق و باطل کی تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نکی اور نہ اس نزاع کو حق کے موافق فیصل کرنے کی سعی کی نری تمناؤں کا اظہار کیا گیا ہے مگر نری تمنا سے کیا ہو سکتا ہے۔ جبکہ حق و باطل کی تحقیق کرکے یہ نہ معلوم کیا جائے کہ تعدی کس کی طرف سے ہے اور جس کی طرف سے تعدی ہو اُس پر زور نہ ڈالا جائے۔ اب معاملہ حد سے بڑھ گیا ہے اور میں نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرکے اپنی فوجوں کو حرکت کرنے کا حکم دیدیا ہے۔ بس اب تلوار ہی سے اس نزاع کا فیصلہ ہوگا۔ لیکن میں پھر کہتا ہوں کہ

اس صورت کو میں نے راضی ہو کر اختیار نہیں کیا بلکہ میں اس پر مجبور ہو گیا ہوں اور اگر اب بھی صلح کی کوئی صورت ہو جائے تو میں ہر وقت اسکے لیے تیار ہوں۔"

جلالۃ الملک کی یہ تقریر بہت پر جوش اور پر درد تھی اور اس کے بعض فقرات ایسے بھی تھے جن کا عام مجمع کے سامنے بیان کرنا مصالح سیاسیہ کے خلاف تھا اس لیے سلطان نے اولاً اس مبحث کو تقریر میں لانے سے قصداً اجتناب فرمایا تھا مگر ایک بخاری نے اس قضیہ کی طرف اشارہ کر کے عالم اسلامی کا تفکر و اضطراب ظاہر کیا تو مجبوراً سلطان کو اس مسئلہ پر روشنی ڈالنا پڑی۔ اس لیے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ جلالۃ الملک فی نفسہٖ بے نظیر سلطان ہیں۔ کاش اُن کے مشیر بھی اُن کے شایان شان ہوتے۔

مجلس شاہی میں چیئرز

افسوس ہے کہ تقریر سلطانی کے درمیان میں بعض فقرات پر بڑے زور سے چیئرز بھی ہوتا تھا، شاید جلالۃ الملک نے اس مسئلہ پر شرعی حیثیت سے ہنوز توجہ نہیں فرمائی۔ اس لیے میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ یہ طرز کفار سے لیا گیا ہے اور شریعت اسلامیہ کا حکم اس کے متعلق وہ ہے جو صحیحین کی حدیث میں صاف موجود ہے "انما التسبیح للرجال والتصفیق للنساء" کہ ضرورت کے موقع پر مردوں کو سبحان اللہ کہنا چاہیے اور تالیاں بجانا عورتوں کے لیے مخصوص ہے" سلطان کی دوسری تقریر کے بعد پھر ایک شامی یا مصری لیڈر کھڑے ہوئے اور اُنہوں نے سلطان کی مدح میں قصیدہ خوانی شروع کر دی۔ عشاء کی اذان ہو چکی تھی اس لیے میں تو اپنے چند رفقاء کے ساتھ اُٹھ کر چلا آیا اور سلطانی موٹر میں بیٹھ کر مسجد حرام میں پہنچا۔ جماعت سے نماز ادا کر کے اپنے قیامگاہ پر آگیا۔ بقیہ مہمان عشاء کی نماز سلطان کے ساتھ قصر شاہی میں پڑھ کر واپس ہوئے صبح کو باہم تبادلہ خیال ہوا تو اس پر سب متفق تھے کہ سلطان کی تقریر بڑی زبردست تھی۔ ایسا بولنے والا کم دیکھا گیا ہے۔ مگر مشیران دولت کے اکثر لوگ شامی تھے۔

مکہ میں جمعہ کی نماز

آج ۷۔ ذی الحجہ جمعہ کا دن ہے۔ جمعہ کی نماز کیلئے ہر طرف تیاری ہو رہی ہے۔ کیونکہ مکہ معظمہ حجاج سے بھرا ہوا ہے اور یہاں

مسجد الحرام کے سوا کسی مسجد میں جمعہ نہیں ہوتا۔ اندیشہ تھا کہ اگر دیر سے پہنچیں گے تو امام کے قریب سایہ میں جگہ نہ ملیگی۔ مگر جلدی کرنے سے بھی یہ مدعا حاصل نہ ہوا کیونکہ امام کے قریب سایہ دار جگہ بہت کم تھی۔ جو ہم سے پہلے ہی بھر چکی تھی۔ اس لئے چھتری کھول کر مطاف میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر تو دھوپ سے تکلیف ہوئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بادل بھیجدیا ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں اور بہت آرام کے ساتھ خطبہ سنا گیا نماز کے بعد خوب زور سے بارش ہوئی۔ مسجد حرام کا خطیب خطبہ بہت زور سے دیتا ہی آواز بھی بہت بلند اور دلکش ہے اور الفاظ بھی بہت زوردار تھے جنکے اثر سے بہت لوگ رو رہے تھے

خطبہ میں سلطان کا نام نہ تھا

مجھے دوسرے خطبہ میں سلطان کے نام کا انتظار تھا۔ مگر یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ سلطان کا نام نہیں لیا گیا۔ اس سے پہلے مدینہ میں بھی ایک جمعہ پڑھا تھا۔ وہاں بھی خطبہ میں سلطان کا نام نہیں سنا تھا۔ حالانکہ یمن میں امام یحییٰ کا نام خطبہ جمعہ کے اندر بڑی شان سے لیا جاتا ہے۔ اُن کو امیر المؤمنین خلیفۃ المسلمین کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے اور تماشا یہ کہ خلفائے راشدین میں سے حضرت علی کے سوا کسی کا بھی نام نہیں لیا جاتا۔ حضرت علی کے بعد حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اور حضرت سیدتنا فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا نام آتا ہے پھر امام زید بن علی کا اور اُن کے بعد معاً امام یحییٰ کا۔ یہ اس بات کا اثر ہے کہ امام یحییٰ زیدی شیعہ ہیں جن کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ تبرائی نہیں ہوتے۔ حضرات شیخین اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کو برا نہیں کہتے مگر خطبہ جمعہ کی یہ صورت سنکر معلوم ہوا کہ ثلثہ سے محبت تو یہ بھی نہیں رکھتے مگر وہ بھی تبرائی شیعہ سے موافق ہیں جیسا متعہ وغیرہ کو حلال سمجھنے میں اُنکی ساتھ ہیں۔

میں نے مکہ مدینہ میں بعض احباب سے دریافت کیا کہ سلطان کا نام خطبہ میں کیوں نہیں لیا جاتا تو مجھ سے کہا گیا کہ خطباء نے تو نام لینا چاہا تھا۔ مگر سلطان نے یہ کہکر منع فرما دیا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ میرا نام منبر رسول پر یا بیت اللہ کے سامنے خطبہ میں لیا جائے۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو اس سے سلطان کی شان تواضع کا پورا ظہور ہوتا ہے۔

مسجد الحرام کے امام

آجکل مکہ معظمہ میں چار جماعتیں نہیں ہوتیں صرف ایک ہی جماعت ہوتی ہے۔ امام اکثر حنبلی ہوتا ہے کبھی حنفی شافعی یا مالکی بھی ہو جاتا ہے۔ حنبلی امام غالباً مصری ہیں۔ نماز میں قرآن بہت اچھا پڑھتے ہیں۔ جس کی اکثر لوگ تعریف کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔

منیٰ کو روانگی

سنیچر کو ۸۔ ذی الحجہ تھی۔ صبح ہی سے منیٰ کی طرف روانگی کی تیاری ہونے لگی۔ مکہ کی گلیاں اور بازار اونٹوں کی قطاروں سے بھرے ہوئے تھے ہم نے بھی منیٰ عرفات کیلئے اونٹ کرایہ لیے تھے۔ مگر بستی کے اندر عورتوں کو اونٹوں پر سوار کرنے میں اندیشہ تھا کہ ہجوم کی وجہ سے شغدف ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے تو زحمت کا سامنا ہوگا۔ اس لئے میں مستورات کو ساتھ لیکر پیادہ پا چلا اور مکہ سے باہر ایک قہوہ خانہ میں ٹھر گیا۔ تھوڑی ہی دیر مولانا محمد شفیع صاحب مجددِ بانہ شان میں سامنے سے تشریف لاتے ہوئے نظر پڑے میں نے استقبال کیا دونوں طرف سے لبیک اللھم لبیک کی صدا بلند ہوئی معانقہ اور مصافحہ کے ساتھ مولانا نے حج مقبول کی بشارت سُنائی اور پیادہ پا منیٰ کو تشریف لے گئے۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہاں اونٹ پہنچے تو ہم سوار ہوئے۔ ہمارے رفقاء میں سے چار مرد منیٰ و عرفات تک اونٹوں کی ساتھ پیدل ہی چلتے رہے۔ تاکہ راستہ میں شغدفوں کو لڑنے سے بچالیا جائے۔ اس مقام پر یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ آجکل منیٰ و عرفات کی طرف موٹر لاریاں بھی

حکومت سعودیہ کو مشورہ

بکثرت جاتی ہیں جن کی آواز سے بعض دفعہ نیا اونٹ بھڑک جاتا اور شغدفوں کے باہم لڑنے کا خطرہ رہتا ہے اور شغدف جہاں ایک دوسرے سے لڑا پھر زمین ہی پر آگر رہتا ہے جس سے سوار کو تکلیف ہوتی اور اکثر چوٹ بھی لگ جاتی ہے۔ حکومت سعودیہ کو اس طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے یا تو موٹروں اور اونٹوں کا راستہ بدل دینا چاہئے، یا موٹروں کو اونٹوں سے پہلے روانہ کرنا چاہئے۔ دونوں کا ساتھ ساتھ چلنا بہت خطرناک ہے۔ ظہر سے پہلے ہم منیٰ پہنچ گئے۔ اور ایک مکان میں جو پہلے سے کرایہ پر لیلیا گیا تھا اُتر پڑے۔

آجکل مکہ اور منی کے درمیان جابجا قہوہ خانے بنے ہوئے ہیں۔ جہاں ٹھنڈا پانی اور چائے وغیرہ ہر وقت تیار مل جاتی ہے۔ اور حج کے موسم میں منیٰ تو خاصا شہر بنجاتا ہی بازار میں ہر قسم کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ یہانتک کہ برف اور لیمن کی بوتلیں بھی دوکانوں پر رکھی ہوتی ہیں۔

حکومت سعودیہ کا کارنامہ

پہلے منی میں پانی کا قحط ہو جاتا تھا۔ ایک کنستر پانی ۴-یا ۸ر میں ملتا تھا اب پانی کی بہت افراط ہے۔ ایک آنہ میں کنستر ملتا تھا۔ اور غریبوں کے لئے تو سلطان کی طرف سے پانی کی سبیل لگی ہوئی ہے۔ جہاں سے وہ مفت پانی بھر لاتے ہیں۔ امیروں کو بھی ممانعت نہیں ہے

عرفات کی طرف کوچ

منیٰ میں پانچ نمازیں پڑھ کر اتوار کی صبح کو آفتاب نکلنے کے بعد میدان عرفات کی طرف کوچ ہوا۔ ظہر سے پہلے عرفات پہنچ گئے۔ راستہ میں جابجا دوکانیں اور قہوہ خانے موجود تھے پینے کیلئے پانی کی ایک صراحی دو پیسے میں ملتی تھی۔ عرفات پہنچ کر غسل مسنون کا ارادہ ہوا۔ مگر فکر تھا کہ اتنا پانی کہاں سے آئیگا۔ دوستوں نے کہا اس حکومت میں پانی کا کیا فکر؟ چنانچہ اُسی وقت پانی والے ایک آنہ مشک دیتے ہوئے نظر آئے ہمنے کئی مشکیزے خرید لئے اور تمام رفقاء نے غسل کر لیا

عرفات میں ظہر وعصر کو اکٹھا پڑھنا

پھر مسجد نمرہ میں پہنچے جہاں ظہر وعصر کو جمع کر کے ظہر ہی کے وقت پڑھا جاتا ہے اُس دن دو نمازوں کو ایک وقت میں جمع کرنا سب ائمہ کے نزدیک مسنون ہے۔ مگر اس کیلئے کچھ شرائط بھی ہیں۔ جو کتب فقہ میں مذکور ہیں۔ ہاں اس جگہ ایک بات پر متنبہ کر دینا ضروری ہے وہ یہ کہ ہمارے نزدیک اگر امام موسم حج مقیم ہو تو عرفات میں اُس کو ظہر وعصر کی چار رکعتیں پڑھانا چاہئیں اگر مسافر ہو تو دو رکعت پڑھے اور مقتدی مقیم سلام کے بعد اپنی دو رکعتیں پوری کرے۔ مگر نجدیوں کے نزدیک عرفات میں امام کو بہر حال ظہر اور عصر کی دو رکعتیں پڑھانا چاہئیں خواہ مسافر ہو یا مقیم ہو (میں نہیں کہہ سکتا کہ امام احمد بن حنبل کا یہی مذہب ہے۔ یا اہل ظاہر کے قول پر نجدیوں نے عمل کیا ہے) اب اگر امام مسافر نہ ہوا اور اُس نے باوجود مقیم ہونے کے ظہر وعصر کی دو دو رکعتیں پڑھائیں تو حنفیہ کے نزدیک کسی کا فرض ادا

نہیں ہوا نہ امام کا نہ مقتدیوں کا۔ اسی وجہ سے میرے بعض احباب علماء کی یہ رائے تھی کہ مسجد نمرہ میں امام کی ساتھ نماز نہ پڑھی جائے۔ بلکہ اپنے خیمہ میں جماعت کرلیجائے مگر میں نے اس صورت کو پسند نہیں کیا بلکہ مسجد میں امام کے ساتھ بھی نماز ادا کی اور خیمہ میں واپس آکر دوبارہ اعادہ بھی کیا۔ احباب نے بھی میری اس رائے کو پسند کیا۔ مگر ظاہر ہے کہ تمام لوگوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ عموماً سب نے امام کی ساتھ جو نماز پڑھی تھی اُسی پر اکتفا کیا۔

حکومت سعودیہ کو مشورہ

حکومت سعودیہ کو اس طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس مسئلہ میں تمام مذاہب کی رعایت نہ کرنے سے بہت لوگوں کی نماز اُن کے مذہب کے اعتبار سے باطل ہوتی ہے اور یہ سخت افسوسناک صورت ہے کہ عین حج کے موقعہ پر لوگوں کی نماز میں اختلال واقع ہو۔

گرمی اور دھوپ کیوقت سلطان کا مسجد میں آنا

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ باوجود سخت دھوپ اور گرمی کے جلالۃ الملک سلطان ابن سعود مسجد نمرہ میں تشریف لائے اور جماعت سے نماز ادا کی۔ سلطان کو حالت احرام میں ننگے سر ایک لنگی ایک چادر میں دیکھکر قلوب پر جو اثر ہوا اُس کا اندازہ دیکھنے والے ہی کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ذات ہمایونی کو اس دینداری اور پابندی مذہب کے ساتھ تا دیر سلامت رکھے اور آپ کی ظاہری و باطنی دینی اور دنیوی کامیابیوں میں روز افزوں ترقی عطا فرمائے ؎ ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد۔

جلالۃ الملک سے گذارش

اس موقع پر سلطان سے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ امام حرم کو تاکید فرمادیں۔ کہ اگر کبھی وقوف عرفات کی نماز میں ایسا سہو ہو جاوے جس سے نماز باطل نہ ہو صرف سجدہ سہو لازم آتا ہو تو سجدۂ سہو ایسی صورت میں نہ کیا جاوے۔ حنفیہ نے اس کی تصریح کی ہے اور جملہ آئمہ نے ایسا

اُن کی موافقت کی ہے۔ کیونکہ مجمع کثیر کے ساتھ سجدہ سہو کرنے سے دور والے ایسی گڑبڑ کر دیتے ہیں کہ نماز بالکل باطل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس سال مسجد نمرہ میں ظہر کی نماز پڑھاتے ہوئے امام کو سہو ہوا اور اُس نے قعدۂ تشہد کے بعد سجدۂ سہو کیا تو بہت لوگ یہ سمجھے کہ عصر کی نماز شروع ہو گئی اُنہوں نے ظہر کی نماز ختم کر کے عصر کی نیت باندھ لی جب امام نے سجدۂ سہو کے بعد سلام پھیرا تو اب نمازیوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔" سجدۂ سہو جبر نقصان کے لئے ہے۔ مگر جب جبر نقصان فساد صلوٰۃ کا سبب ہو جائے تو جبر کی حاجت نہیں۔

نماز ظہر کے بعد معاً عصر کی نماز ادا کی گئی پھر ہم سب اپنے خیموں کی طرف چلے۔ مگر میدان عرفات میں خیمہ کا ملنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ بڑی دیر تک ہم کو ادھر اُدھر پریشان پھرنا پڑا۔ خدا خدا کر کے معلم مل گیا تو اُس نے خیمہ تک ہم کو پہنچایا۔ اور یہ دقت میدان عرفات میں ہر سال پیش آتی ہے اور ہمیشہ سے چلی آرہی ہے۔"

حکومت سعودیہ کو مشورہ

کاش حکومت سعودیہ جس نے حجاج کی بہت سی آسانیوں کا انتظام کیا ہے۔ اس تکلیف کا ازالہ بھی کر دے اور کوئی ایسی صورت نکالے جس سے ہر معلم کا حاجی اپنے خیمہ تک آسانی سے پہنچ جایا کرے

اس دشواری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اکثر حجاج جبل رحمت پر سلطان کے ساتھ وقوف نہیں کر سکتے نہ اُن کا خطبہ سُن سکتے ہیں۔ کیونکہ خطبہ سُن کر وقوف سے فارغ ہو کر اپنے خیمہ تک پہنچ جانا محال نہیں تو قریب بہ محال ضرور ہے اس لئے عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ نماز سے فارغ ہو کر لوگ اپنے اپنے خیمہ ہی میں وقوف کرتے اور اسی جگہ دعا وغیرہ میں لگے رہتے ہیں۔ چنانچہ مجھے بھی ایسا ہی کرنا پڑا۔

وقوف عرفہ

جس وقت میں اپنے شغدف میں پہنچا۔ تو میری بھتیجی اپنے شغدف میں بیٹھی ہوئی تلاوت قرآن کر رہی تھی میں بھی تلاوت اور دعا میں مشغول ہو گیا۔ مجھے فکر یہ ہوا کہ بھتیجی کی شیر خوار بچی سفیدہ خاتون سلمہا نے اگر رونا شروع کر دیا تو آج عرفات کے میدان میں دعا بھی اچھی طرح نہ ہو سکے گی مگر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ایسا شامل حال ہوا کہ بچی نے رونے کا نام نہیں لیا وہ الگ بیٹھی ہوئی اپنے کھیلوں سے کھیلتی رہی

یا ہماری تلاوت اور دعا و مناجات کو سُن کر ہنستی رہی۔ دو گھنٹے کے بعد ہمنے عصر کی نماز جماعت سے دوبارہ ادا کی اور پھر درود شریف اور دعا میں لگ گئے۔ جب غروب آفتاب قریب ہوا تو میں نے اپنے سب رفقار کو جمع کر کے دعا کی۔ اس وقت قلوب کی عجیب حالت تھی یہ تصور کر کے کہ اسی میدان عرفات میں ہم سے عہد الست لیا گیا تھا وہ بھی کیسا وقت تھا کہ اللہ تعالیٰ شانہ ہم سے ہمکلام ہوئے تھے اور ہم نے الست بربکم کے جواب میں بلیٰ شہدنا کہا تھا۔ آج ہزاروں برس کے بعد ہم پھر اسی مقام پر دوسری حالت میں اقرار وحدانیت و اعتراف عبودیت اور تجدید عہد اور اظہار بندگی کے لیے حاضر ہوئے ہیں روح پر ایک عالم وجد طاری تھا۔ کوئی سکتہ میں تھا۔ کوئی بیقرار ہو کر رو رہا تھا۔ کوئی نعرۂ مستانہ لگا رہا تھا۔ یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا اور یہ بابرکت اور دلفریب و دلکش محفل ختم ہوئی۔ حجاج نے ایک دوسرے کو حج مبارک ہونے کی خوشخبری دی اور حسرت بھری نگاہوں سے میدان عرفات کو دیکھتے ہوئے جبل رحمت کو جہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے وقوف فرمایا تھا اور جس مقدس مقام پر اللہ تعالیٰ نے الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً کا مژدہ امت محمدیہ کو اپنے مقدس رسول کی زبانی سُنایا تھا تکتے ہوئے مڑ مڑ کر بار بار تکتے ہوئے روانہ ہوئے

وقوف مزدلفہ

اور عشا کے وقت مزدلفہ پہنچے یہاں مغرب و عشا کو ایک اذان اور دو اقامت کے ساتھ جماعت کیساتھ جمع کیا پھر کھانے کا انتظام کر کے سو رہے اور پچھلی شب صبح سے پہلے بیدار ہو گئے تہجد پڑھی پھر صبح کی نماز اول وقت ادا کر کے کھڑے ہو کر خشوع و خضوع کے ساتھ دعا میں مشغول ہو گئے۔ آفتاب نکلنے سے کچھ پہلے دعا ختم کر کے یہاں سے بھی کوچ کیا دو گھنٹے یا کچھ زیادہ میں منیٰ پہنچے، میں نے دیکھا کہ یہاں اونٹوں کا بہت اژدحام ہے اور شغدفوں کو لڑنے کا خطرہ ہے۔ اس لیے دروازۂ منیٰ پر ہی مستورات کو اونٹ سے اُتار لیا۔ اور پیادہ پا راستہ کے کنارے اُس مکان پر پہنچ گئے جو ہمارے کرایہ میں تھا۔ اونٹ سامان کو لیکر کچھ دیر کے بعد پہنچے اُسوقت معلوم ہوا کہ ہماری مستورات کو اونٹ سے اُترتا ہوا دیکھ کر قافلہ کی دوسری مستورات نے

بھی اُترنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر اُن کے مردوں نے منع کیا نتیجہ یہ ہوا کہ شغدف آپس میں لڑے اور ایک شغدف زمین پر گرا اُس میں ایک مساۃ تھی اُس کے سر میں ایسی چوٹ آئی کہ دس گھنٹہ تک بیہوش رہی اُس کا خاوند میرے پاس آیا میں نے مشورہ دیا کہ اسی وقت سلطانی اسپتال میں لیجاؤ جو منیٰ کے اندر ہی موجود ہے۔ چنانچہ لیگئے اور ڈاکٹری دوا سے اُس کو افاقہ ہوگیا۔

منیٰ کا قیام

منیٰ میں اول جمرۂ عقبہ پر کنکریاں ماریں پھر قربانی کی پھر سر منڈایا غسل کیا۔ احرام کھول کر سلے ہوئے کپڑے پہن لئے اور اب مکہ جانے کی تیاری کی تاکہ طواف زیارت آج ہی کر لیا جائے۔

طواف زیارت

گو اس کا وقت ۱۲۔ ذی الحجہ تک ہے۔ مگر افضل دس ذی الحجہ ہی کو ہے۔ میں کپڑے بدل کر تیار ہوا۔ تو مولوی عتیق الرحمن صاحب دیوبندی بولے۔ کیا مکہ کی تیاری ہے میں نے کہا ہاں۔ کہنے لگے سواری تو کوئی نہیں ملتی۔ میں نے کئی آدمی بھیجے۔ یہی جواب آیا کہ سواری کوئی نہیں۔ میں نے کہا مولانا ہمارے پیر تو سلامت ہیں۔ مکہ یہاں سے دور ہی کتنا ہے صرف تین میل کا فاصلہ ہے کہنے لگے ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ پھر میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ اُن کو دیکھ کر چار پانچ آدمی اور ساتھ ہو گئے۔ خدا کی قدرت ہم منیٰ کے بازار ہی میں پہنچے تھے کہ ایک لاری تیار مل گئی ایک روپیہ فی کس کرایہ تھا۔ فوراً بیٹھ گئے اور ۱۵ منٹ میں مکہ معظمہ کے اندر داخل ہوئے جاتے ہی طواف زیارت کیا اور طواف کی رکعتیں پڑھ کر عصر کی نماز جماعت سے ادا کی پھر منیٰ کو واپس ہوئے اس وقت کوئی لاری نہیں ملی اونٹ کرایہ کیا گیا جس کا کرایہ ۴ر تھا مغرب منیٰ کی حد میں پڑھی اور مکان پر پہنچکر عشا پڑھی مستورات کا طواف زیارت ۱۲ ذی الحجہ پر موقوف رکھا گیا۔ منیٰ کا قیام بہت پر لطف تھا اور سرکاری انتظام بھی اعلےٰ درجہ کا تھا بازاروں میں اور گلی کوچوں میں سپاہی برابر کھڑے ہوئے تھے تاکہ کسی کو تکلیف نہو۔ ۱۱۔ ذی الحجہ کو میں نے زائد قربانیاں کیں۔ ۸ بکرے تو ذبح ہی میں فقراء کو دیدے ایک دُنبہ صاف کرا کر مزدور کے سر پر رکھوا کر مکان پر لا رہا تھا کہ بازار کے ہجوم پر پہنچکر

مزدور ہماری نگاہ سے اوجھل ہوگیا۔ پھر اُس کا پتہ ہی نہ چلا۔ میں نے سپاہی سے شکایت کی۔ اُس نے پوچھا مزدور کا نام اور اُس کی زنبیل کا نمبر یاد ہے؟ میں نے کہا یہ تو ہم نے دریافت نہیں کیا تھا۔ کہا منٰی میں ہر مزدور کی زنبیل پر نمبر لگا ہوا ہے اگر نمبر نوٹ کر لیتے تو ابھی پتہ لگ جاتا۔ پھر بھی سپاہی نے ایک دو مزدوروں کو لٹو کا مگر جب ہم نے خود کہا کہ یہ وہ مزدور نہیں ہی تو چھوڑ دیا۔ تمام سفرِ حجاز میں ہمارا صرف یہی ایک نقصان ہوا اور وہ بھی اپنی غفلت کی وجہ سے کہ قلی کا نمبر نوٹ نہیں کیا تھا۔

مزدلفہ اور منٰی میں حکومت کا انتظام

یہ بھی سُنا گیا کہ مزدلفہ میں بعض حاجیوں کے ہینڈ بیگ چوری ہوگئے۔ جن میں بہت رقم تھی۔ مگر منٰی پہنچنے تک سپاہیوں نے چوروں کو گرفتار کر لیا۔ جس پر قاعدہ شرعی کے موافق ثبوت ہوگیا۔ اُس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ جو منٰی کے بازار میں جمرہ وسطی کے متصل منظرِ عام پر لٹکا دیا گیا تھا۔ اور جن پر کافی ثبوت نہیں ہوا اُن کے فوٹو لیلئے گئے اور سپاہیوں کو دیدیے گئے۔ کہ یہ لوگ آیندہ سرزمین حجاز میں داخل نہ ہو سکیں۔ اس سے زیادہ بہتر اور کیا انتظام ہوگا؟ یہ بھی معلوم ہوا کہ جن حضرات کا مال چوری ہوا تھا۔ اُن کا مال زیادہ تر وصول ہوگیا۔

ام القریٰ میں ہفتہ وار لقطات (گری پڑی چیزوں) کی فہرست شائع کی جاتی ہی کہ محکمہ لقطات میں اتنی چیزیں محفوظ ہیں۔ جس کی جو چیز ہو علامت بتلا کر لیجائے۔

یہ بات عجیب تھی کہ منٰی میں جہاں کسی وقت پانی کا قحط رہتا تھا آجکل موٹر لاری کے ذریعہ صبح و شام چھڑکاؤ ہوتا تھا کہ گرد جم جائے اور حجاج کو غبار سے تکلیف نہو۔ مسجد خیف کے قریب سرکاری شفاخانہ بھی تھا جہاں بیماروں کا مفت علاج ہوتا تھا۔ حج کے ہفتہ میں مکہ اور منٰی میں بہت زیادہ اجتماع ہوتا ہے۔ مگر ام القریٰ کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ اس ہفتہ میں کل بیمار ۱۸۴ تھے جن میں زیادہ تر معمولی بخار وغیرہ کے مریض تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کے چوٹ لگ گئی تھی۔ ۱۸۴ میں سے اس ہفتہ میں کل ۱۸۔ اموات ہوئیں۔ قیام منٰی میں ہم نے اپنے خیمہ ہی میں نمازیں جماعت سے ادا کیں۔ کیونکہ مسجد خیف ہماری

قیامگاہ سے دور بھی۔

مسجد خیف کی زیارت ایک روز عصر کے بعد مسجد کی زیارت کو گئے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں نماز پڑھی ہے اور بہت انبیاء علیہم السلام وہاں مدفون ہیں۔ مسجد کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ جابجا چولھے چڑھے ہوئے اور ہانڈیاں پک رہی تھیں!

حکومت سعودیہ کو مشورہ حکومت سعودیہ نے سب کچھ کیا مگر مسجد کا انتظام کچھ نہ کیا آیندہ اس کا انتظام کافی کرنا چاہیے کہ مسجد میں کوئی کھانا نہ پکا سکے اور مسجد کے قریب کوئی بول و براز بھی نہ کر سکے۔

مسجد عقبہ کی زیارت ۱۱۔ ذی الحجہ کی صبح کو مسجد عقبہ کی زیارت کی جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار مدینہ سے حمایت و اشاعت اسلام پر جان و مال فدا کرنے کی بیعت لی تھی اور پہلی مرتبہ چھ انصاریوں نے اور دوسرے سال ستر نے اس کام کیلئے تمام عالم سے مقابلہ کرنیکا بیڑا اُٹھایا تھا۔ ساڑھے تیرہ سو برس گذر جانیکے بعد بھی اس مسجد پر ایسے انوار برستے ہیں کہ وہاں جا کر پھر نکلنے کو جی نہیں چاہتا طمانیت اور سکینہ و انشراح قلب کے الفاظ سُنے ہوئے تو پہلے بھی تھے۔ مگر ان کی حقیقت مسجد عقبہ میں جا کر معلوم ہوئی۔ اللہ اللہ پہاڑیوں کے دامن میں آبادی سے الگ ایک گوشہ میں چھپا ہوا کیسی بابرکت مقدس جگہ ہے جس کی یاد ہمیشہ دل کو تڑپاتی رہتی ہے!

منحر اسمٰعیل کی زیارت پھر منحر اسمٰعیل کی زیارت کو گئے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے محبوب بیٹے کے گلے پر خدا کے حکم کی تعمیل میں چھری رکھدی تھی۔ اس مقام کی پہلے اور صورت تھی مگر اب حکومت سعودیہ نے توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا ہے۔ کیونکہ عوام وہاں جا کر بدعات کا ارتکاب کرتے تھے۔ اور اب بھی بہت لوگ تین چار پتھر اوپر تلے وہاں رکھ آتے ہیں کہ یہ قیامت میں ہماری گواہی دیں گے۔ اسی سال کسی مقام پر زیارت کیلئے جانے کی بندش نہ تھی ہاں سپاہی ہر جگہ تعینات رہتے تاکہ لوگ شرک و بدعت کا ارتکاب نہ کریں۔

مکہ کو واپسی

۱۲۔ ذی الحجہ کو بعد ظہر کے رمی جمار سے فارغ ہو کر مکہ معظمہ کا ارادہ کیا میں نے دیکھا کہ اس وقت بھی اونٹوں کا ہجوم زیادہ ہے اور شغدفوں کے لڑنے کا خطرہ ہے اس لئے اونٹوں کو خالی چھوڑکر اور چند رفقاء کو حفاظت سامان کے لئے انکی ہمراہ کر کے مستورات کو گھوڑا گاڑی میں سوار کیا جس کا کرایہ منی سے مکہ تک چار فی کس تھا۔ ایک گھنٹہ سے کچھ زیادہ میں مکہ پہنچے اور فوراً ہی مستورات کو طواف زیارت کرایا۔ پھر عصر کی نماز جماعت سے ادا کی ÷

جنۃ المعلی

اگلے دن ۱۳۔ ذی الحجہ کو جنۃ المعلیٰ کی زیارت کی یہاں قبے تو سب گرے ہوئے تھے ہی مگر کسی قبر کا نشان بھی نہ تھا۔ قبوں کے گرانے سے اینٹوں اور پتھروں کا جو ڈھیر لگ گیا تھا وہ بدستور اپنی حالت پر تھا۔ اس منظر سے بہت لوگوں کے دلوں پر چوٹ لگتی تھی اور عام طور پر لوگوں کو شبہ ہوتا تھا کہ حکومت سعودیہ کے دل میں حضرات صحابہؓ و تابعین کا احترام نہیں ہے۔ ورنہ قبروں کے اوپر سے پتھر کی چٹانوں کو ہٹا کر کچا نشان ہی بنا دیا جاتا جیسا مدینہ میں جنۃ البقیع کی قبروں کا نشان قائم کر دیا گیا ہے۔

حکومت سعودیہ کو مشورہ

میں یہ تو نہ کہونگا کہ حکومت سعودیہ کے دل میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ اور اجلۂ صحابہ و تابعین کا احترام نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ جنت المعلیٰ کی صفائی سے غفلت برتی گئی ہے ضرورت ہے کہ بہت جلد یہاں بھی جنۃ البقیع کی طرح پتھر کی چٹانوں کو الگ کر کے اجلۂ صحابہ و تابعین کی قبروں کو سرخ کنکریاں بچھا کر محفوظ کر دیا جائے میرے جد روحانی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی نور اللہ مرقدہ کا مزار بھی اسی متبرک قبرستان میں ہے مگر بے نشان ہے۔ بعض احباب نے خاص علامت سے اس کو محفوظ کر رکھا ہے۔ جو انہیں کے ذریعہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ ایک واقف کار میرے ساتھ تھے اس لئے پتہ چل گیا۔ ورنہ پتہ ملنا دشوار تھا۔ ۱۴۔ ذی الحجہ کو عمرہ کیلئے تنعیم پر گئے ۸ر گدھا کرایہ کیا اور دو ڈھائی گھنٹہ میں فارغ ہو کر کپڑے بدل لئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لاری بھی ۸ر فی کس کرایہ لیتی ہے مگر ہم کو گدھے کی سواری ہی میں لطف آیا۔ کیونکہ ساتھیوں میں ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ میرا گدھا اپنے ساتھی سے آگے رہتا تھا۔ تو

بہت خوشی ہوتی تھی۔ آج جمعہ تھا خطیب نے بہت پرزور خطبہ دیا جس میں حجاج کو نصیحت کی گئی تھی کہ جس دولت سے تمکو اللہ تعالیٰ نے سرفراز کیا ہے اُس کی لاج رکھنا اور عمر بھر اس دولت کے شکریہ میں اعمال صالحہ سے اپنے کو مزین اور گناہوں سے پاک رکھنے کا اہتمام کرتے رہنا پھر جہاد کی ترغیب دی گئی تھی جس کا سبب غالباً نجد و یمن کی آویزش تھی جہاد کا بیان بہت پرجوش تھا جس کے اثر سے نجدی سپاہیوں کے چہرے جوش میں سُرخ ہو رہے تھے سمجھنے والے ہندی بھی بہت متاثر تھے۔

اُسی روز شام کو مولانا محمد شفیع الدین صاحب سے اُن کے مکان پر ملنے گیا۔ نذر بھی پیش کی جو میری بھتیجی نے بھیجی تھی۔ چونکہ ۱۶۔ ذی الحجہ کو ہماری روانگی طے پائی تھی اس لئے ۱۵۔ ذی الحجہ کو طواف اور عبادت کیلئے مخصوص کر لیا گیا۔ ہمارے بعض رفقاء نے رات بھر طواف کیا مستورات بھی رات کے زیادہ حصہ میں طواف کرتی رہیں ۱۶۔ ذی الحجہ کی صبح کو نماز کے بعد سامان باندھ کر تیار کر دیا گیا کیونکہ ہندوستانی ناظم سے دس بجے موٹر لاری کے آنے کی خبر تھی۔

طواف الوداع

سامان سے فارغ ہوئے تو طواف الوداع کیلئے حرم میں حاضر ہوئے اس وقت کی کیفیت نہ پوچھئے طواف الوداع کرتے ہوئے سنگدل سے سنگدل بھی پانی ہو جاتا ہے۔ بیت اللہ سے مفارقت کے تصور ہی سے کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ طواف سے فارغ ہو کر ملتزم پر آئے۔ دروازہ کعبہ سے رخسارے ملے آنکھوں سے غلاف کو لگایا اور جو کچھ مانگنا تھا مانگا۔ میزاب رحمت پر گئے مقام ابراہیم و حجر اسود پر پہنچے حطیم میں نمازیں پڑھیں۔ زمزم سے سیراب ہوئے۔ پھر گھر پر آئے۔ موٹر آنے کا وقت ہو گیا تھا مگر نہ آیا۔ دس کے بعد بارہ بجے ظہر کی نماز کا وقت آگیا۔ حرم میں نماز پڑھی نفلی طواف بھی کیا۔ پھر عصر کی نماز پڑھی۔ مگر موٹر کا پتہ نہ تھا۔ چونکہ اسباب بالائی منزل سے اُتار کر نیچے دروازہ میں جمع کر دیا گیا تھا۔ اُس حفاظت کا بھی خیال تھا اور حرم میں حاضر رہنے کو بھی دل چاہتا تھا کہ جتنی دیر تک بیت اللہ سامنے ہے غنیمت ہے۔

مکہ سے جدہ کو روانگی

مغرب کیوقت خبر آئی کہ موٹر آگیا ہے۔ مغرب کی نماز پڑھ کر مکان پر آیا تو رفقاء نے مجھ سے پہلے ہی تمام سامان موٹر پر

لاد دیا تھا میں نے مستورات کو سوار کیا اور معلم سے باز پرس کی کہ صبح دس بجے کا وقت بتلایا گیا تھا۔ اتنی دیر تک ہمکو کیوں پریشان کیا گیا معلم نے جواب دیا کہ جس کمپنی کا موٹر آپ کیلئے معین تھا وہ صبح ہی جدہ سے روانہ ہوچکا تھا اگر راستہ میں فیل نہو جاتا تو دس بجے ضرور پہنچ جاتا۔ جب ۱۲ بجے تک بھی نہ پہنچا۔ تو میں سلطان سے شکایت کرنے گیا۔ سلطان سو رہے

سلطانی عنایات

تھے ظہر کے بعد گیا تو سلطان نے اپنے موٹروں میں سے ایک موٹر آپ کیلئے روانہ کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ چنانچہ وہ حاضر ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ واقعی معلم کا بیان صحیح ہے۔ کیونکہ موٹر بہت بڑا تھا۔ کمپنی کے موٹر ۱۵ سواریوں کیلئے اتنے بڑے نہیں ہوتے۔ یہ موٹر ۱۵ سواریوں کیلئے بھیجا گیا تھا مگر اس میں ۲۰ کی گنجایش تھی اور دونوں سٹوں کے درمیان سامان کیلئے بہت وسیع جگہ تھی میں نے چاہا کہ اندر سٹ پر سات سات آدمی فراغت سے بیٹھ جائیں اور میں ڈرائیور کے پاس آگے بیٹھ جاؤں مگر ڈرائیور نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ موٹر بہت بڑا ہے آپ اندر ہی بیٹھے رہیں۔ باب الزیادۃ کے پاس سے موٹر روانہ ہونیکو تھا۔ کہ مولوی اسمٰعیل صاحب ملیح آبادی سے جو مدرسہ جامع العلوم کانپور میں میرے سامنے تعلیم حاصل کرتے تھے اور آجکل مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے مددگار مہتمم اور ایک عطارہ کی دوکان کے مالک ہیں۔ دوکان ہی پر ملاقات ہوئی دیکھ کر لپٹ گئے۔ زمانہ طالب علمی کے احباب جب کبھی مل جاتے ہیں روح کو بہت مسرت و انبساط حاصل ہوتا ہے۔ کچھ دیر اُن سے باتیں ہوتی رہیں مجھے زکام کھانسی کی شکایت تھی اُنھوں نے فوراً اپنی دوکان سے گولیاں نکال کر دیں پھر معلم صاحب سے آخری مصافحہ ہوا اُن کی عنایات کا شکریہ ادا کیا اور ڈریور کو موٹر چلانے کی اجازت دی موٹر روانہ ہوا تو یہ تصور سوہان روح بنا ہوا تھا کہ اب زمین حرم چھوٹتی ہے مکہ نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے دیکھئے پھر بھی یہاں آنا مقدر میں ہے یا نہیں۔

حکومت کا انتظام

چند منٹ میں موٹر مکہ کے دروازہ پر پہنچ گیا۔ جہاں پولیس کی چوکی تھی اور سواریوں کو شمار کیا جاتا ہے شمار کرنیوالے نے جب یہ دیکھا کہ موٹر کی ایک سیٹ پر آٹھ آدمی اور ایک پر سات ہیں تو اُس نے

ڈرائیور سے کہا کہ یہ صورت عدل کے خلاف ہے ہر سیٹ پر برابر آدمی ہونے چاہئیں اور ایک آدمی تمہارے پاس باہر ہونا چاہیے" اب ڈرائیور مجبور ہو کر کہنے لگا کہ وہ شیخ کون ہیں جو باہر میرے پاس بیٹھنا چاہتے تھے وہ باہر آجائیں چنانچہ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس کے پاس آبیٹھا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ میں منزل شمیسیہ آئی اور وہاں سے روانہ ہو کر اعلام الحرم حرم کی حدود کے نشانات نظر آئے اُس وقت بیساختہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ کہ اب ہم حد حرم سے باہر ہوئے جاتے ہیں ؎

سلامٌ علی ارض ومن حل بالارض وان کان تسلیمی من العبد لا یجدی

بل انشاء اللہ یجدی زبان سے نکلا"

اب چاند نکل آیا تھا اور چاندنی رات میں مکہ کی پہاڑیاں عجیب لطف دے رہی تھیں۔ اس کے بعد منزل بحیرہ آئی اور یہاں ہم نے عشا کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد چائے پی۔ تو قہوہ خانہ میں صالح سے ملاقات ہوئی جو مدینہ جاتے ہوئے ڈریور کا معاون تھا بہت محبت سے ملا اور حج کی مبارکباد دیکر چائے کی پیالی پیش کی" یہاں سے روانہ ہوئے تو موٹر نے بہت تیزی کے ساتھ چلنا شروع کیا راستہ میں بہت لوگ اونٹوں پر۔ گدھوں پر اور کچھ پیادہ چلتے ہوئے نظر آئے۔ وہ بھی جدہ جا رہے تھے۔ تقریباً بارہ بجے جدہ پہنچے۔ مگر ڈرائیور کو مکان معلوم نہ تھا۔ اُس لئے گھنٹہ بھر تک جدہ کی گلیوں میں ادھر سے اُدھر چکر لگانا پڑا۔ بڑی دقت سے مکان ملا تو وکیل جدہ نے ہمارا استقبال کیا۔ مستورات کو سب سے پہلے اُتارا پھر سامان اوپر پہنچایا" اُسی وقت وکیل نے پاسپورٹ ہم سے مانگا۔ اور

جہاز کا انتظام

بتلایا کہ سب سے پہلا جہاز کراچی جانیوالا خسرو ہے وہ تو بھر چکا اُس میں مطلق گنجایش نہیں اب یا تو آپ جہانگیر میں بمبئی کو جائیں یا رحمانی میں کراچی کو۔ ہمنے کہا کہ جانا تو کراچی کو ہے اگر خسرو میں جگہ مل جائے اچھا ہے ورنہ رحمانی ہی میں جائیں گے ہم اتوار کی رات کو جدہ پہنچے۔ خسرو بدھ کو روانہ ہونیوالا تھا اور رحمانی جمعرات کو۔ اس لئے ہمنے رحمانی ہی کو اختیار کیا۔ خسرو میں جگہ نہ مل سکنے کا کچھ افسوس بھی ہوا۔ مگر ہندوستان پہنچکر معلوم ہوا کہ اس میں نہ آنا ہی اچھا ہوا کیونکہ خسرو

راستہ میں چار پانچ دن تک سخت طوفان کا سامنا رہا جس سے حاجیوں کو بہت تکلیف ہوئی۔ اور رحمانی جہاز کو سمندر ایسا ساکن ملا جیسا تالاب ہوتا ہے کہ پانی میں لہر تک بھی نہ تھی جمعرات کی صبح کو نماز سویرے پڑھ کر سامان گاڑی پر لاد کر مستورات کو ساتھ لیکر جہاز پر

جہاز پر سوار ہونا

سوار ہونے چلے۔ جبھی پر معلوم ہوا کہ کنارہ پر پہنچنے کیلئے صرف ایک دروازہ رکھا گیا ہے جس میں سے سب حجاج کا نکلنا بڑی زحمت کا سبب ہوگا چنانچہ زحمت کا سامنا ہوا اور بدقت تمام کنارہ پر پہنچے۔ جہاں بہت سی کشتیاں حکومت کی طرف سے کھڑی ہوئی تھیں، مگر ہمنے ایک موٹر لانچ کو اختیار کیا تاکہ جہاز پر جلدی پہنچ جائیں جو کنارہ سے چار پانچ میل کے فاصلہ پر کھڑا تھا، جس موٹر لانچ میں ہم سوار ہوئے وہ کسی حاجی نے سالم کرایہ کر لیا تھا۔ اُس کی مستورات بھی اُس میں موجود تھیں۔ ہم نے قدم ہی رکھا تھا کہ مردوں نے ہمارے مردوں کو اور عورتوں نے ہماری عورتوں کو دھکے دینا شروع کئے کہ یہ تو سالم ہمارے کرایہ میں ہے تم کہاں سے آگھسے، اس تو تو میں میں کی مجھے اصلاً خبر نہیں ہوئی۔ کیونکہ مجھ سے کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ مگر خود بخود میرے دل نے اس لانچ کو ناپسند کیا کیونکہ تنگی بہت تھی میں نے فوراً دوسری لانچ والے کو آواز دی وہ فوراً اپنی موٹر لانچ کو ہمارے قریب لایا اور ہم جلدی سے اُس میں سوار ہو گئے۔ مستورات کچھ مجھ سے پہلے سوار ہو گئیں میں سمجھا کہ بھتیجی بھی سوار ہو گئی ہوگی کیونکہ وہ دوسری مستورات سے زیادہ تیز اور چست تھی اُس کی بچی منیفہ پہلے سے میری گود میں تھی مگر جب لانچ روانہ ہو گئی تو دیکھا کہ میری بھتیجی پہلی لانچ میں رہ گئی ہے۔ میں نے دوسری لانچ کے ڈرائیور کو سختی سے روکا کہ جلد پیچھے لوٹو میری بھتیجی پہلی لانچ میں رہ گئی ہے۔ وہ بیچارا فوراً واپس ہوا۔ اور جب بھتیجی کو میں نے اپنے پاس بٹھلا لیا تب اطمینان سے روانہ ہوئے۔ آدھ گھنٹہ میں جہاز پر پہنچے۔ اُس وقت جہاز بالکل خالی تھا اچھی جگہ مل گئی اور ہمنے قبضہ جما لیا۔ سامان ہمارے ساتھ نہ آیا تھا وہ پیچھے دو آدمیوں کے ہمراہ تھا۔ جو سرکاری کشتی میں بعد کو پہنچا۔ جہاز میں جگہ پر قبضہ کر کے اب یہ فکر ہوا کہ مستورات نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا۔ گود کی بچی بھی بھوکی ہے۔ کھانے پینے کا سامان دیر میں پہنچے گا ناشتہ کی کیا سبیل کی جائے۔

جہاز میں ہوٹل اور کھانے کا انتظام

فوراً خیال آیا کہ جہاز میں ہوٹل ہے وہاں سے کچھ خریدنا چاہیئے۔ چنانچہ ہوٹل والے سے مستورات کیلئے چار پیالہ چائے اور چار بسکٹ پہنچانے کو کہا وہ بیچارہ اُسی وقت ایک سینی میں چائے کے پیالے اور بسکٹ رکھکر لایا سب نے اطمینان سے ناشتہ کیا اس وقت مجھے جہاز میں ہوٹل قائم کرنے والوں کی قدر ہوئی کیونکہ اگر پہلے کی طرح حاجی خود اپنی خوراک کے ذمہ دار ہوتے تو ہمکو آج دن بھر بھوکا رہنا پڑتا۔ شام کو مغرب کے وقت کھانا نصیب ہوتا۔ مگر اب ناشتہ تو فوراً ہی ہوٹل سے مل گیا۔ اور گیارہ بجے جہاز کے ملازموں نے کھانا تقسیم کرنا شروع کردیا۔ میں تو اس انتظام سے بہت خوش ہوں۔ گو کھانا گھر جیسا ہمارے مذاق کے موافق نہیں تھا۔ مگر ایسا خراب بھی نہ تھا کہ اُس کی مذمت میں اخبارات کے کالم سیاہ کئے جائیں۔ تنوری روٹی تھی۔ دنبہ کا گوشت تھا گھی خاصا تھا۔ ہاں آب و نمک ہمارے مذاق کا نہ تھا۔ جہاز کے چھوٹنے کا وقت ۲ بجے سنا گیا تھا۔ مگر روانہ نہ ہوسکا کیونکہ جہاز پر آدھے ہی آدمی پہنچے تھے کہ ساحل جدہ پر ہوا کا طوفان بہت زور سے آیا جس کی وجہ سے سعودی سپاہیوں نے کشتیوں کی روانگی بند کردی۔ ورنہ کشتیوں کے ٹوٹنے اور آدمیوں کے غرق ہو جانے کا خطرہ تھا۔ خدا خدا کرکے عصر کے بعد طوفان باد کم ہوا تو کشتیاں چھوڑی گئیں اور مغرب کے بعد تک سب حاجی جہاز پر آگئے جن کی تعداد چودہ سَو کے قریب تھی۔ مگر رحمانی جہاز بڑا تھا اس لئے کچھ تنگی محسوس نہیں ہوئی۔"

ساحل جدہ سے جہاز کا لنگر اُٹھانا

صبح کو نماز فجر کے بعد جہاز نے لنگر اُٹھایا۔ اور ہم نے جدہ اور زمین عرب کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھکر کہنا شروع کیا ؎

ألا يا صبا نجد متى هجت من نجد — فقد زادني مسراك وجدا على وجد
وقد زعموا أن المحب إذا دنا — يمل وأن النأي يشفي من الوجد
بكل تداوينا فلم يشف ما بنا — على أن قرب الدار خير من البعد

خدا وہ دن پھر نصیب کرے کہ اس مقدس سرزمین کی دوبارہ زیارت ہو اور

دل کے ارمان پورے ہوں - آمین -

رحمانی جہاز کی کیفیت

رحمانی جہاز کراچی کو جارہا ہے - اس لئے اُس میں افغانی اور سرحدی بہت ہیں - جو آپس میں بھی لڑتے ہیں اور جہاز والوں سے بھی - مگر ہمارے قریب جتنے افغانی تھے سب بہت مہذب تھے اُن میں ایک دو عالم بھی تھے - مولانا گل دوست خاں صاحب مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے فارغ التحصیل اور حضرت سیدی و مرشدی مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ اور مولانا ثابت علی صاحب مرحوم اور مولانا عبد اللطیف صاحب ناظم مظاہر علوم کے شاگرد ہیں - آپ کا زمانہ تحصیل وہی تھا جبکہ یہ ناچیز مدرسہ مظاہر علوم میں مدرس تھا - وہ مجھے دیکھ کر پہچان گئے اور بہت محبت سے ملے اور تمام سفر جہاز میں برابر ملتے رہے " بحمد اللہ ہمکو دریا بہت ساکن ملا کسی کو چکر وغیرہ نہیں آیا - البتہ میری بھتیجی کو دو روز کے بعد بخار ہوگیا اتفاق سے حکیم نظیر احمد صاحب خورجوی جہاز میں موجود تھے اُنہوں نے نبض دیکھ کر دوا تجویز کی اور بہت جلد آرام ہوگیا - مگر دو دن کے بخار نے اُسکو اتنا کمزور کردیا کہ جہاز کا سفر اُسکو گراں ہونے لگا حکیم صاحب نے فرمادیا تھا کہ جہاز کا پانی اس کو نہ دیا جائے اس لئے دونوں وقت برف میں ٹھنڈی کی ہوئی لیمن کی بوتل دی جاتی جو اتفاق سے رحمانی جہاز میں ۳ / کو مل جاتی تھی - اکثر جہازوں میں برف نہیں ہوتا تو گرم پانی پی کر طبیعت خراب ہو جاتی ہے - رحمانی جہاز جمعہ کے دن ۵ / اپریل کو جدہ سے چلا تھا قاعدہ سے ۱۴ / اپریل کو کراچی پہنچنا چاہئے تھا - مگر جہاز میں بہت لوگ بیمار تھے اس لئے کپتان نے رفتار کم کر رکھی تھی - کپتان بہت خلیق تھا - روزانہ حاجیوں کو دیکھنے آتا تو ہاتھ کے اشارہ سے سلام کرتا - مزاج پرسی کرتا اور میری نواسی کو گود میں لیکر پیار کرتا تھا - یہ بچی ماشاء اللہ ایسی ہنس مکھ ہے کہ ہر شخص کو دیکھ کر ہنستی اور تماشے کرتی ہے - اس لئے ہر شخص کو اُس پر پیار آتا ہے - کپتان بھی اُس کو گود میں لیلیتا تھا اور جہاز میں جو لڑکی سامنے سے گذرتی وہ اُس کی ساتھ کچھ دیر کھیلتی اور ہنستی رہتی تھی - ایک افغانی لڑکی کو اس سے ایسی محبت ہوگئی تھی کہ اپنے باپ کو بلا کر لائی کہ دیکھو یہ بچی کیسی اچھی ہے - اُس کے باپ نے اس کو

مٹھائی لاکر دی۔ مدینہ منورہ میں ایک مصری لڑکی کو اس سے بہت محبت ہو گئی تھی وہ گود میں لیکر گھنٹوں اسے کھلاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال رہا کہ اس شیر خوار بچی کو سارے سفر میں کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔ مجھے زیادہ تر اسی کا فکر تھا کہ خدا کرے یہ خیریت سے گھر پہنچ جائے اور اسی لئے مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ میں جی بھر کر قیام نہ کر سکا۔ الحمدللہ بچی اور اُس کی والدہ اور سب رفقاء اچھے رہے۔

کراچی پہنچنا

۱۶۔ اپریل کو ہم کراچی پہنچے۔ دس بجے جہاز کنارہ لگا۔ حاجی عبدالغنی صاحب چیرمن حج کمیٹی جہاز ہی پر آگئے تھے۔ انہوں نے تاکید کی کہ اُترنے میں جلدی نہ کرو ہجوم کم ہونے دو۔ چنانچہ ہم سب کے اخیر میں مستورات کو لیکر اُترے کنارہ پر پہنچکر دیکھا کہ حاجی اسپیشل ٹرین اسی جگہ جہاز کے متصل کھڑی ہے ہم نے حاجی صاحب سے کہا کہ کسٹم والوں سے جلد نجات دلایئے اور ٹکٹ کا بندوبست کر دیجئے حاجی صاحب موصوف نے فوراً ایک انگریز کو بلاکر ہمارا سامان پاس کرا دیا اور اُسی وقت سہارنپور کے ٹکٹ بھی خود ہی لا دیے۔ حاجی صاحب کیلئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں ایسے ہی چیرمین حج کمیٹی اور پیدا کریں تو حجاج کو سفر حج آسان ہو جائے۔ اللہ تعالےٰ موصوف کے مدارج میں رفعت اور تجارت میں برکت اور دنیا و آخرت میں روز افزوں ترقی عطا فرمائیں۔ آمین۔ اب ہم نے اُسی جگہ سامان کو وزن کرا کر بک کرایا کچھ اپنے ساتھ رکھا کچھ برگ میں دیدیا۔ ۱۲ بجے حاجی اسپیشل ٹرین میں سوار ہوئے۔ اس ریل میں ہوٹل بھی تھا۔ اور کنارہ پر حج کمیٹی کی طرف سے برف کے پانی کا انتظام تھا جو حاجیوں کو مفت دیا جا رہا تھا۔ گاڑی میں بیٹھکر ہمنے ہوٹل سے کھانا خریدا۔ ظہر کی نماز پڑھی ۳ ½ بجے گاڑی روانہ ہوئی۔ کراچی اسٹیشن پر پہنچکر ہم نے اس گاڑی کو چھوڑ دیا۔ کیونکہ یہ پسنجر ٹرین تھی جو دیر میں سہارنپور پہنچنے والی تھی ہمنے کراچی میل کو لیا۔ جو رات کو ۸ بجے روانہ ہوا۔ اگلے دن ۸ بجے رات کو لاہور پہنچے اُسی وقت فرنٹیر میل تیار تھا۔ اُس میں سوار ہو گئے۔ چونکہ میری بھتیجی جہاز کی دوروزہ علالت سے کمزور ہو گئی تھی اُس کا تقاضا تھا کہ جلد گھر پہنچو۔ اس لئے سکھر۔ سندھ۔ اور لاہور کے احباب کو اطلاع نہ کر سکا جس کیلئے میں اُن سے معافی کا طالب ہوں۔ کراچی سے سہارنپور۔ تھانہ بھون۔

کیرانہ کو تار دیدیا تھا۔ فرنٹیر میل رات کے ۳ بجے سہارنپور پہنچا۔ اسٹیشن پر برخوردار عمر احمد سلمہ
مولوی محمود رنگونی سلمہ اور اُن کے بھائی عزیزم حافظ سلیمان سلمہ اور مولوی جمیل احمد سلمہ مولوی
ظہور الحسن صاحب سلمہ اور بہت سے احباب موجود تھے۔ تھانہ بھون سے حضرت حکیم الامۃ دام مجدہم
کی اہلیہ صغریٰ۔ میری بھتیجی کی والدہ اور مولوی عمر احمد سلمہ کی والدہ اور اُن کے ماموں حافظ
ناظر حسن صاحب سلمہ اور بہت سے عزیز آگئے تھے۔ یہ بھی سب اسٹیشن ہی پر موجود تھے میرا چھوٹا
بچہ برخوردار قمر احمد سلمہ اور اُس کی چھوٹی بہن منجھلی بہن بڑی بہن بھی اسٹیشن پر تھی۔ غرض سہارنپور
ہی میں سارے گھر والے مل لیئے۔ اب اسٹیشن سے بابو عبد العزیز صاحب کے مکان پر گئے جو اسٹیشن
سے ملا ہوا ہے اور اُنہی کے مکان پر ہمارے گھر والے تھانہ بھون سے آکر ٹھیرے ہوئے تھے
کیونکہ بابو صاحب اور اُن کی اہلیہ حضرت حکیم الامۃ دام مجدہم کے مخلص خدام میں سے ہیں ابھی
تک صبح نہ ہوئی تھی۔ ہم لوگوں نے تہجد کی نماز پوری کی۔ سامان کو دیکھ بھال کر رکھا۔ پھر احباب نے
دعا کی درخواست کی تو سب حاجیوں نے اُن کیلیئے دعا کی۔ اتنے میں صبح کی اذان ہوگئی۔
اسٹیشن ایس ایس ریلوے کی مسجد میں نماز پڑھی۔ نماز کیوقت تک اور بھی احباب ملنے آگئے
تھے دعا کی پھر درخواست کی گئی جس کو پورا کیا گیا۔ نماز کے بعد مولانا عبد الرحمن صاحب کیملپوری
صدر مدرس مظاہر علوم مولانا عبد الشکور صاحب اور بعض دیگر احباب ملنے آگئے۔ حضرت
مولانا عبد اللطیف صاحب ناظم مظاہر علوم سے ملنے کیلیئے میں خود مدرسہ میں گیا مولٰنا اس
وقت حدیث کا درس دے رہے تھے۔ مولانا بڑی محبت اور عنایت سے ملے۔ پھر فرمایا میں تو
خود اسٹیشن پر آنے کو تھا مگر یہ ارادہ کر رہا تھا کہ حدیث کا سبق پڑھا کر چلوں گا۔ پھر مولانا
کے ارشاد سے طلبۂ حدیث کیلیئے بھی دعا کیگئی ایک گھنٹہ کے بعد اسٹیشن پر واپس آگیا
بابو عبد العزیز صاحب نے کھانا تیار کرا لیا تھا کھانا کھا کر ایس ایس ریلوے کا ٹکٹ خریدا
اور ریل میں سوار ہو کر تھانہ بھون کا قصد کیا۔ گیارہ بجے گاڑی اسٹیشن تھانہ بھون پر پہنچی
پلیٹ فارم پر حضرت حکیم الامت دام مجدہم مع جماعت خانقاہ کے تشریف فرما تھے
جن میں مولوی شبیر علی صاحب مدیر النور اور خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب مولوی ہمی اللہ
صاحب وغیرہم بہت احباب شامل تھے۔ بہت سے اعزہ پلیٹ فارم پر موجود تھے۔

سب سے پہلے حضرت حکیم الامت سے معانقہ ومصافحہ ہوا۔ حضرت اس وقت بہت زیادہ مسرور تھے اور خاص توجہ ہمارے حال پر فرما رہے تھے۔ اسٹیشن تھانہ بھون کے زنانہ مسافرخانہ میں بہت سی مستورات بھی میری بھتیجی کے استقبال کو موجود تھیں۔ تھوڑی دیر مسافرخانہ میں ٹھیرے اور یہاں ہی سب حاجیوں نے ملکر سب کے لیئے دعار کی پھر گاڑیوں میں مستورات کو سوار کرکے مکان پر پہنچے اعزہ واحباب دیر تک ملنے کو آتے رہے۔ آج ۲۱ اپریل تھی اور بدھ کا دن تھا۔ تمام سفر میں تکان کا احساس نہ ہوا تھا۔ مگر گھر پر پہنچکر تکان محسوس ہوا بدن میں درد رہا دکھن تو نہ تھی ہاں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جسم گویا ہے ہی نہیں۔ صرف روح کام کررہی ہے، کئی روز تک یہی حالت رہی ۲۲ اپریل کو علمار سہارنپور اور علمار دیوبند اور حافظ ہدایت حسین صاحب کانپوری۔ نواب جمشید علی خاں صاحب رئیس باغپت ممبران کونسل یوپی اور حاجی وجیہ الدین صاحب ممبر اسمبلی شیخ رشید احمد صاحب تاجر اسلحہ دہلی تھانہ بھون میں مسودہ وقف بل پر غور کرنے کے لیے مجتمع ہوئے۔ احقر بھی اس مجلس میں شریک ہوا۔ ۲۳ اپریل کو کیرانہ مع اہل وعیال کے پہنچا۔ یہاں بھی اعزہ اقربا اور بہت سے احباب ملنے آئے ۸ مئی کو تھانہ بھون واپس آیا۔ ایک دن ٹھیر کر ۹ مئی کی شام کو سہارنپور پہنچا۔ رات کو دیوبند اور مظفرنگر سے قاری حفظ الرحمن صاحب سابق خطیب سورتی جامع مسجد رنگون اور قاری آل احمد صاحب مدرس تجوید مدرسہ نذیریہ رنگون تشریف لائے۔ قاری حفظ الرحمن صاحب سے مل کر دل بہت خوش ہوا موصوف نے عجب لطف کی طبیعت پائی ہے۔ حضرت ناظم صاحب مظاہر علوم سہارنپور کے ارشاد پر ۱۰ مئی کی شب کو جامع مسجد سہارنپور میں بعد عشار کے بیان کیا جس میں حضرات صحابہ کرام اور خلفار راشدین رضی اللہ عنہم کے فضائل بیان کرتے ہوئے اُن اعتراضات کا رد کیا گیا تھا جو شیعہ کی جانب سے کیے جاتے ہیں ۱۱ اپریل کی صبح کو لاہور ہاوڑہ اکسپریس میں کلکتہ کا ٹکٹ لیکر ہمراہی قاری آل احمد صاحب سوار ہوا۔ شام کو جون پور ایک دن کیلئے اُترا کیونکہ وہاں میرے ہم زلف سید علی سجاد صاحب آجکل ڈپٹی کلکٹر ہیں اُنکے بچوں سے اور اپنی ہمشیرہ سے ملکر بہت جی خوش ہوا۔ ڈپٹی صاحب باوجود حاکم ضلع ہونے کے ایسے سادہ واقع ہوئے ہیں کہ صورت دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ ۱۲۰

اپریل کی شام کو جونپور سے روانہ ہو کر کلکتہ پہنچا اور ۱۳ر کی صبح کو النگا جہاز پر سوار ہو کر ۱۵ر کو بعد ظہر رنگون پہنچا جیٹی پر جناب مولانا عبد الخالق صاحب ناظم جمعیت العلماء برما۔ جناب سید عنایت حسین صاحب پرنسپل راندیریہ ہائی سکول مع اسٹاف اور جناب اسمٰعیل محمد یوسف صاحب محمد یوسف کمپنی مرچنٹ اسٹریٹ اور بہت سے احباب تشریف لائے تھے۔

الحمد للہ کہ دو ماہ اور تین دن میں سفر حجاز بخیر و خوبی تمام ہوا۔ ۶ ماہ کی رخصت ختم ہونے میں ابھی ۲۰ دن باقی تھے کہ میں اپنے کام پر رنگون واپس آگیا۔

فالحمد للہ الذی بنعمتہ وجلالہ تتم الصلحت والصلوٰۃ والسلام علی سید الکائنات سیدنا محمد وعلیٰ الہ واصحابہ صلوٰۃ تسبق الغایات۔

سفر نامہ تو ختم ہوا اب چند باتیں متفرق طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں۔

متفرقات

اہل حجاز کے افلاس کا سبب

(۱) اُن اوقاف کا بند ہو جانا جو حرمین کے واسطے مصر، شام، الجزائر، تیونس، ٹرکی وغیرہ میں ہیں۔ صرف مصر کا وقف اتنا بڑا ہے کہ اگر اُس کی پوری آمدنی حرمین کیلئے ہر سال آتی رہے تو مکہ مدینہ میں افلاس کا نام نہ رہے۔ اور اگر شام الجزائر۔ ٹیونس۔ ٹرکی کے اوقاف بھی پہنچ جایا کریں تو اہل حجاز مالا مال ہو جائیں۔ اور یہ اوقاف اس لئے کئے گئے تھے کہ حجاز وادی غیر ذی ذرع (بے آب و گیاہ) ملک ہے۔ اُس کے باشندوں کو باہر سے خام پیداوار حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر افسوس اس وقت مسلمانوں نے حرمین کی طرف سے کچھ ایسی غفلت برتی ہے کہ حرمین کے اوقاف بھی بند کر دیے۔

(۲) حجاج کا کم ہو جانا۔ ظاہر ہے کہ حجاج کی جس قدر کثرت ہوگی اُسی قدر اہل حرمین کی تجارت اور کرایہ مکانات اور کرایہ حیوانات کو فروغ ہوگا۔ دیہات والے ترکاری میوہ جات اور اپنی مصنوعات بیچکر فائدہ اُٹھائیں گے۔

(۳) حجاز ریلوے کا بند ہو جانا۔ کیونکہ اس ریلوے کے ذریعہ سے شام اور

حجاز کے درمیان تجارت کو بہت فروغ ہوگیا تھا۔ بدؤں کے لئے ملازمت کا دروازہ بھی کھل گیا تھا۔

(۴) موٹروں کی کثرت سے اونٹوں کے کرایہ کا کم ہو جانا۔ اس کا اثر بدوؤں پر بہت زیادہ ہوا ہے کیونکہ اُن کی گذر اوقات زیادہ تر اونٹوں کے کرایہ پر تھی اس میں شک نہیں کہ موٹروں کی کثرت سے موٹر کمپنیوں کو۔ حکومت سعودیہ کو بہت نفع ہوا ہی اور حجاج کو بھی آرام ہوگیا ہے کہ مدینہ کے سفر میں بارہ دن جانے اور بارہ دن آنے کی طوالت سے بچ گئے۔ مگر بدوؤں کا تو خاتمہ ہو گیا۔ اس لئے ضروری ہی کہ موٹروں کے کرایہ میں سے کچھ حصہ بدوؤں کو بھی دیا جائے۔ یا اُن کے گذارہ کی کوئی اور سبیل نکالی جائے، اگر کوئی صورت نہ ہو سکے تو کم از کم اُن کو فوج ہی میں بھرتی کر دیا جائے۔ پھر یہ بات بھی سوچنے کی ہی کہ موٹروں سے حکومت سعودیہ کو اتنا نفع نہیں ہوتا۔ جتنا پٹرول اور موٹر لاریوں کے خریدنے میں امریکہ اور یورپ کو نفع ہو جاتا ہے۔ ضرورت اس کی ہی کہ خود حجاز میں پٹرول کے چشمے دریافت کئے جائیں۔ تاکہ گھر کی دولت باہر نہ جائے۔

(۵) تعلیم کا فقدان اور جہل کا غلبہ۔ کیونکہ تعلیم یافتہ آدمی اپنی روزی حاصل کرنے کا کچھ نہ کچھ راستہ نکال لیتا ہے۔ خصوصاً علم دین کا تو خاصہ ہے۔ کہ اُس سے افلاس زائل ہو جاتا ہے

حجاز میں امن اور جلالۃ الملک سے گذارش

آج کل حجاز میں ایسا امن ہی کہ اُس کی نظیر کسی جگہ نہیں مل سکتی۔ باوجود یمن کے ساتھ جنگ چھڑ جانے کے انتظام میں کوئی خلل نہ تھا۔ بارہا مشاہدہ ہوا ہے کہ ایک موٹر لاری سے کسی کا سامان گر گیا۔ تو منزل پر پہنچ کر دوسری موٹر کے ڈرائیور نے مالک کو سامان پہنچا دیا۔

مسجد نبوی اور مسجد حرام کے سامنے ممالک غیر کا سکہ اور نوٹ خریدنے والے ہزاروں کی مالیت کے نوٹ اور گنیاں لئے بیٹھے رہتے ہیں اور جہاں اذان کی آواز سنی اُسی وقت وہ کان پر کپڑا ڈال کر نماز کو چلدئے۔ پھر کیا مجال کہ کوئی کپڑا اُٹھا کر دیکھ بھی سکے

کہ اس کے نیچے کیا ہے۔ یہ اس کا نتیجہ ہے کہ جلالۃ الملک نے حدود شرعی کا اجرا کر دیا ہے۔ حدود شرعیہ دیکھنے میں تو سخت معلوم ہوتی ہیں۔ مگر جرائم کا انسداد اُنہی سے ہوتا ہے۔ متمدن حکومتوں نے جو سزائیں مقرر کر رکھی ہیں اُن سے جرائم کا انسداد نہیں ہوتا حکومت سعودیہ نے اپنی دس سالہ سلطنت میں حجاز کے اندر چودہ پندرہ آدمیوں ہی کے ہاتھ کاٹے ہوں گے مگر وہ جرائم پیشہ قوم جو حرامی اور چور ڈاکو کے لقب سے یاد کی جاتی تھی دفعۃً درست ہو گئی اور اب وہاں شاذو نادر ہی سرقہ کا وقوع ہوتا ہے۔ ڈاکہ اور قتل کا تو نام و نشان تک نہیں رہا۔ اس کے مقابلہ میں متمدن حکومتوں کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ وہاں روز بروز جرائم میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ حجاج کیلئے تو حکومت سعودیہ ایک رحمت آلہیہ ہے مگر اہلِ حجاز کے حق میں اُس کا رحمت ہونا ابھی تک نمایاں نہیں ہوا۔ جس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ حکومت کے کارکن زیادہ تر شامی اور نجدی ہیں اور یہ دونوں اہلِ حجاز کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اُن کی تالیف قلب نہیں کرتے۔ اہلِ حجاز سلطان کی ذات کے بڑے مداح ہیں۔ مگر ارکان سلطنت و حکام زیردست کے عموماً شاکی ہیں اُمید ہے کہ جلالۃ الملک اس مسئلہ پر توجہ فرمائیں گے۔

مصارف سفر میں نے اور میرے رفقاء نے ریل اور جہاز میں تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا تھا اور جدہ سے مدینے اور مدینے سے مکے کا سفر موٹر لاری میں کیا۔ عرفات کیلئے شغدف کرایہ کیا۔ اور مکے سے جدہ کی واپسی موٹر لاری میں ہوئی۔ اس حالت میں ہمارا خرچ فی کس ساڑھے چھ سو روپے ہوا بعض رفقاء کا اس سے بھی کم ہوا۔ اگر مکہ مدینہ اور جدہ کا سفر اونٹ پر کیا جائے تو اس میں سے ڈیڑھ سو روپے کم ہو کر پانچسو روپے میں بخوبی حج اور زیارت مدینے سے فراغت ہو جائیگی۔ اور یہ مقدار کچھ زیادہ نہیں ہے۔ زمانۂ شریف حسین میں بھی فی کس پانچسو روپے خرچ ہوتا تھا۔ اور اگر کسی کے پاس مدینے جانے کیلئے رقم نہو تو۔ صرف حج کیلئے ساڑھے تین سو روپے کافی ہیں۔ جس شخص کے پاس ساڑھے تین سو روپے حوائج ضروریہ اور

نفقہ' اہل وعیال سے فاضل ہو اُس پر حج فرض ہے" مدینے جانا فرض نہیں اور اس کے انتظار میں حج کو موخر کرنا بھی جائز نہیں۔ ہاں جس کے پاس مدینے جانیکے لئے رقم کافی ہو اُسکو مدینے جانا ضروری ہے۔ کیونکہ بعض علماء نے زیارت قبر رسول کو اہلِ وسعت پر واجب کیا ہے۔

اس سال گذشتہ سال سے نسبۃً کچھ حاجی زیادہ تھے۔ مگر حقیقت میں زیادہ نہیے بحری راستہ سے چھبیس ہزار آدمی پہنچے تھے۔ اور خشکی کے راستہ سے اور مکہ مدینہ و قرب وجوار کے سب حاجی ملاکر سوالاکھ کے قریب ہونگے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق دے کہ اس فریضہ کی رغبت اور شوق اُن کے دلوں میں پیدا ہو کہ ایمان کی تکمیل حج ہی سے ہوتی ہے۔

اسباب راحت سفر حج میں زیادہ دشواری زبان کی ناواقفی سے پیش آتی ہے۔ جو شخص عربی زبان جانتا ہو یا جاننے والے کے ساتھ ہو اُس کو بہت راحت ملتی ہے۔ اسی طرح جو شخص سفر میں بخل سے کام لیگا اُسکو بھی تکلیف کا سامنا ہو گا۔ سفر حجاز میں اعتدال سے کام لینا چاہیئے۔ نہ اسراف کرے نہ بخل۔ اور جہاں تک ہوسکے سامان ساتھ کم ہونا چاہیئے۔ ہر جگہ ہر چیز میسر آجاتی ہے۔ زیادہ بوجھ لادنے سے خواہ مخواہ تکلیف ہوتی ہے۔

تبرکات عموماً دیکھا جاتا ہے کہ حجاج تبرکات میں بہت رقم خرچ کردیتے ہیں اور اس کو بھی مصارف حج میں شمار کرتے ہیں۔ حالانکہ تبرکات کا لانا شرعاً کچھ ضروری نہیں۔ اور اس کے ساتھ ضروری کا معاملہ کرنا حد سے تجاوز اور بدعت میں داخل ہے"

اگر تبرکات لائے جائیں تو سب سے بہتر زمزم اور مدینے کی کھجور ہے۔ یہ تو اصل تبرک ہی جس کا لانا اور لیجانا سلف سے منقول ہے۔ خاک شفار کا لانا بھی کسی قدر ثابت ہے۔ باقی اور تبرکات کا لانا فضیلت میں داخل نہیں۔ ہاں جائز ہے جیسے تسبیح رومال جانمازیں اور مسواک مہندی۔ اشنان وغیرہ اور اگران چیزوں کے خریدنے میں امداد

اہل حرم کی نیت کی جائے تو ثواب بھی ہو۔ البتہ غلاف کعبہ اور بیت اللہ یا روضۂ نبوی کی موم بتیاں لانیکے متعلق کسی عالم محقق سے جو قافلہ میں موجود ہو فتویٰ پوچھ لینا چاہئے کیونکہ بعض دفعہ یہ چیزیں خدام حرم کی ملک کردی جاتی ہیں اور بعض دفعہ ملک نہیں کی جاتیں۔ اور کبھی یہ اشیاء مال وقف سے تیار ہوتی ہیں۔ کبھی سلطان کی رقم سے اس لئے اُن کے متعلق ہمیشہ ایک فتویٰ نہ ہوگا۔

اسماء رفقاء

میری ہمراہ ایک تو میری بھتیجی تھی جو برادرم مرحوم مولانا سعید احمد صاحب غفرلہ کی ایک ہی لڑکی ہے اور گود میں شیر خوار بچی بقیدہ خاتون سلمہا تھی جو اس وقت سات مہینے کی ہے۔ اس سے بڑی بچی عبیدہ خاتون سلمہا اس وقت تین سال کی ہے وہ حج میں ہمراہ نہ تھی بلکہ اپنی نانی صاحبہ کے پاس وطن ہی میں رہی۔ میں نے اس سال اپنے بھائی صاحب مرحوم کی طرف سے حج کیا ہے اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں دوسرے منشی لئیق احمد صاحب کیرانوی برادر زادۂ مولانا حبیب احمد صاحب کیرانوی تھے بہت اچھے محاسب ہیں اور بڑے منتظم، آپ سے حساب و انتظام میں ہمکو بہت مدد ملی۔ تیسرے حافظ عبد الستار صاحب اعظم گڈھی تھے۔ جو حضرت حکیم الامت کے خادم ہیں اور اس سے پہلے سات دفعہ حج کر چکے ہیں۔ ذمہ داری کے سارے کام وہی انجام دیتے تھے۔ چوتھے شیخ عابد حسین صاحب تاجر چوب اجمیری دروازہ دہلی تھے۔ آپ بہت با اوقات اور مخلص رفیق تھے۔ پانچویں عزیزم نعمت اللہ خاں پندرہ سالہ نوجوان مع اپنی والدہ کے تھے، اس نوجوان بچہ کی طرف سے فکر تھا کہ اتنا لمبا سفر کیونکر کرے گا مگر ماشاء اللہ اس نے ہر جگہ بہت ہمت اور پھرتی سے کام لیا۔ کبھی گھبرایا نہیں۔ ایک ساماۃ ہمارے وطن کے پاس کی اور تھیں جو میری بھتیجی کی خدمت وغیرہ کیلئے ساتھ ہوگئی تھیں۔ میرے ہموطن مولوی افضل صاحب نبیرۂ مولانا شیخ محمد صاحب محدث تھانہ بھون مع اپنی دو خالہ اور ایک خالو اور ایک خالہ زاد بہن کے بھی جاتے ہوئے کراچی اور جہاز میں ساتھ رہے پھر ہم مدینے چلے گئے وہ مکہ چلے گئے۔ منشی فیاض احمد صاحب تھانوی ایڈیٹر اخبار کشاف مظفرنگر (جو عرصہ ہوا بند ہوچکا ہے) بھی جاتے ہوئے کراچی اور جہاز تک ہمارے ہمراہ رہے

سفرنامۂ حجاز

سید زاہد حسین

(تصنیف ۱۹۳۲ء)

یہ ۱۹۳۱ء کا حجاز کا سفرنامہ ہے، جو ۱۹۳۲ء
میں 'پاپولر پرنٹنگ پریس' الہ آباد، میں چھپا۔ ۱۹۳۲ء
کی ایک تصویر بھی سفرنامہ میں شامل ہے، جس سے
معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔
یہ سیّد زاہد حسین کا سفرنامۂ حج
ہے، جو الٰہ آباد کے رہنے والے تھے۔ حج کے
وقت ان کی عمر تقریباً ۶۵ سال کی تھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

حج کا شوق مجھکو دراصل بہت بچپن سے تھا۔ میری والدہ جنت نصیب بڑی عابدہ تھیں۔ اور جب میں اور میرے بڑے بھائی سید شوکت حسین صاحب قبلہ بہت چھوٹے چھوٹے تھے اُسوقت وہ رات کو بجائے کہانی کہنے کے بزرگان دین کے حالات خاصکر اُن کے اکل حلال اور صدق مقال کے متعلق سنایا کرتی تھیں۔ حج کرنے کا اُنکو بہت ارمان تھا اور اس کے فضائل وہ بہت بیان کیا کرتی تھیں۔ مجھکو خوب یاد ہے کہ اُنکی باتیں سنکر بچپنا ہی میں سفر حج کی اُمنگ دل میں پیدا ہوا کرتی تھی۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو انگریزی تعلیم اور ڈاکٹری تعلیم میں مصروف رہے۔ تیس سال ملازمت کی اور بچپن کا شوق دل سے تقریباً محو ہوگیا۔ سنہ ۲۵ء میں پنشن لینے کے بعد قرآن مجید کو سمجھکر پڑھنے کا شوق جو ایک مدت سے تھا دل کو بہت بے چین کرنے لگا۔ کئی مرتبہ بطور خود مختلف ترجمے اور تفسیریں شروع کی گئیں۔ لیکن بجائے اطمینان حاصل ہونے کے ایک عجیب بے چینی قلب میں پیدا ہوتی تھی اور مطالعہ کا سلسلہ ترک ہو جاتا تھا۔ سنہ ۳۲ء میں ایک روز اتفاقاً ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں ان کی چند تصانیف پیشتر بھی دیکھ چکا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ یہ عربی اور سنسکرت کے بڑے ماہر ہیں اور قرآن مجید کی تحقیق و تحصیل میں اُنھوں نے ہندوستان۔ جرمنی اور انگلستان میں عمر کا بہترین حصہ صرف کیا ہے اور ابتک اُسی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اُن سے ایک سوال قرآن مجید کی کسی آیت کے بارے میں کیا۔ اُنھوں نے فوراً قرآن مجید منگوایا اور اسطرح میرے سوال کو حل کیا کہ مجھکو نہایت درجہ اطمینان حاصل ہوا۔ اوسی وقت چند اور سوالات کئے گئے اور اُنھوں نے براہ کرم سب کے جوابات اس خوش اسلوبی سے دئے کہ میرے سمجھ میں بخوبی آگئے اور سچ تو یہ ہے کہ ایمان تازہ ہوگیا۔ میں نے اب اصرار شروع کیا کہ خدا کے لئے مجھکو قرآن مجید سبقاً سبقاً اور سلسلہ وار سمجھا کر پڑھا دیجئے

اُنھوں نے میری درخواست منظور کی مگر بوجہ کثرت مشاغل طرفین کے نوبت نشست کی بمشکل ہفتہ میں دوبار آتی تھی اور ایک سال میں چھیاسٹھ سورتیں ختم ہوئیں۔ بیان کے سلسلہ میں حضرت رسول کریم کے متعلق میرے مخدوم مولانا پر ایک خاص کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ اونکی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات بیان کرنے لگتے تھے پھر تو اونکو کوئی احساس وقت کا بھی باقی نہیں رہتا تھا اور گھنٹوں یہی ذکر خیر جاری رہتا تھا۔ ۱۹۳۰ء کے ختم ہوتے ہوتے دل کی کچھ ایسی کیفیت ہوگئی کہ اسکا لکھنا محال ہے۔ ہر وقت دیار رسول کریم کی زیارت کا اشتیاق بڑھنے لگا۔ بچپن میں جو کچھ والدہ معظمہ مرحومہ سے سنا کرتا تھا وہ سب تذکرے یاد آنے لگے اور جو شوق زمانہ طفلی سے دل میں دبا ہوا تھا اُس نے ایکبارگی ایک تلاطم پیدا کردیا۔ راتوں کو اکثر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرا پلنگ زمین پر نہیں ہے بلکہ جہاز پر رکھا ہوا ہے اور اُس میں ایک خفیف سی جنبش ہے۔

غرضنکہ ۱۹۳۱ء میں میں نے حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ رسول اللہ کا مصمم ارادہ کرلیا۔ میری راہ میں بہت سی رکاوٹیں بھی تھیں۔ شاہد سلمہ بہت کم سن اور اسکی پرورش اور تعلیم میرے ذمہ۔ ظہیر سلمہ اور بشیر سلمہ دونوں کی صحت خراب اور دونوں زیر علاج۔ لیکن زمانہ حج جسقدر قریب آتا جاتا تھا میری حالت بے اختیاری کی بڑھتی جاتی تھی۔ یہانتک کہ میں نے ۷ مارچ ۱۹۳۱ء اپنے سفر کی تاریخ مقرر کردی۔ ڈاکٹر سید سراج الحسن صاحب سے ذکر آیا وہ بھی تیار ہوگئے اور اونکی معیت میں اونکے خویش شاہ محمد سلیم صاحب بھی آمادہ ہوگئے۔ سفر سے صرف تین دن قبل بشیر حسین سلمہ نے بھائی صاحب قبلہ مولوی سید شوکت حسین صاحب کو تار دیا کہ حج کا ارادہ ہو تو انتظام کیا جائے اُنکا تار آمادگی کا آیا اور دوسرے ہی دن رامپور سے وہ بھی باوجود صحت اچھی نہ ہونے کے آگئے اور اونکا پاسپورٹ بھی فوراً حاصل کیا گیا۔

ساتویں مارچ ۱۹۳۱ء۔ گھر میں اعزا کا مجمع تھا۔ میری دونوں لڑکیوں کی آنکھیں روتے روتے سُرخ لال کی طرح ہوگئیں تھیں۔ بشیر سلمہ پر خاصکر ایک ایسی کیفیت

طاری تھی کہ ہاتھ پیر ٹھنڈے اور بدن بے قابو تھا۔ میں نے کہا کہ اگر تمہاری طبیعت اچھی نہیں ہے تو میں سفر ملتوی کرتا ہوں۔ اسپر وہ بھی دل مضبوط کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے میں نے دو رکعت نماز ادا کی۔ دعا پڑھی اُس کا ترجمہ اُردو میں بہ آواز بلند پڑھتا گیا اور شاہد سلمہ آمیں آمین کہتا رہا۔ دعا ختم ہوتے ہی تمام اعزا اور لڑکیوں کو آبدیدہ چھوڑ کر دن کے قریب تین بجے گھر سے روانہ ہوا۔ اسٹیشن پر احباب اور اعزاء کا ہجوم تھا۔ ان سب سے رخصت ہوتے وقت دل کی جو کیفیت تھی بیان نہیں ہو سکتی۔ تاہم باوجود محبت اولاد اور الفت احباب وطن کے ایک قوی تر کشش اپنی جانب دوسری طرف کھینچ رہی تھی۔ یہاں تک کہ بچوں کو گریاں و پریشان چھوڑ کر منزل مقصود کی دھن میں سب سے رخصت ہوا اپنے سب سے چھوٹے لڑکے شاہد کی بھولی بھالی صورت اور اسکا معصومانہ تبسم اور بہادرانہ استقلال۔ کبھی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آنا کبھی مجکو دیکھ کر پھر بشاش ہو جانا دل میں عجب کیفیت پیدا کرتا رہا اور اسٹیشن سے گاڑی چھوٹنے کے بعد دیر تک مجھپر ایک عجیب عالم طاری رہا۔

گاڑی کے جس حصہ پر ہم لوگوں نے الہ آباد میں قبضہ کر لیا تھا وہ راستہ بھر ہملوگوں کے تصرف میں بلا شرکت غیرے رہا۔ رات کو نیند بہت کم آئی۔ دو مضبوط مقناطیس تھے ایک عرب میں اور ایک الہ آباد میں۔ دونوں کی کشش میرے ناتواں دل پر اپنا اثر ڈال رہی تھی۔

۸ رمارچ ۱۹۳۱ء۔ بہت تڑکے گاڑی اٹارسی پہنچی اور سہ پہر تک انگت پوری اسٹیشن آگیا یہاں سے لوکوموٹیو انجن ٹرین سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اُس کے بجائے بجلی کی قوت سے ٹرین چلنا۔ اس کی حالت بجنسہ ٹریموے کی طرح تھی۔ انجن کی جگہ جو مشین سامنے لگائی جاتی ہے اُس پر چرخیاں لگی ہوتی ہیں جنکا تعلق اوپر کے تار سے مثل ٹریموے کے ہوتا ہے۔ بمبئی تک یہ سفر اسی طرح طے ہوتا ہے۔ چار بجے کے قریب تنگ و تاریک ٹنل ملنے شروع ہوئے۔ کُل نو ٹنل ملے۔ بعض چھوٹے اور تین اچھے خاصے لانبے جنمیں کئی کئی منٹ قطعی اندھیرا رہا اور گاڑی کے اندر برقی بلب روشن کر دئے گئے۔ ساڑھے چھ بجے مع الخیر ہماری پارٹی اسٹیشن وکٹوریا ٹرمینس پر پہنچی۔ اسباب کے اتارنے اور

اُس کے جائے قیام تک روانگی وغیرہ میں قریب ایک گھنٹہ کے صرف ہوا۔ وکٹوریا ٹرمینس سے ذرا قبل بمبئی کا بھائی کلہ اسٹیشن ملتا ہے۔ اس اسٹیشن پر حج کے ایام میں معلّم اور اُنکے ایجنٹ جمع رہتے ہیں اور حجاج کو یہ سبق دیا جاتا ہے کہ بجز انکے اور سب معلّم قابل اعتبار نہ ہونگے لہٰذا انھیں کو معلم کرنا چاہئے۔ ہم لوگوں نے باتیں تو سب کی سنیں مگر زبان کسی سے نہیں ہارے۔ ہم لوگ اسٹیشن سے بذریعہ ٹیکسی مسافر خانہ حاجی سابو صدیق پہنچے دوسری منزل پر ایک کمرہ ہمارے لئے محفوظ تھا۔ کیونکہ میں نے اپنی آمد کی خبر پیشتر سے بذریعہ ڈاک منیجر صاحب مسافر خانہ کو کردی تھی۔

یہ مسافر خانہ ایک پنج منزلہ وسیع خوش قطع عمارت ہے۔ کمرے کشادہ ہوادار ہیں۔ فرش ہر منزل پر ٹائیلز کا ہے۔ پاخانہ اور غسل خانہ میں عمدہ ٹائیلز لگے ہیں لیکن اونکو برتنے کے لئے عموماً لوگوں کو تمیز نہیں ہے اس وجہ سے اکثر گندگی نظر آئی۔ ۸ ر مارچ کی شب سے ۱۲ ر مارچ کی سہ پہر تک ہم لوگ یہاں مقیم رہے۔ ہم لوگوں نے یہاں مچھڑ اور مکھی کا نشان تک نہ پایا۔ اگرچہ صفائی کی حالت بوجہ اژدحام خلقت اچھی نہ رہنے پاتی تھی اور کھانے پینے کی چیزیں اور مٹھائیاں بکثرت جابجا کھلی ہوئی پڑی رہتی تھیں۔ ہمارے کمرے کے نیچے گنے کے رس کی مشین والا آیا کرتا تھا۔ کئی کئی گھنٹہ تک اُسکا رس نکالنے اور لوگوں کے پینے کا سلسلہ جاری رہتا تھا مگر کبھی کوئی مکھی اُس مشین پر یا اُس کے قریب نظر نہ آئی۔ مجھکو اور ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کو مکھی اور مچھر کی عدم موجودگی پر تعجب رہا۔ کوئی وجہ بخوبی سمجھ میں نہیں آئی۔

۹ ر مارچ ۱۹۳۱ء۔ ایک رفیق سفر سے عباس حافظ ابراہیم معلّم کی بہت تعریف سنی اور حسن اتفاق سے عباس ابن حافظ ابراہیم سے آج ملاقات بھی ہو گئی۔ جسوقت سے اُن سے ملاقات ہوئی انکی وجہ سے جو جو آرام ملا اُس کی تفصیل محال ہے۔ مختصر یہ ہے کہ یہ اپنے حاجیوں کے آرام کا بے انتہا خیال رکھتے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں منگوانا اور سواری کا انتظام کرنا تو ایک معمولی بات ہے لیکن بمبئی سے روانگی ایک امر محال ہے اگر معلم اچھا نہ ہو۔ بفضلہ عباس اس صفت میں بے نظیر آدمی ہیں۔ ۱۲ ر مارچ کو

جہاز ہندستاں سے ہملوگوں کی روانگی قرار پائی۔چنانچہ اُس سے ایک روز قبل سے انھوں نے طرح طرح کی چیزیں خود فراہم کرنا شروع کیں۔انڈے۔مرغیاں۔ انگور۔لوکی۔شلجم۔ٹماٹو۔بھنڈی۔پودینہ۔لیموں کاغذی۔سنگترے وغیرہ وغیرہ سب چیزیں بافراط ہملوگوں کے ساتھ ہیں جو عباس نے خود خریدی ہیں۔ وہ صبح سے شام تک کھانے پینے وغیرہ کا انتظام اور خیال رکھتے ہیں۔

آج محافظ حجاج کے دفتر گئے۔اونکے مہتمم صاحب سے ملے۔بھائی جان کو عباس صاحب اپنے ہمراہ لیجا کر ٹیکہ دلا لائے۔جہاز کے دفتر تک میرے ہمراہ گئے۔ٹکٹ کا روپیہ داخل ہوا۔رسید عباس کے حوالہ کی۔دوسرے روز ٹکٹ کا لانا۔پاس پورٹ کا مکمل کرانا۔ٹیکہ کا سارٹیفکٹ لانا یہ سب عباس صاحب نے کیا۔اگرچہ پہلے میں نے درجہ اول میں سفر کرنے کا قصد کیا لیکن حاجیوں کی ضروریات اور تکلیفوں کا اندازہ کرنے کے خیال سے میں نے اپنی رائے بدل دی اور تیسرے درجہ کا ٹکٹ خریدا۔

۱۰ و ۱۱ مارچ سنہ ۱۹۳۱ء۔آج اعلان کیا گیا کہ ۱۱ کو دوپہر کے وقت حاجی اپنا اپنا سامان بجز بستروں کے سب جہاز پر بھیجدیں۔یہ ایک نہایت اہم اور دشوارترین کام ہے جو معلموں اور اُن کے ملازمین کی امداد کے بغیر قریب قریب محال ہے۔صبح ہی سے اُن لوگوں کی پھرتی اور سرگرمی قابل دید ہوتی ہے۔مسافر خانہ کے پھاٹک پر کم از کم ایکسو بیل گاڑیاں لاکر جمع کی گئیں اور ٹھیک بارہ بجے دن کو اُنپر اسباب لدنا شروع ہوا۔معلموں کے آدمی اور قلی کئی کئی من کے صندوق سر پر اٹھا کر تین چار پانچ منزل کے کمروں سے اسطرح اُترتے تھے کہ گویا وزن کا اونکو کوئی حس نہیں ہے۔پھر ہر ایک قلی کو سیکڑوں چکر پڑ گئے۔ہمارا قلی جو عباس صاحب کا خاص آدمی تھا نہایت جفاکش اور مضبوط آدمی تھا۔اوسکی مستعدی اور جانفشانی قابل دید تھی۔غرضکہ آناً فاناً سب بیل گاڑیاں بار کردی گئیں اور معلموں کی نگرانی میں جہاز کے اسٹیشن پر روانہ کردی گئیں۔اسکے بعد حجاج اپنی جگہ تجویز کرنے اور اسباب جہاز پر مناسب مقام پر رکھوانے کے لئے حسب اعلان بارہ بجے روانہ ہوئے۔اب ڈاک یارڈ میں پہنچنے کے بعد کس میرسی کا عالم

قابل دید تھا۔ اپنی پارٹی کی طرف سے میرا اور شاہ محمد سلیم کا انتخاب اس کام کے لئے ہوا تھا۔ چنانچہ ہم لوگ پلیٹ فارم پر اور تمام حجاج کی طرح پریشان اور سرگرداں پھرتے رہے۔ دھوپ اور گرمی اور اژدحام کا کیا بیان کیا جائے۔ ان سب پر بالا انتظار کی تکلیف اور معلموں اور انکے آدمیوں کے لئے یہ دن بھی عجیب و غریب ہوتا ہے۔ جہاز کی سیڑھی قریب ۲½ فیٹ چوڑی ہوتی ہے اُس کے قریب سیکڑوں آدمیوں کا ہجوم ہوتا ہے اور یہ کوشش ہوتی ہے کہ جب جہاز پر آنے کی اجازت کا سگنل ہو تو سب سے پہلے ہیں داخل ہوں۔ چنانچہ اس بھیڑ اور جدوجہد کا ہم لوگ نظارہ کرتے رہے سیڑھی پر کانسٹبل کھڑے تھے جو معلموں کے آدمیوں اور قلیوں کو سیڑھی چھونے تک نہیں دیتے تھے۔ اسی کشمکش میں یہ لوگ دو گھنٹہ سے زیادہ کھڑے رہے۔ بعد تین بجنے کے یکایک اشارہ کیا گیا اور اُس وقت جو حملہ سیڑھی پر ہوا ہے وہ خطرہ سے خالی نہ تھا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نہ کوئی دب کر یا گر کر مر جائیگا۔ مگر بجز خفیف چوٹوں کے اور کوئی مجروح نہیں ہوا۔ ذرا دیر میں اسباب کا معائنہ شروع ہوا۔ ہماری پیٹیاں اور صندوق کھلوائے گئے اور سرسری معائنہ ہوا۔ اس کے بعد ہم لوگ حسب ہدایت عباس صاحب جہاز پر گئے۔ عباس صاحب نے نہایت موزوں مقام پر قبضہ جما لیا تھا۔ ایک فرش انھوں نے یہاں پر بچھا رکھا تھا جس پر ہمارا اسباب لاکر رکھ دیا گیا۔ زمین سے جہاز پر اسباب عموماً بذریعہ جر ثقیل کے اُٹھایا جاتا ہے۔ خاص لوگ قلی کر لیتے ہیں تاکہ حفاظت کے ساتھ اسباب بار ہو جائے۔ عباس صاحب کا قلی ان تھک آدمی تھا۔ بلا مبالغہ پچاس مرتبہ یہ شخص جہاز سے نیچے گیا ہوگا اور بھاری بھاری سامان لیکر چشم زدن میں اوپر آتا تھا۔ پلیٹ فارم سے بالائی ڈاک کی بلندی اندازاً چالیس فیٹ سے کم نہیں ہے۔

۵ بجے کے بعد ہم لوگ اپنے جائے قیام پر آئے۔ اب ہمارے پاس بجز بستر کے کوئی سامان نہ تھا۔ جو تکلیف آج عام طور پر لوگوں کو جہاز پر جانے اور اسباب رکھوانے میں ہوئی وہ باسانی منتظمان کی توجہ سے اصلاح پذیر ہو سکتی ہے یعنی بارہ بجے جب

اسباب پلیٹ فارم پر پہنچے اوسیوقت معائنہ کنندہ افسر موجود رہے اور بکے بعد دیگرے معائنہ کے بعد اجازت لوگوں کو جگہ انتخاب کرنے اور اسباب رکھوانے کی ملتی جائے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اسقدر عرصہ تک لوگ پریشان حال پھرتے رہیں۔

۱۳ مارچ ۱۹۳۱ء کو حسب اعلان ہملوگوں کا بستر بھاپ کے مقام پر روانہ کیا گیا اور قریب ایک بجنے کے ہملوگ معائنہ ڈاکٹری کے لئے روانہ ہوئے۔ ایک ہزار حاجی اسوقت جہاز پر تھیں۔ یہ سب معائنہ کے کمرہ کے باہر جمع ہوئے۔ برآمدہ جہاں ہم لوگ کھڑے تھے مشکل سے بارہ فیٹ چوڑا اور ساٹھ فیٹ لانبا ہوگا۔ اوسکے پھاٹک پر جو بھیڑ ہوئی خدا کی پناہ۔ بعد انتظار بسیار پھاٹک کھلا اور ایکبارگی ہمارے پیچھے سے ایک ایسا زبردست ریلا مسافروں کا ہوا کہ ہملوگ گویا شکنجہ میں دبنے لگے۔ دونوں ہاتھوں کو قدرے پھیلا کر بمشکل بھائی صاحب کو اپنے حلقے کے اندر لیا کیونکہ سخت اندیشہ تھا کہ اونکو خدانخواستہ چوٹ ضرور پہونچیگی۔ غرضکہ دبتے اور پستے ہوئے ہملوگ معائنہ کے ہال میں کسیطرح داخل ہو گئے۔ میں نہیں جانتا کہ منتظمان حج کمیٹی اس تکلیف کو کیوں روا رکھتے ہیں۔ اسکا علاج بہت آسان ہے۔ بارہ یا ایک بجے دن سے معائنہ کا دفتر کھلا رہے۔ چار بجے شام تک جیسے جیسے حجاج آتے جائیں معائنہ ہوتا جائے اور انکو فراغت کر دیا جائے یہ دو تین گھنٹہ انتظار کرانا اور اُس کے لئے کوئی انتظام قیام نہ رکھنا سخت تکلیف دہ اور خطرناک ہے۔ معائنہ کا ہال نہایت وسیع ہے۔ بجلی کے پنکھے لگے ہوئے ہیں بھائی جان نے وہاں پہنچکر پائتابے اُتارے اور جلد تروتازہ ہو گئے۔ معائنہ کے وقت پاسپورٹ اور گودنے کا سارٹیفکٹ دیکھا گیا اور کپڑے ہٹا کر پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ڈاکٹر نے دیکھا کہ تلی تو نہیں بڑھی ہے اور بخار تو نہیں ہے۔ اس معائنہ میں کوئی امر قابل اعتراض نہیں ہم لوگ یہاں سے ایک گھنٹہ کے اندر فارغ ہو کر سیدھے جہاز کی طرف روانہ کئے گئے۔

ڈاکٹر سراج الحسن صاحب اور بھائی صاحب مقام منتخب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے یہ مقام بالائی "ڈاک" پر بہترین موقع پر ہے۔ سامنے سمندر ہے۔ سایہ دار ہوادار پاخانہ قریب۔ باورچی خانہ قریب۔ چھ بجے شام کو دو چھوٹے چھوٹے جہاز ہمارے بڑے جہاز کو

کھینچ کر ڈاک یارڈ کے باہر لے چلے۔ سات بجے جہاز ڈاک یارڈ سے باہر آگیا اور بمبئی کا دلکش بندرگاہ بخوبی پیش نظر ہو کر رفتہ رفتہ نظر سے غائب ہوگیا۔

۱۳ مارچ ۱۹۳۱ء۔ بہت تڑکے ہم لوگ اُٹھے۔ نماز سے فراغت کی۔ ڈاکٹر سراج الحسن اور بھائی جان نہایت خوش ہیں۔ ہمارے پلنگ کے سامنے ایک جگہ مثل دالان کے ہے اُس کے آگے سمندر کا منظر نہایت دل فریب ہے۔ تر و تازہ ہوا نہایت فرحت بخش ہے۔

تیسرے پہر سے ہوا تند ہوئی اور یکایک بہت تیز ہو گئی۔ کرمچ کی چھت میں ہوا بھرنے لگی۔ دفعتہً کل چھت کھول دی گئی۔ اب ہم لوگ زیر آسمان تھے۔ ہوا میں بہت نمی اور سردی اور تیزی تھی۔ بھائی جان اور ڈاکٹر سراج الحسن کا زیر آسمان اس سردی میں سونا خطرناک معلوم ہوا۔ عباس سے میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ اُس نے فوراً اُس سے زیریں منزل میں بھائی جان کے لئے دوسرا پلنگ فراہم کیا اور اُنکا بچھونا خود لیجا کر بچھایا۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی اُن کے قریب ہی جگہ مل گئی یہ دونوں آدمی آرام سے سوئے۔ مجھے اس کھلے ہوئے مقام میں خوب گہری نیند آئی۔ ۳ بجے سویرے آنکھ کھلی۔ وضو کر کے یاد خدا میں مصروف ہوئے۔

۱۴ مارچ ۱۹۳۱ء۔ دن بھر بھائی جان اور ڈاکٹر صاحب اوپر ہمارے پاس رہے شام کو ہوا کا رخ پھر خراب نظر آیا چنانچہ اُن دونوں کو پھر نیچے بھیجدیا گیا۔ ساڑھے گیارہ بجے رات کو مجھے نیند آئی اور ساڑھے بارہ بجے آنکھ کھلی ایک عجیب عالم تھا کرمچ کی چھت معلوم ہوتا تھا کہ پاش پاش ہو کر اُڑ جائے گی۔ کڑیاں اور بلیاں بید کی طرح کانپ رہی تھیں جہاز کروٹیں لے رہا تھا سمندر کی لہر اور اس کا شور مہیب تھا۔ اُس کے ساتھ ساتھ آندھی اور پانی اور بجلی کی چمک اور بادل کی گرج شروع ہوئی۔ چار بجے صبح تک یہ طوفانی کیفیت رہی اوپر کے ڈک پر تقریباً چار سو آدمی ہیں۔ ہر طرف چیخ پکار مچی رہی۔ صبح ہوتے ہوتے ہوا خاموش ہوئی۔ مطلع صاف ہوا اور ٹھیک ساڑھے چار بجے صبح کو بندرگاہ کراچی پر بحمداللہ ہم لوگ خیریت سے پہونچ گئے۔ بھائی جان اور ڈاکٹر صاحب کو زیرین منزل میں کوئی احساس ان حالات کا نہیں ہوا سوتے رہے۔ اب ہم لوگ خاص بندرگاہ سے قدرے فاصلے پر لنگر انداز ہیں۔ یہاں معائنہ ڈاکٹری جہاز کا ہونے کے بعد دو چھوٹے

جہاز اس جہاز کو کھینچ کر کراچی کے اندر لیجائینگے۔ یہاں پانچسو حاجی اور سوار ہوں گے اور انشاءاللہ آج شام کو یہاں سے ہم لوگ عدن کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ مختصر یہ ہے کہ سفر نہایت پُرلطف اور صحت بخش معلوم ہوتا ہے۔ قے اور غثیان کا پتہ نہیں۔ مرغ کا قورمہ اور طرح طرح کے فواکہات روز کھاتے ہیں اور خدا کا شکر کرتے ہیں۔

۱۵ مارچ ۱۹۳۱ء۔ علی الصبح ۵ بجے جہاز بندرگاہ سے بذریعہ دو چھوٹے جہازوں کے کھینچ کر بندرگاہ کراچی کے اندر لایا گیا۔ بندرگاہ کراچی خوبصورت اور کشادہ ہے جہاز کے پلیٹ فارم پر ریل کی لائن بھی ہے۔ حجاج کا ہجوم سامنے پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ جہاز کو دیکھ کر نعرۂ اللہ اکبر بلند کیا۔ جہاز والوں نے اللہ اکبر کہکر جواب دیا۔ اسی طرح دیر تک تکرار "اللہ اکبر اللہ اکبر" کی ہوا کی پھر معلموں نے جہاز پر سے پلیٹ فارم کے لوگوں اور دیگر معلموں سے چیخ چیخ کر بات چیت شروع کی کوئی حاجی جہاز سے اُتر کر پلیٹ فارم پر نہیں جانے پایا دریافت سے معلوم ہوا کہ پورٹ کے افسران کی اجازت نہیں ہے کہ کوئی حاجی جہاز سے اُتر سکے یہ عجیب قانون ہے۔ اس جہاز کے کل مسافر ہندوستان کے ہیں۔ اور بمبئی سے آرہے ہیں۔ کراچی بھی ہندوستان کا بندرگاہ ہے کیا وجہ ہے کہ انکو کم از کم ڈاک یارڈ میں اُترنے کی اجازت نہ دی جائے۔ آخر الہ آباد میں ہندوستان کے ہر گوشہ سے سالانہ ہزاروں بلکہ لاکھوں یاتری تیرتھ کے لئے آتے ہیں اور تمام شہر میں گھومتے خرید و فروخت کرتے ہیں۔ مقیم رہتے ہیں اور کوئی ممانعت نہیں ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسافر بمبئی سے چلکر ہندوستان کے دوسرے بندرگاہ میں نہ اُترنے پائیں خاصکر ایسی صورت میں جبکہ تمام جہاز میں ایک مسافر بھی کسی عارضہ وبائی یا غیر وبائی میں مبتلا نہیں ہے اور اگر یہی مسافر بذریعہ ریل بمبئی سے کراچی آتے تو کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی۔ خاصکر بندرگاہ کے حدود کے اندر اُترنے کی ممانعت ہونے سے سخت تکلیف حجاج کو ہوئی۔

پلیٹ فارم پر دوکاندار طرح طرح کی اشیاء ضروری فروخت کرنے کے لئے مستعد تھے۔ خریداری عجیب طور پر ہوئی۔ ٹوکریاں رسی سے باندھ کر جہاز سے لٹکا دی گئیں اور اسمیں قیمت رکھ دی گئی دوکانداروں نے اشیاء مطلوبہ اوسمیں رکھدیں خریداروں نے اوپر سے

ٹوکری کھینچ لی۔ اسی طریق پر خرید و فروخت کا سلسلہ تمام دن جاری رہا۔ مچھلیاں بکثرت خریدی گئیں۔ ایک آنہ سیر چھوٹی مچھلی۔ بڑی مچھلی قریباً تین سیر کی چار آنہ کی۔ ایک آنہ کا ایک انار۔ دو پیسہ کا ایک سنگترہ۔ غرض کہ سب چیزیں ارزاں ہیں۔ تھوڑی دیر میں جہاز کے ہر گوشہ میں خریدی ہوئی مچھلیوں کا ڈھیر نظر آنے لگا۔ ساڑھے سات بجے صبح ڈاکیہ نے عزیز از جان سید بشیر حسین سلمہ کا جوابی تار جہاز کے اندر لا کر دیا۔ سب کی خیریت معلوم ہوکر اطمینان ہوا۔ اُس کا جواب لکھکر میں آفیسر انچارج جہاز کے پاس لے گیا۔ اُنھوں نے کہا کہ میری ذمہ داری پر آپ یہ کاغذ مجھکو دیدیجئے میں تار دیدونگا اور شام کو رسید دے دونگا۔ چنانچہ اُنھوں نے تار دیدیا۔ اسی آفیسر کی معرفت میں نے اپنے خط ڈاک میں ڈالنے کے لئے بھیجے۔ اب ہم لوگوں نے یہ انتظار شروع کیا کہ جو حجاج تڑکے سے جہاز کے انتظار میں کھڑے ہوئے ہیں انکو کس وقت جہاز کے اندر آنے کی اجازت ہوتی ہے اسی انتظار میں تمام دن گزر گیا اور وہ بیچارے اُسی طرح انتظار کی تکلیف برداشت کرتے رہے۔ غروب آفتاب کے قریب خدا خدا کرکے اونکو جہاز کے اندر آنے کی اجازت ملی اور اُن کے عزیز اقارب۔ دوست آشنا جو رخصت کرنے آئے تھے چراغ روشن ہونے کے وقت ایک الوداعی نظارہ کے بعد واپس ہوئے اور پونے سات بجے جہاز بندرگاہ سے روانہ ہوا۔ یہ قانون اور یہ عمل سخت اعتراض کے قابل ہے۔ بہت آسانی سے ممکن تھا کہ صبح حجاج کا معائنہ ڈاکٹری ہوجاتا۔ اون کا اسباب ملاحظہ ہوجاتا۔ البتہ کو بھاپ دیدی جاتی اور وہ دوپہر تک جہاز پر سوار ہوجاتے۔ پانسو آدمی کے قریب کراچی سے سوار ہوئے۔ اونکو دوپہر تک فارغ کردینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔

۱۶ مارچ ۱۹۳۱ء۔ سمندر کی سطح نہایت ہموار ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چارخانہ کا ایک وسیع فرش بچھا ہوا ہے۔ جہاز کو ذرا بھی جنبش نہیں ہوتی۔ ہم لوگ صبح کو جہاز کی سیر کو نکلے۔ وایرلس کیبن کی سیر کیلئے گئے۔ آفیسر انچارج سے ملاقات کی۔ معلوم ہوا کہ اس جہاز ہندوستان کا وزن ۱۴۱۷۷ ٹن ہے۔ اس کی لمبائی چارسو پچاس فیٹ اور چوڑائی ستاون فیٹ ہے۔ بمبئی سے ایک ہزار سینتالیس حاجی اور کراچی سے پانچسو اڑتیس

یعنی کل (۱۵۸۵) ایک ہزار پانچسو پچاسی حاجی سوار ہیں اور یہی اُسکی پوری تعداد ہے ہملوگ آفیسر انچارج کے کمرہ سے نکل کر بالائی منزل پر کپتان کے کیبن کی طرف جارہے تھے اور کوئی دس بجے دن کا وقت تھا کہ یکایک عباس معلم نے پکارا ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب ادھر آئیے ایک آدمی جہاز سے سمندر میں گر پڑا - جہاز فوراً روکا گیا - چھوٹی کشتی فوراً نکالی گئی - جہاز کو گھماکر کپتان نے دوربین سے دیر تک سمندر پر چاروں طرف دیکھا مگر افسوس کہ کوئی پتہ نہ چلا اور دیر تک جستجو کرنے کے بعد جہاز پھر روانہ ہوگیا - حافظ عبداللطیف سوداگر الہ آباد - سہ پہر کو ہم سے ملنے آئے - اُنھوں نے کہا کہ جس مقام پر اُنکا بستر ہے اُسکے قریب ہی ایک شخص منزل بالا سے گرا اور اُسکا ہاتھ کھڑکی پر پڑا اُس نے کھڑکی کو تھاما اور یہ بھی کہا کہ سمندر سے پانی بھر رہا تھا کہ گر پڑا - جب تک لوگ دوڑیں اور اُسکا ہاتھ پکڑیں وہ سمندر میں گر گیا - عموماً لوگ اس واقعہ سے دن بھر نہایت افسردہ رہے دن بھر اُڑتی ہوئی مچھلیاں بکثرت نظر آئیں - رات کو سمندر کا منظر بہت دلچسپ تھا - جہاز سے کٹتے ہوئے پانی پر ایک عجیب وغریب روشنی پیدا ہوتی تھی اور اسی طرح دور دور تک دیکھا گیا جہاں کوئی مچھلی یا جانور سطح پر آیا اور ایک روشنی پیدا ہوئی -

۱۷ مارچ ۱۹۳۱ء - دو تین روز سے جہاز کے اندر ہیضہ کا ٹیکہ لگایا جارہا ہے - معلوم ہوا کہ پارسال کچھ مسافر ہیضہ سے ضایع ہوئے تھے اسلئے یہ قاعدہ کردیا گیا کہ ہیضہ کا ٹیکہ لازمی ہے - اس حکم سے عام طور پر نہایت بددلی ہے - اس حکم کا اعلان نہیں ہوا پارسال کے حاجیوں سے دریافت کیا گیا - اُنھوں نے کہا کہ بجز چیچک کے ٹیکہ کے اور کوئی ٹیکہ نہیں لگایا گیا - امسال بمبئی میں صرف یہ اعلان کیا گیا کہ جن کے چیچک کا ٹیکہ نہیں لگا اون کو ٹکٹ نہ ملے گا چنانچہ جس کو ضرورت تھی سب نے چیچک کا ٹیکہ لے لیا وہاں بھی کوئی اعلان ہیضہ کے ٹیکہ کا نہیں کیا گیا، یہاں اکثر مسافر ایسے ہیں جن کے بازو چیچک کے ٹیکہ سے آماسیدہ اور زخمی ہیں اوپر ہیضہ کا ٹیکہ اور ایک طرہ ہے - میں نے اور ڈاکٹر سراج الحسن صاحب نے جہاں تک ممکن ہوا لوگوں کو آمادہ بھی کیا اور آج میں نے اور شاہ محمد سلیم اور مسٹر عبدالرحمن خاں نے ڈاکٹر کے پاس جاکر ٹیکہ لیا - دو روز بعد جب

ہم لوگوں کی حرارت وغیرہ جو عموماً ٹیکہ کے بعد ہوتی ہے رفع ہو جائے گی تو ڈاکٹر سراج الحسن صاحب اور جناب بھائی مولوی سید شوکت حسین صاحب قبلہ کو ٹیکہ ہیضہ کا بھی دلوا دینگے بھائی صاحب پر چیچک کے ٹیکہ کا اچھا خاصہ اثر ہوا ہے بایاں بازو سوجا ہوا ہے۔ ٹیکہ کے تینوں دانے خوب اُٹھے ہوئے ہیں۔

منتظمان جہاز اور پروٹیکٹر آف پلگرمز کو لازم ہے اس امر کا خوب اعلان کر دیں کہ ہیضہ کا ٹیکہ بھی حجاج اپنے وطن سے لے کر چلا کریں۔

جہاں پر میرا بستر ہے اُس کے قریب ایک پاخانہ ہے جس کے ایک دروازہ پر "عورتوں کا سنڈاس" لکھا ہوا ہے اور عورت کی تصویر بنی ہوئی ہے اور اسی پاخانہ کی دوسری جانب "مردانہ سنڈاس" لکھا ہوا ہے اور مرد کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ اندر سے کل پاخانہ ایک ہے کوئی تقسیم مردانہ اور زنانہ حد کے مابین نہیں ہے اس کمی کی وجہ سے نہایت ناگوار صورتیں پیش آتی رہتی ہیں۔ اس قسم کا مشترک پاخانہ ہرگز نہ رکھنا چاہئے۔

۱۸ و ۱۹ مارچ ۱۹۳۱ء۔ جہاز دس گیارہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلا جا رہا ہے۔ مگر روز صبح کو اُٹھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں پر شام کو تھے اُسی مقام پر موجود ہیں منظر تبدیل نہیں ہوتا۔ ہر چہار طرف وہی نیلا پانی وہی نیلا آسمان۔

کراچی میں بندرگاہ کی گھڑی سے جو گھڑیاں ملالی گئی تھیں اُن کے حساب سے آج طلوع آفتاب آٹھ بجکر تیرہ منٹ پر ہوا۔ کلہ شام کو آٹھ بجکر دس منٹ پر غروب ہوا تھا۔ یعنی جس وقت الہ آباد میں رات کا کھانا کھاکر سونے کی تیاری ہوتی ہوگی اسوقت یہاں خوب دھوپ رہتی ہے۔

۲۰ مارچ ۱۹۳۱ء۔ عرب کے ساحل کی زمین اور پہاڑ دور اُفق پر بادل کی طرح نظر آئے۔ دو تین گھنٹہ بعد پھر وہی پانی وہی آسمان۔ آج گرمی اچھی طرح محسوس ہو رہی ہے۔ ٹمپریچر ۸۰ ہے آج عورتوں اور مردوں کے پاخانہ کی تفریق بذریعہ ایک ٹاٹ کے پردہ کے کردی گئی جو حد فاصل اگرچہ مستقل نہیں ہے مگر سردست شکایت رفع ہوگئی۔

۲۱ مارچ ۱۹۳۱ء۔ کل سے برابر سرزمین عرب کا ساحل اور اُس کے پہاڑ دور سے نظر

آرہے ہیں بعض مقامات پر آبی چڑیاں ہزاروں کی تعداد میں جہاز کے قریب نظر آتی ہیں کبھی کبھی جہاز پر بیٹھ جاتی ہیں۔ پانی پر بلاتکلف تیرتی ہیں۔ اُن کے پنجے کھلے ہوئے ہیں۔ چونچ خفیف سی ٹیڑھی ہے رنگت سفید بازو اور پشت پر خفیف سیاہی قد میں باز کے برابر۔ سمندر آج لہریں مار رہا ہے۔ جہاز میں قدرے جنبش ہے۔ بعض بعض مسافر دوران سر اور غثیان میں مبتلا ہیں۔ ہماری پارٹی پر ہنوز کوئی اثر نہیں ہے

۲۲ و ۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء۔ کل غروب آفتاب الہ آباد کی گھڑی کے حساب سے پونے نو بجے ہوا۔ مغرب کی نماز سے ہم لوگ نو بجے فارغ ہوئے۔ شب کو دس بجے بندرگاہ عدن سے ہم لوگ گزرے۔ یہاں جہاز رکا نہیں گیا۔ دور سے بجلی کی روشنی سے بندرگاہ اور شہر وغیرہ کا منظر دلچسپ تھا۔ اب تھوڑی دیر میں آبنائے باب المندب میں جہاز داخل ہوگا کل شب سے حاجیوں پر سی سکنس کا اثر ہے۔ رات بھر قے کرنے کی آوازیں آئیں اکثر لوگ پڑے ہوئے ہیں۔ الحمد للہ کہ ہماری پارٹی کا کوئی شخص اب تک اس سے متاثر نہیں ہوا۔ گیارہ بجے جہاز آبنائے باب المندب سے گزرا۔ داہنی جانب عرب کے پہاڑ بائیں جانب افریقہ کے ساحل اور درمیان میں ایک چھوٹا سا جزیرہ پیرم ہے یہ جزیرہ برٹش گورنمنٹ کا ہے۔ اس پر ایک مکان لائٹ ہوس کا بشکل قلعہ دور سے نظر آتا ہے اور کچھ بارکیں۔ کل صبح انشاءاللہ ہملوگ کامران پہنچ جائینگے۔

۲۴ مارچ ۱۹۳۱ء۔ آٹھ بجے صبح جہاز کامران پہنچ گیا۔ ہمارے جہاز سے کامران کا جزیرہ قریب ایک فرلانگ کے ہے۔ جہاز نے لنگر ڈالا۔ سیٹی دی۔ اور آن کی آن میں ایک نہایت خوبصورت سفید رنگ کا چھوٹا سا اسٹیمر کامران سے روانہ ہوکر ہمارے جہاز کے پاس آگیا اور بذریعہ جہاز کی سیڑھی کے انگریز ڈاکٹر جہاز پر آیا۔ تمام جہاز پر اُسنے ایک دورہ کیا۔ جہاز کے ڈاکٹر اور کپتان نے یہ رپورٹ دی کہ جہاز کے کل مسافروں کو ہیضہ کا ٹیکہ لگا دیا گیا ہے اور کوئی مرض وبائی مسافروں میں نہیں ہے۔ لہذا اُس نے قرنطینہ کرانا غیر ضروری خیال کیا۔ چنانچہ بہت جلد اس کا اعلان ہوا کہ جہاز دو گھنٹے کے اندر پھر روانہ ہو جائیگا۔ تمام حجاج اس خبر سے بہت خوش ہوئے ساتھ دہ

اگر حاجی اپنے وطن سے ٹیکہ ہیضہ اور چیچک کا لے کر چلا کریں تو وہ قرنطیہ کی زحمت سے بچ جائینگے - جہاز سے اتر کر جزیرہ پر جانا - وہاں دوا کے پانی سے غسل کرنا - اسباب کو بھاپ دلانا - وہاں کا قیام اور وہاں سے واپس ہو کر اپنے مقام تک جہاز پر پہنچنا یہ نہایت سخت تکلیف دہ امور ہیں - میں نے کامران کے ڈاکٹر صاحب سے کپتان کے کیبن میں جا کر ملاقات کی اور کہا کہ یہاں سے ایک تار ہندوستان بھیجنا چاہتا ہوں - انھوں نے کہا کہ یہاں سے ٹیلیگرام کا سلسلہ نہیں ہے - وائرلس جہنی بلا تار کا پیغام جا سکتا ہے جس کا محصول اوسیقدر ہے جیسا کہ جہاز کے وائرلس کا ہے اسوجہ سے اونکی معرفت کوئی ٹیلیگرام نہیں روانہ کیا - البتہ چونکہ یہاں سے ہندوستان تک ڈاک کا محصول معمولی ارنی لفافہ ہے لہذا میں نے بہت سے خط اپنے احباب اور اعزا کے نام جو راستہ میں لکھے تھے اونکے حوالے کئے -

کامران میں جہاز کے پہنچتے ہی چھوٹی چھوٹی کشتیاں ہر چہار طرف سے آکر جہاز کے چاروں طرف جمع ہو گئیں اور مچھلی بازار قائم ہو گیا - حاجیوں نے اسقدر مچھلی خریدی کہ اوس کی بو تمام جہاز کے اندر دو روز گونجتی رہی - مچھلیاں بہت عمدہ اور نہایت ارزاں تھیں - انھیں کشتیوں پر سے سیکڑوں لڑکے اور جوان اور بوڑھے سمندر پر کود پڑے اور شور کرنا شروع کیا کہ پیسہ پھینکو - چنانچہ حاجیوں نے پیسے پھینکنے شروع کئے اور یہ لوگ نہایت آسانی سے سمندر کے اندر سے پیسے نکال لاتے اور حاجیوں کو دکھلا کر رکھ لیتے تھے - یہ تماشا ایسا دلچسپ تھا کہ جب تک جہاز روانہ نہیں ہوا پیسے اور اکنیاں اور چاندی کی چھوٹی دوانیاں برابر جہاز پر سے برس رہی تھیں اور یہ غوطہ خور فوراً پانی کے اندر سے لا کر دکھلاتے اور اپنے پاس رکھتے جاتے تھے - اسی تماشہ کے دیکھتے دیکھتے جہاز نے سیٹی دی اور روانہ ہو گیا -

بحر قلزم میں جہاز کو ہمیشہ کم و بیش جنبش ہوتی ہے - کامران سے آگے بڑھ کر سمندر بہت ناہموار ملتا ہے - جہاز آج بہت رول کر رہا ہے - جہاز کے تختہ پر ایک قدم چلنا بھی دشوار ہے - سب کے سر میں چکر اور اکثر مسافروں کو استفراغ ہو رہا ہے - مجھکو بفضلہ

زمتلی ہے۔ نہ چلنا پھرنا دشوار ہے۔ خفیف اثر سر کے اندر اسطرح کا ہے جیسا کہ جاگنے سے ہو۔

آج نماز ظہر پڑھ کر ہم لوگوں نے احرام بہ نیت عمرہ باندھ لیا۔ یعنی اب انشاءاللہ جدہ سے سیدھے مکہ معظمہ جائیں گے وہاں عمرہ ادا کریں گے یعنی طواف کعبہ اور صفا مروہ دوڑنے کے بعد احرام کھول دینگے اور دو چار روز قیام مکہ معظمہ کے بعد مدینہ منورہ روانہ ہونگے۔ آج رات میں ہمارا جہاز یلملم پہاڑ کے محاذی گذرے گا۔

ساڑھے نو بجے۔ ہملوگ نماز عشاء سے فارغ ہو کر ابھی لیٹے تھے کہ جہاز نے بہت زور کی سیٹی دی۔ ایسے زور کی سیٹی میں نے کسی انجن کی نہیں سنی تھی۔ جو لوگ سو رہے تھے اسکی آواز سے جاگ پڑے۔ معلوم ہوا کہ یہ سیٹی اس امر کا اعلان ہے کہ جہاز یلملم پہاڑ کے محاذی آگیا۔ سب حاجی کھڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ لبیک لبیک کی صدا سے سارا جہاز گونج اٹھا جن لوگوں نے دن کو احرام نہیں باندھا تھا جلد جلد احرام باندھا۔ دعا پڑھی اور دوگھنٹہ کے لئے ایک نئی زندگی جہاز میں پیدا ہوگئی۔ اسوقت ہوا نہایت زناٹے کی چل رہی ہے۔ خنکی بھی بہت پر لطف ہے اور صبح جدہ پہنچنے کی خبر مسرت اثر سے ہر ایک کے دل میں ایک عجیب گدگدی ہے۔ غرضکہ رات عجیب عالم اضطراب اور انتظار اور اشتیاق میں گذری۔

۲۵ مارچ ۱۹۳۱ء۔ صبح نور کے تڑکے نماز فجر ادا کرتے ہی ہملوگ ڈک کے کنارے کھڑے ہوگئے۔ عجیب سماں تھا عجیب منظر تھا۔ سمندر کا رنگ یہاں پر عجیب و غریب ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاز سے لیکر سمندر کے کنارے تک ایک ہفت رنگ تقریباً چار میل چوڑی اور سیکڑوں میل لانبی ایک جاجم بچھی ہوئی ہے۔ سمندر خاموش ہے اور اُسپہ لانبی دھاریاں پڑی ہوئی ہیں۔ سُرخ۔ سبز۔ اُودی۔ آسمانی۔ بنفشی۔ نارنجی زرد رنگ کی دھاریاں یکے بعد دیگرے پانی کی سطح پر عجیب و غریب منظر پیدا کر رہی ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں پر یہ رنگ مستقل رہتا ہے۔ اور کیا عجب ہے کہ اسی خصوصیت کی وجہ سے اس بحر کا نام بحر قلزم پڑا ہو۔ پو پھٹتے ہی جدہ کا عالیشان بندرگاہ

نظر پڑا- آن کی آن میں بندر گاہ جدہ کے سامنے جہاز پہنچا- جہاز نے سیٹی دی- پھریرا بلند کیا اور لنگر ڈالدیا-

سب سے پہلی چیز جو ہمارے جہاز کے متصل نظر پڑی وہ ایک جلا ہوا جہاز تھا- گذشتہ سال حج سے واپسی کے سفر میں یہ جہاز حاجیوں سے بھرا ہوا تھا اور غالباً مصر کی طرف جا رہا تھا کہ اسمیں آگ لگ گئی- سیکڑوں جانیں جلکر ضایع ہوئیں ان بہشت نصیب مسافران وطن کی مصیبت کا نقشہ آنکھوں تلے پھر گیا- لیکن جس بے پرواہی سے مسافر جہاز کے اندر آگ سلگاتے اور کھانا پکاتے ہیں- اُسپر نظر کرتے ہوئے یہی تعجب ہوتا ہے کہ ہر جہاز میں آگ کیوں نہیں لگ جاتی- جہاز کے ڈک پر اگر کوئی مصیبت ہے تو وہ دھوئیں اور آگ کی ہے- اسقدر دھواں ہوتا ہے کہ سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے- تمام مسافروں کی آنکھیں سُرخ اور آنکھوں سے پانی جاری رہتا ہے- دس بجے رات تک ایک عجیب آفت رہتی ہے- بعض مسافر اسقدر بے پرواہ ہوتے ہیں کہ آگ کی چنگاریاں اڑتی رہتی ہیں اور ہرگز احتیاط کو دخل نہیں دیتے میری رائے میں بجائے لکڑی کے مسافروں کو کوئلہ ملنا چاہئے- خواہ اسکے عوض میں کرایہ جہاز میں قدرے اضافہ کر دیا جائے- ہملوگوں نے ایک بورہ کوئلہ بمبئی سے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا- اس سے بہت آرام رہا-

جہاز کے رکتے ہی ہی بندر گاہ کیطرف سے ایک بہت بڑا لشکر کشتیوں کا متحرک ہوا- ان کشتیوں کے سپید بادبان ہوا میں لہلہاتے ہوئے بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے- بات کی بات میں کشتیاں قریب آگئیں اور اب معلوم ہوا کہ قد قامت میں یہ کشتیاں بہت بڑی ہیں- اور ہر کشتی کے درمیانی حصہ میں ایک بلند مستول تھا- ان کشتیوں میں قلیوں کا ایک بڑا غول تھا جنھوں نے کشتیوں کے قریب آتے ہی جہاز کو ٹیڑی دل کی طرح گھیر لیا- اُنکی پھرتی اور مضبوطی حیرتناک تھی- یہ ایک معمولی رسی کے سہارے بلا تکلف قریب چالیس فیٹ کی بلندی پر کشتیوں کے اندر سے جہاز کے اوپر آگئے- عباس ابراہیم نے اپنے حاجیوں کے لئے قلی مقرر کئے اور خود بھی تمام لباس عربی اُتار کر

ایک تہمد باندھ لی اور قلیوں سے ہملوگوں کا اسباب اتروانا شروع کیا۔ اسوقت جہاز کے اندر ایک عجیب ہل چل تھی۔ اوپر کا ترپال دور کر دیا گیا تھا۔ ہم لوگ دہوپ میں چھاتہ لگائے بیٹھے تھے اور محو تماشا تھے۔ قلیوں نے حاجیوں کا اسباب اُٹھا اُٹھا کر دھڑام دھڑام نیچے کشتیوں میں پھینکنا شروع کیا اور کیا مجال کہ اسباب سیدھا کشتی میں نہ گرے۔ صندوق اور ٹرنک وغیرہ رسیوں میں باندھ کر لٹکا دیئے جاتے تھے۔ کشتی والا اونکو کھول لیتا تھا۔ ایک طرف جر ثقیل کی مشین بھی نہایت سرعت سے اسباب اُتار رہی تھی۔ اسکا تماشہ بھی قابل دید تھا۔ یعنی ایک بڑا جالدار ٹاٹ نیچے بچھا کر اوس پر اسباب خوب لاد دیا۔ پھر اُس کے چاروں کونے جر ثقیل کے کانٹے میں پھنسا دیئے۔ اب جر ثقیل نے اوس بڑے جھولے کو بند کر کے جہاز کے باہر کیا اور پھر نیچے کرتے کرتے کشتی تک لے گیا۔ کشتی والوں نے ٹاٹ کے جال کے تین کونے تو اُس کے کانٹے سے نکال لیئے اور ایک کونہ اوسی کانٹے کے اندر پھنسا ہوا رہنے دیا اور زنجیر کو بلند کرنے کا اشارہ کیا۔ اب وہ ایک کونہ جال کا لیکر بلند ہو چلی اور تین کونے کھلجانے کی وجہ سے اسباب اس ٹاٹ کے جال سے دھڑام دھڑام کشتی میں گرنا شروع ہوا۔ کوئی دو فیٹ سے کوئی چار فیٹ سے۔ کوئی آٹھ دس فیٹ بلند ہونے کے بعد۔ یہانتک کہ ٹاٹ خالی اوپر چلا گیا اور پھر وہ بدستور سابق اسباب سے بھرا گیا اور اسباب اُسی ترکیب سے کشتی میں اتارا گیا۔ مال اور اسباب کا بڑا حصہ اسی مشین کے ذریعہ سے اتارا گیا۔

عباس ابراہیم اپنے حاجیوں کا اسباب اُتارتے ہی فوراً جہاز کے نیچے گیا اور ایک موٹر بوٹ ہملوگوں کے لیئے ٹھہرا کر علیحدہ کر لی۔ اب اُس نے وہاں سے پکارنا شروع کیا۔ ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر صاحب۔ جلدی اُترئیے۔ جلدی اُترئیے۔ اِدھر یہ حالت کہ اُس تنگ راستہ میں جہاں سیڑھی تھی قدم رکھنا دشوار تھا۔ اوسپر طرہ یہ کہ ایک اسٹیم پائپ کا جوڑ ڈھیلا تھا اور عین راستہ پر نہایت گرم اسٹیم اور گرم پانی کے قطرات اوپر سے ٹپک ٹپک کر بدن جھلسائے دیتے تھے۔ غرض کہ عباس ابراہیم موٹر بوٹ سے پھر اوپر آیا۔ اور ہم لوگوں کو بعد راستہ کے کسیقدر صاف ہونے کے نیچے لے گیا۔ جہاز کی سیڑھی پر اوترنا

کمزور آدمی کے لئے ایک کار عظیم اور دشوار ہے خاصکر جب سیڑھی ختم ہوتی ہے اور ایک قدم آگے بڑھا کر کشتی پر رکھنا ہوتا ہے۔ اِدھر سیڑھی جھومتی معلوم ہوتی ہے اُدھر کشتی ڈگمگ کر رہی ہے۔ اوپر سے مسافروں کا ریلا آرہا ہے۔ سامنے سے عباس ابراہیم ہاتھ کھینچ رہا ہے اور ڈانٹ رہا ہے ڈرو مت۔ ڈرو مت۔ آگے قدم بڑھاؤ جلدی کرو۔ بھائی صاحب اور ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کو خاصکر بہت دقت ہوئی بہرکیف ہم سب لوگ سیڑھی سے ایک کشتی پر آئے اوس کے متصل دوسری کشتی تھی۔ اُسپر آئے اور اسیطرح تین چار کشتیوں پر ہوکر کودتے پھاندتے اپنے موٹر بوٹ تک پہونچے جو ان کشتیوں کے بعد کھڑا تھا۔ موٹر بوٹ فوراً نہایت تیزی سے بندرگاہ کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں سے بندرگاہ قریب تین میل کے ہے ایک میل آگے چلکر ہمارے اسباب کی کشتی جسپر اور مسافر بھی لدے ہوئے تھے۔ ملگئی۔ عباس ابراہیم نے اوس کشتی کو بھی ہماری موٹر بوٹ سے بندھوالیا اور ہم سب لوگ تمام حاجیوں سے قریب نصف گھنٹہ قبل ساحل پر پہنچ گئے۔ جو کشتیاں ایک گھنٹہ قبل روانہ ہوئی تھیں وہ نصف راستہ پر ملیں۔ ہملوگوں نے مقدس سرزمین پر قدم رکھا۔ پچاس قدم آگے بڑھے ہونگے کہ ایک دروازہ ملا جس میں ایک لکڑی کا اڑگڑا لگا ہوا تھا۔ اوس طرف پانچ سات عرب کھڑے تھے۔ سامنا ہوتے ہی اُنھوں نے باواز بلند ڈیڑھ روپیہ ڈیڑھ روپیہ کا نعرہ بلند کیا۔ عباس ابراہیم نے کہا کہ یہاں فی حاجی یہ محصول لیا جاتا ہے۔ اتنا دریافت کرنے کا کس کو حواس تھا کہ یہ کیسا محصول۔ بہرکیف جلد جلد محصول ادا کیا گیا۔ اڑگڑا ہٹا ہم لوگ اندر گئے۔ دوسرے قدم پر سوال کیا گیا، معلّم؟ معلّم؟ حافظ ابراہیم۔ حافظ ابراہیم کہتے ہوئے ہم لوگ آگے بڑھے۔ پھر سوال ہوا۔ وکیل؟ وکیل۔ ابوزید۔ ابوزید جواب دیا گیا۔ ان دونوں ناموں نے سمسم کے آخری دروازہ کا طلسم توڑا اور ہم لوگ ایک بڑے پلیٹ فارم پر داخل ہوئے وہاں ایک مرد مشیخت یعنی ابوزید صاحب وکیل جدہ جلوہ فرما تھے۔ اُنھوں نے صاحب سلامت کی مصافحہ کیا اور یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ اُنھوں نے

تبسم کے ساتھ مخاطبہ کیا - فوراً ایک سینی سامنے آئی - اوس میں سبز رنگ کی برفی نما مٹھائی تھی - ہم لوگوں نے اس کو منجانب وکیل صاحب تواضع سمجھا اور خوش قسمتی سے صرف ایک چھوٹی ڈلی اوٹھا کر منہ میں رکھی کہ ایک ایک گلاس نہایت سُرخ رنگ کا شربت سامنے کیا گیا - اوسکو بھی چکھا - مٹھائی پھیکی - شربت سیٹھا - مگر ہنوز گھونٹ حلق سے اُترا نہ تھا کہ دو دو آنہ فی کس فی ڈلی مٹھائی اور فی گلاس طلب کیا گیا - اب ہم سمجھے کہ یہ خوانچے والے تھے - فوراً قیمت ادا کی گئی - ابھی پانچ منٹ یہاں دم نہیں لینے پائے تھے کہ عباس ابراہیم ہم لوگوں کو پھر سمندر کے پلیٹ فارم پر لے گیا - یہ دوسرا پلیٹ فارم تھا - جہاں کشتیوں سے اسباب اُتار کر جمع کیا گیا تھا ہم لوگوں کو ہدایت ہوئی کہ اپنا اپنا اسباب ڈھونڈو اور جلد علیحدہ کرو - اب یہاں کا ہنگامہ بیان کے قابل نہیں ہے - ڈیڑھ ہزار آدمی اسی پلیٹ فارم پر جمع تھے اور اسباب کا وہ انبار کہ خدا کی پناہ - کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ خدایا کیا کریں اور اسباب کہاں سے نکالیں - ڈاکٹر صاحب اور بھائی صاحب کو ایک کھمبے کے قریب کھڑا کیا اور جو رفیق عورتیں ہمسفر تھیں اونکی نگرانی میں دی گئیں میں اور شاہ محمد سلیم اسباب ڈھونڈھنے لگے - بہزار دقت اور سرگردانی ایک طرف ہم لوگوں کا اسباب سیکڑوں بنڈل اور صندوق کے ڈھیر میں خلط ملط نظر پڑا ہم دونوں آدمیوں نے اُسکو الگ کیا اور اپنے ساتھیوں کو وہاں پر لاکر بیٹھے - تکان سفر اور جسمانی محنت سے کافی طور پر تھک چکے تھے مگر بندرگاہ کی تعمیر پر بھی نظر تھی - یہاں کا بندرگاہ جہاز پر سے نہایت خوشنما نظر آتا تھا مگر یہاں کچھ اور ہی عالم تھا - زمین پکی سنگریزے بچھے ہوئے اوپر لکڑی کے تختوں کا سائبان - تختے ایک دوسرے سے کئی کئی انچ دور سامنے خوبصورت سمندر لہریں مار رہا ہے - بندرگاہ سے ملحق سیکڑوں کشتیاں لگی ہوئی ہیں پانی یہاں پر اسقدر کم ہے کہ جہاز تین چار میل دور کھڑا ہوتا ہے - ابھی ہم لوگ دس منٹ دم نہ لینے پائے تھے کہ عباس ابراہیم تین چار قلی لے کر پہنچے - ہم لوگوں نے اسباب لدوایا - ایک ایک قلی اپنی پیٹھ پر اتنا اسباب لدواتا ہے کہ الہ آباد کے ایک

کہ پر اوتنا اسباب لادنا ناممکن ہے۔ ان کے پاس ایک رسّی ہوتی ہے جسکا حلقہ بناکر وہ اپنی پیٹھ کی طرف ڈالدیتا ہے اور اس کا دوسرا حصہ اپنی پیشانی پر اٹکا لیتا ہے۔ اس رسی کے حلقہ کے اندر تین اسٹیل بکس اور دو بستر بلا تکلف رکھ دیئے جاتے ہیں اور وہ بلا تکلف اُسکو لادکر چلدیتا ہے۔ غرضکہ قلیوں کے پیچھے پیچھے ہم لوگ بھی چلے اور ایک دوسرے پھاٹک سے نکل کر کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں پھر سب کا اسباب خلط ملط پڑا ہے یعنی قلیوں نے پلیٹ فارم سے اسباب اُٹھا کر یہاں لاکر جمع کردیا۔ اب پھر یہاں وہی مصیبت کہ اپنا اپنا اسباب جلد علیحدہ کرو۔ معائنہ ہوگا بہزار خرابی بھ ٹرنک اور بستر وغیرہ ایک طرف کیا کہ معائنہ کرنے والے سر پر آگئے۔ ہیتی کھولو۔ ہیتی کھولو کی صدا بلند ہوئی۔ خیر میں نے اپنے ٹرنک کھولے۔ شاہ سلیم کو دیکھتا ہوں تو بدحواس۔ میں نے پوچھا کیوں خیر تو ہے۔ بولے کہ کنجیوں کا گچھا گر گیا۔ اب اُس ہنگامہ میں دوڑ دھوپ شروع ہوئی مگر کنجیاں کہاں ملتی تھیں۔ ہملوگ اسی چکر میں تھے کہ پھاٹک کے باہر تانگہ والے قلیوں نے ڈاکٹر صاحب کا بند صندوق باہر پہنچا دیا اور وہ مصیبت سر سے ٹلی لیکن ڈاکٹر صاحب کا ایک چھوٹا بنڈل جس میں ضروری دوائیں وغیرہ تھیں کسی معائنہ کنندہ کے نظر پڑ گیا اوس نے اسکو دوسرے افسر کے پاس پہنچا دیا۔ وہاں یہ حکم ملا کہ بعد معائنہ پھر حکم دیا جاے گا۔ غرضکہ اب ہم لوگ حدود پلیٹ فارم سے باہر آئے اور عباس ابراہیم کے ساتھ ساتھ چلے۔ دو فرلانگ چلے ہونگے کہ ہمارا قیام گاہ یعنی رباط یا مسافر خانہ آگیا۔ یہ مسافر خانہ ابو زید وکیل کا ہے۔ ایک پھاٹک کے ذریعہ سے ہملوگ داخل ہوئے۔ اندر بہت وسیع صحن ہے۔ اوس کے سامنے لکڑی کے تختوں سے گھرا ہوا اور لکڑی کے تختوں سے چھایا ہوا مسافر خانہ ہے یعنی تین چار کمرے ہیں۔ زمین کچی ناہموار ہے اور اسقدر ناہموار ہے کہ کوئی دو فیٹ مربع جگہ اوس کی برابر نہیں ہے زمین پر کھجور کی چٹائی بچھی ہوئی ہے۔ اسی کے ایک کمرہ میں عباس ابراہیم ہم لوگوں کو لے گئے اور یہی ہمارا قیام گاہ بتلایا گیا۔ اوپر نظر کی تو چھت کے تختے ایک دوسرے سے بخوبی فاصلہ پر تھے۔ آسمان بخوبی نظر آرہا تھا۔ اسکو دیکھ کر عجیب

وحشت ہوئی لیکن اطمینان یہ تھا کہ یہ مجلس بہت تھوڑی دیر کا ہے کل انشاالله یہاں سے کوچ ہے۔ اب ہم لوگوں کو پھر اپنے اسباب کی فکر ہوئی۔ کیونکہ سیکڑوں حاجیوں کا اسباب مسافرخانہ کے صحن میں لاکر انبار کردیا گیا تھا اور سب مسافر اپنے اپنے اسباب کی تلاش کررہے تھے۔ میں اور شاہ محمد سلیم پھر اس کام پر تعینات ہوئے۔ بہزار خرابی اپنے ٹرنک اور بستر اور بورے تلاش کرکے اپنے کمرے تک بھجوایا اب معلوم ہوا کہ ایک ٹرنک اور بورا نہیں ہے۔ ہزار تلاش کی گئی نہیں ملا۔ عباس ابراہیم سے کہا۔ وہ بولے کہ کچھ فکر نہیں چلئے دوسرے رباط میں پہنچ گیا ہوگا۔ غرضکہ اگرچہ تھکان کیوجہ سے قدم اٹھنا دشوار تھا مگر ان کے ساتھ دوسرے محلہ میں گیا اور وہاں بھی صحن میں ایک انبار سامان کا نظر پڑا۔ اُس میں تلاش کرنے سے میرا سامان ملگیا اور میں قلی کے ذریعہ سے اُسکو اپنے مسافرخانہ تک لایا۔

اب شام ہوگئی ہے اور صبح سے اسوقت تک دم لینے کی فرصت نہیں ملی ہے۔ مسافرخانہ میں پانچ منٹ بھی نہیں بیٹھے تھے کہ پھر ڈاکخانہ گئے وہاں ایک خط بذریعہ ہوائی جہاز روانہ کیا۔ ہندوستان میں نو آنے محصول ادا کرنا ہوتا ہے یہاں ۱۴ آنہ لیا گیا۔ رسید مانگی نہیں ملی ڈاک کے محرر نے کہا کہ ایسے ہی ڈاک میں ڈالدو۔ مجبوراً ایسا ہی کیا پھر تار گھر گیا۔ صرف اسقدر مضمون بذریعہ تار کے روانہ کیا "بخیریت پہنچگئے" اسکا آٹھ روپیہ محصول دینا ہوا۔ یہاں سے واپس آتے آتے دن ختم ہوچکا تھا۔ مسافرخانہ کے صحن میں ہمارے ہمراہ جو پلنگ آئے تھے اونپر ہملوگ بیدم ہوکر پڑ گئے۔ اسیوقت الوزید وکیل کے آدمی وکیل صاحب کی فیس بحساب پانچ روپیہ فی مسافر تحصیل کرنے کے لئے پہنچے۔ ہملوگوں نے فوراً اپنی اپنی فیس ادا کی اسکے بعد عباس ابراہیم نے کہا کہ آپ لوگ جلد مکہ جانا مانگتا ہے تو چودہ روپیہ فی کس محصول لاری اسیوقت جمع کردیجئے۔ اسکی بھی تعمیل فوراً کیگئی۔ رات کو بازار کا کھانا کھایا۔ یہاں چپاتی کا پتہ نہیں۔ تنوری روٹیاں مختلف نمونہ کی ملتی ہیں۔ مزہ انکا بوجہ کثرت خمیر کے نہایت کھٹا ہوتا ہے۔ گوشت بلا نمک مصالحہ کا۔ گوشت سے ہملوگوں نے

پرہیز کرنے کا ارادہ پہلے ہی کر لیا تھا۔ دال ایک عجیب نمونہ کی مل گئی دو تولہ کے قریب کھائی گئی۔ بڑے بڑے سیم کے بیج کی طرح یہ دال ہوتی ہے۔ مصر سے آتی ہے بھول کہتے ہیں۔ پانی بدمزہ تھا۔ کچھ کھاری کچھ میٹھا۔ کچھ عجیب قسم کی ہیک یا بدبو اسمیں تھی۔ ڈر کے مارے صرف دو چار گھونٹ پیا۔ اللہ کا نام لے کر صحن میں سو رہے اگرچہ شبنم خوب تھی اور مضرت کا اندیشہ تھا مگر اس مجلس میں جس کا نام کمرہ تھا جانے کی ہمت نہیں پڑی۔

۲۶ مارچ ۱۹۳۱ء۔ صبح بہت تڑکے قبل نماز فجر آنکھ کھل گئی۔ بدن میں درد تھا۔ رات کا زیادہ حصہ جاگتے گذرا تھا۔ احاطہ کے اندر جو مسجد ہے اوسمیں میں نے اور شاہ محمد سلیم نے نماز باجماعت ادا کی۔ اسوقت نماز میں قریب سو آدمی کے تھے۔ نماز کے ارکان میں کچھ فرق محسوس ہوا جس میں سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ قریب نصف نمازیوں کے سورہ فاتحہ کے بعد آمین بآواز بلند کہتے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر اپنے خوابگاہ پر آئے اب اور رفیق بھی بیدار ہو چلے تھے۔ سب ضرورتوں سے فارغ ہوئے اور ہنوز آفتاب نہ نکلا تھا کہ حضرت حوا کے مزار کی زیارت کو چلے۔ یہاں سے مزار قریب ۱½ میل کے فاصلہ پر شہر سے باہر ہے۔ پیادہ پا گئے۔ کیونکہ یہاں کوئی سواری یکہ یا تانگہ کی طرح نہیں ہوتی۔ یہاں کا عربیہ بالکل الہ آباد کے ٹھیلہ کا نمونہ ہوتا ہے البتہ اس سے بہت بڑا اور بجائے دو پہیوں کے اس میں چار پہیہ ہوتے ہیں اور اس میں خچر یا ٹٹو جوتے جاتے ہیں۔ یہ ایک بہت بھاری اور بھدی چیز ہے۔ صرف اسباب لادنے کے کام آتا ہے۔ اس میں اتنا اسباب لادا جاتا ہے کہ الہ آباد کے تین ٹھیلوں پر ہرگز نہ سمائے خچر کے منہ میں لگام نہیں ہوتی۔ چمڑے کا تسمہ منہ کے باہر بندھا رہتا ہے۔ اوسی سے ایک رسی بندھی ہوتی ہے جو ہانکنے والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ہانکنے والا عموماً خچر کے ساتھ ساتھ دوڑتا ہوا چلتا ہے۔ غرضکہ ہملوگ پیادہ پا روانہ ہوئے۔ شہر کے باہر پہونچے۔ دور سے حضرت حوا کے مزار کا احاطہ نظر پڑا۔ قریب پہونچے۔ جب تین چار سو قدم باقی رہے ہونگے کہ وہاں پر مسافروں کا ہجوم تھا۔ سرکاری سپاہی

بید لئے موجود تھے۔ کسی کو حکم آگے بڑھنے کا نہ تھا۔ ہم لوگ سب سے پیچھے کھڑے ہوگئے احاطہ کیطرف دیکھا تو اُس کا پھاٹک پتھر سے چنا ہوا تھا۔ اندر جانا یوں بھی ناممکن تھا اور سرکاری پہرے نے قریب جانا بھی ناممکن کردیا۔ ہملوگ مایوس واپس ہوئے۔ راستہ میں آمدورفت کے وقت جس قدر بچے عورتیں اور مرد بھیک مانگتے نظر پڑے اونکی تعداد ہزارے کم نہ ہوگی۔ یہ لوگ راستہ چلنا دشوار کردیتے ہیں۔ ہاتھ پکڑ کر ہلاتے ہیں۔ آگے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اگر دو چار کو کچھ دیا گیا تو پچاسوں آکر اسطرح چھینک لیتے ہیں کہ جانبری مشکل ہوجاتی ہے۔ غرضکہ کچھ خیرات دیتے ہوئے اور کچھ جان بچاتے ہوئے مسافرخانہ واپس آئے۔ اب دو گھنٹہ دن چڑھ گیا تھا۔

مسافرخانہ پہنچتے ہی عباس دو جمال یعنی اونٹ والوں کو ہمراہ لائے۔ ہملوگوں کا اسباب دو اونٹ کا بوجھ قرار پایا۔ بحساب چودہ روپیہ فی اونٹ کرایہ طے ہوا اور بجز بستر اور ناشتہ دان وغیرہ کے کل اسباب اونٹ والوں کے حوالہ کیا گیا یہ اسباب تین روز بعد مکہ معظمہ پہونچے گا۔ ابھی ناشتہ بھی نہیں کرنے پائے تھے کہ عباس نے کہا کہ دونوں ڈاکٹر صاحبان کو کونسل دفتر چلنا چاہیے۔ وہاں پاس پورٹ داخل ہوگا اور مکہ جانیکی اجازت ملے گی۔ اب میں اور ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کونسل آفس روانہ ہوئے ہمارے مسافرخانہ سے اور دیگر مسافرخانوں سے پچاسوں آدمی ہم لوگوں کے ہمراہ تھے۔ دو میل چلنے کے بعد کونسل کا دفتر ملا۔ یہ ایک سہ منزلہ بڑی عمارت سمندر کے قریب جدہ کے مغربی کنارے پر ہے۔ اُس کے سامنے ایک چھوٹا سا میدان ہے۔ وہاں پچاسوں مسافر ہم سے پیشتر سے جمع تھے۔ عباس ہمراہ نہیں آئے تھے۔ کوئی اتنا بتلانے والا نہ تھا کہ اب ہملوگ کہاں جائیں اور کیا کریں۔ غرضکہ کچھ لوگوں کو اندر باہر آتے جاتے دیکھکر ہم لوگ بھی اندر داخل ہوئے اور ایک زینہ کے ذریعہ سے دوسری منزل پر پہونچے وہاں ایک کمرہ دفتر مثل ٹکٹ گھر کے تھا۔ اوسمیں مجمع کثیر جمع تھا۔ عباس نے کہدیا تھا کہ ابوزید وکیل کا آدمی وہاں ہے وہ بہت مدد دے گا۔ مگر اول تو وہ آدمی ملا نہیں اور جب بہزار جستجو ملا تو بالکل مخاطب نہیں ہوا۔ اوس نے صرف اتنا کہا کہ

اُصبر اُصبر- یعنی صبر کئے چپ چاپ بیٹھے رہو- اِس دفتر کے قریب ایک خالی کمرہ تھا اُس کی کھڑکیوں پر، ہم لوگ جاکر بیٹھ گئے- بیٹھے بیٹھے دو تین گھنٹہ گذر گیا- کوئی خبر لینے والا نہ ملا- جب ٹکٹ گھر کے کمرہ میں جائیں تو وہی مجمع کثیر- اوس کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں تھیں جسکے اُدھر کچھ عرب محرر جمع تھے جو اپنے کام میں نہایت سُست معلوم ہوتے تھے- اتنی دیر میں دس مسافر بھی نہ نبٹے- میں نے ہندوستان سے ایک خط مولوی احسان اللہ صاحب والئس کونسل کے پاس روانہ کیا تھا- میرا خیال ہوا کہ اُن سے ملوں- معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہیں- اسی اثنار میں اتفاقیہ معلوم ہوا کہ نیچے کی منزل میں گورنمنٹ ہند کا ایک شفاخانہ ہے- اسکو سنتے ہی میں نیچے گیا- وہاں ڈاکٹر عبدالحمید صاحب مڈیکل آفیسہ کام میں مصروف تھے- چند منٹ بعد میں نے انکو مخاطب کیا- جب اونکو معلوم ہوا کہ میں بھی ڈاکٹر ہوں تو بہت تپاک سے اور خصوصیت سے ملے- شام کے کھانے پر بلایا- میں نے معذرت کی- اُنھوں نے بمشکل معاف کیا- تمام دواخانہ کی سیر کرائی- میں نے ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کو بلواکر اُنسے ملوایا- اور اپنی دقت بیان کی- اُنھوں نے کہا کہ آپ اوپر چلئے میں ابھی آکر سب ٹھیک کردونگا- اب ہم لوگ پھر اوپر گئے اور انتظار شروع کیا- کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد ڈاکٹر صاحب آئے تو اُنھوں نے سب پاس پورٹ لیکر داخل کرائے اور میں نے اپنے ایک ہمسفر ڈاکٹر عبداللطیف کے تعلق یہ کام کیا کہ وہ رسید وغیرہ جو کچھ ملے خود لے لینگے- اب ہم میں تاب انتظار اور بھوک پیاس کی نہ تھی- ڈاکٹر لطیف صاحب نے منظور کیا- ہم لوگ واپس ہوئے- راستہ میں دو چار جگہ بھٹکنے کے بعد ہندوستان کے حساب سے قریب ایک بجے دن کے اور عرب کے حساب سے قریب آٹھ بجے دن کے اپنے جائے قیام پر بحالت تباہ پہونچے- وہی ناہموار زمین جس سے اتنی نفرت تھی بہت آرام دہ معلوم ہوئی- ذرا دم لیکر کچھ کھانا کھایا اور فوراً مکہ روانہ ہونے کی تیاری شروع ہوئی-

مسافر خانہ کے باہر موٹر لاریاں آگئیں- عباس نے عجلت شروع کی تین بجتے بجتے

ہملوگوں نے لاریوں پر اپنا سامان بھجوادیا۔ مسافرخانہ کے ملازمان جنھوں نے بجز تکلیف دینے کے ذرا بھی ہمدردی نہیں کی تھی بخشش لینے کے لئے آکھڑے ہوئے۔ سب کو کچھ نہ کچھ بخشش دی گئی اور ہم لوگ لاریوں پر سوار ہوئے۔ امید تھی کہ لاریوں پر بیٹھنے کے بعد روانگی جلد ہوجائے گی۔ مگر عرب میں ایسا نہیں ہوتا سات لاریاں مسافروں سے لدی ہوئی دھوپ میں کھڑی تھیں۔ سیکڑوں بھیک مانگنے والے جنمیں بچے۔ بوڑھے۔ جوان مرد عورتیں سب موجود تھے لاریوں کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ اگر ایک کو کچھ دیا گیا تو بیس اور آگئے اور انھوں نے ہاتھ پکڑ پکڑ کر ہلانا شروع کیا۔ اگر ان کی طرف نظر نہ کیجائے تو پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ کندھا پکڑ کر ہلاتے ہیں۔ غرضکہ دو گھنٹہ تک یہی ضیق رہی۔ خدا خدا کر کے لاری چلی۔ ہملوگوں نے سمجھا کہ اب روانگی ہوئی۔ لیکن دو فرلانگ چلکر جدہ کی شہر پناہ کے پھاٹک کے سامنے لاریاں روک دی گئیں۔ معلوم ہوا کہ اب یہاں پر پروانہ راہ داری ملے گا۔ اس کا انتظار کرتے کرتے دن ڈوب گیا۔ کبھی کبھی کوئی عرب پولیس والا آتا تھا اور مسافروں کو گنتا تھا مگر شائد کوئی بھی ایسا نہیں آیا کہ جس نے پورے طور پر گنتی گنی ہو۔ واحد۔ اثنین۔ ثلاثہ۔ اربع۔ خمسہ۔ ستہ کر کر کے سب چلے جاتے تھے اب سب مسافر گھبرا اٹھے اور کچھ چاہتے تھے کہ لاریوں سے نکلکر باہر کھڑے ہوں لیکن اس کا حکم نہیں۔ سب مسافر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہیں تاکہ ناخواندہ ملازموں کو گننے میں آسانی ہو۔ خدا خدا کر کے چراغ جلنے کے بعد لاریاں روانہ ہوئیں نصف فرلانگ کے بعد پھر رکیں۔ یا الہ اب کیا معاملہ ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں پٹرول بھرا جائیگا۔ خیر وہ بھی ضرورت پوری ہوئی اور مکہ معظمہ کی روانگی شروع ہوئی۔

جدہ سے مکہ معظمہ کا فاصلہ ۴۰ میل ہے۔ راستہ تھوڑی دُور پتھریلا ہے جس پر بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے ہیں لاریوں کے مسافر مثل گیند کے اوچکے جاتے ہیں ہماری لاری بہت پُرانی ہے۔ پُرزے ڈھیلے ہیں۔ اگر کسی جوڑ کے قریب ہاتھ رکھدیا تو لکڑیوں کے بیچ میں گوشت پس گیا۔ دو مرتبہ یہ اتفاق مجھکو پیش آیا۔ انجن پُرانا

ہے۔ بار بار پانی اُبلنے لگتا ہے۔ شوفر انجن کی ٹوپی کھول کر دور بھاگتا ہے۔ پانی آٹھ دس فیٹ اونچا فوارے کی طرح اوڑتا ہے۔ انجن کے اندر سے ایسی ہولناک آواز آتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اب انجن پھٹا۔ اگر ایک قطرہ انجن کے پانی کا کہیں پر پڑ جاتا ہے تو آبلہ اُٹھے بغیر نہیں رہتا۔ دوسرا پانی ڈالا جاتا ہے۔ لاری پھر چلتی ہے۔ تھوڑی دور جا کر پھر کھڑی ہوتی ہے۔ یہی تماشہ راستہ بھر رہا۔ راہ میں چار جگہ اسٹیشن یا پڑاؤ ملتے ہیں۔ یعنی کھجور کے پتوں سے چھائی ہوئی چند دوکانیں ہیں۔ جہاں پانی چار اور کچھ کھانے کی چیزیں ملجاتی ہیں۔ ہر پڑاؤ پر لاریوں کا کھڑا ہونا لازم نہیں ہے نصف راستہ طے کرنے کے بعد ایک منزل پر ٹیلیفون بھی ہے۔ عباس نے بذریعہ ٹیلیفون اپنے گھر پر ہم لوگوں کی آمد کی اطلاع کی قریب آدھ گھنٹہ بعد پھر روانگی ہوئی۔ جدہ سے تین چار میل چلنے کے بعد پتھریلا راستہ ختم ہو جاتا ہے۔ ریگستان شروع ہو جاتا ہے جو نصف راستہ طے کرنے کے بعد ایسا ہے کہ اکثر و بیشتر لوگوں کو وہی مصیبت پیش آتی ہے جو ہم لوگوں کو ہوئی۔ یعنی قریب دس بجے رات کے لاری بہت تیزی سے چلی جا رہی تھی۔ کہ اکبارگی اُس کے پہیے کمانی تک بالو کے اندر دھنس گئے۔ انجن ہزار زور کرتا ہے۔ جنبش نہیں ہوتی۔ ہملوگ اُتارے گئے جیک کے ذریعہ سے پہیے اُٹھائے گئے۔ نیچے پتھر چُن چُن کر رکھے گئے۔ ذرا جنبش ہوئی کہ پھر انجن رکا۔ اب سب عورتیں پیادہ پا۔ ڈاکٹر سراج الحسن اور بھائی صاحب لاری کے اندر اور باقی سب مسافر لاری ٹھیلنے پر تعینات ہوئے۔ عباس اور شاہ محمد سلیم اور میرے ذمہ خاصکر یہ مشقت تجویز کی گئی۔ شکر ہے کہ اُسوقت چاندنی رات تھی۔ اُس لق و دق ریگستان میں ماہ تاباں عجیب پُر لطف تھا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جس کے لئے صحرائے عرب کی شب مشہور ہے چل رہی تھی۔ دلوں میں شوق و ذوق کا وفور تھا۔ غرضکہ خوب خوب زور لگائے گئے اور لاری کو قریب ایک فرلانگ کے ڈھکیل لے گئے۔

جس قدر خوش دلی اور جوش کے ساتھ یہ محنت برداشت کی گئی قابل بیان

نہیں ہے۔ عباس اور شوفر اور خلاصی تو جیا جیا کمر زور لگاتے تھے۔ شاہ سلیم اگرچہ پسینہ سے ہم لوگوں کی طرح بلکہ بہ اعتبار جسامت ہم سے زیادہ تر بتر تھے لیکن نہایت خلوص کے ساتھ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے اور کوئی دعا بھی پڑھتے جاتے تھے۔ مجھ کو حافظ کے دو شعر یاد آ رہے تھے جس کو اپنی بھدی آواز میں میں الاپتا جاتا تھا۔ وہ شعر یہ ہیں۔

در بیاباں گر بہ شوق کعبہ خواہی زد قدم سر زنشہا گر کند خار مغیلاں غم مخور

گرچہ منزل بس خطرناک است و مقصد ناپدید ہیچ راہے نیست کو را نیست پایاں غم مخور

غرضکہ اس خشک دلدل سے جب ہمارا مرکب یعنی موٹر نکلا تو ہم لوگ پھر سوار ہوئے اور قریب ساڑھے گیارہ بجے شب کے مکہ معظمہ کے دروازہ پر جا پہنچے۔ یہاں معلوم ہوا کہ شہر کے اندر موٹر جانیکا حکم نہیں ہے۔ صرف سرکاری موٹر جاتے ہیں۔ غریب حاجی بیرون شہر اوتار دئے جاتے ہیں۔ دوسری غلطی عباس نے کی کہ موٹر کے پڑاؤ سے اپنے گھر تک کے فاصلے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ لاری سے اتر کر اس نے قلیوں پر اسباب لدوایا اور اپنے دو بھائیوں کو ہم لوگوں سے ملوایا جو ہمارے خیر مقدم کیلئے یہاں پیشتر سے موجود تھے اور ہم لوگ پیادہ پا عباس کے گھر کیطرف چلے۔ ڈاکٹر سراج الحسن صاحب نے بعذر ضعف بصارت میرے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا لیکن ابھی سو قدم بھی نہ چلے ہونگے کہ انکے ہاتھ کا بوجھ کندھے پر گراں معلوم ہونے لگا یہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنا جسقدر بوجھ لاد سکتے تھے میرے کندھے پر لادا یہاں خود ہی ایک ایک قدم اوٹھانا مشکل ہو رہا تھا کہ اونکے بوجھ نے تمام بدن اور پیروں کو اور بھی شل کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب نے کراہنا شروع کیا اور جھکتے جھکتے بالکل دوتا ہو گئے اور راستہ تھا کہ کسی طرح ختم نہ ہوتا تھا نصف راستہ کے قریب شاہ سلیم نے ڈاکٹر صاحب کے بار گراں کو اپنے کندھے پر سنبھالا اور مجھ کو سبکدوش کیا مگر راستہ بھر یہ معلوم ہوتا رہا کہ بایاں کندھا جس پر ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ رکھا تھا کوئی دبائے دیتا ہے۔ غرضکہ قریب ڈیڑھ میل چلنے کے بعد عباس صاحب

کے گھر قریب ساڑھے بارہ بجے رات کو پہنچے۔ یہ مکان محلہ مسفلہ میں ایک کوچہ سربستہ کے اندر واقع ہے۔ دروازے پر ایک بڑے ہنڈے کی روشنی ہو رہی تھی۔ تمام گلی جگمگا رہی تھی دروازہ پر حافظ محمد ابراہیم صاحب جو اصل معلم ہیں یعنی عباس کے والد ماجد اور عباس کے بھائی حسن۔ حسین۔ احمد۔ اسحاق اور دیگر چند اعزا ہمارا خیر مقدم کرنے کے لئے موجود تھے۔ نہایت محبت اور تپاک سے مصافحہ اور معانقہ کے بعد ہم لوگ عربی کرسیوں پر بیٹھے۔ عرب کی کرسی ہندوستان کے ایک بڑے تکیہ دار بنچ کے مشابہ ہوتی ہے۔ پائے بہت اونچے۔ چوڑائی قریب دو فیٹ کے پشت کیطرف لکڑی کا چوکھٹا اور بناوٹ کھجور کے بادی۔ اسی کو یہاں عموماً کرسی کہتے ہیں جو ہر عرب کے دروازہ پر اور ہر دوکان کے سامنے اور ہر قہوہ خانہ میں کثرت کے ساتھ بچھی رہتی ہیں۔ کرسی پر بیٹھتے ہی پیر زمین سے اٹھ جاتے ہیں۔ ایک کرسی پر تین چار آدمی بہ آسانی بیٹھ سکتے ہیں۔ رات کو جو عرب گھر کے باہر سوتے ہیں وہ انھیں کرسیوں پر سوتے ہیں اور میں نے جابجا ان کرسیوں پر لوگوں کو نماز پڑھتے بھی دیکھا۔ حافظ ابراہیم صاحب کی عمر چوراسی سال کی بتلائی گئی۔ ابھی مضبوط ہیں۔ اچھی طرح میلوں پیادہ پا چلتے ہیں۔ آنکھوں سے قدرے معذور ہو چلے ہیں۔ ابھی دو برس ہوئے پہلی تین بیویوں کے یکے بعد دیگرے انتقال کے بعد چوتھا نکاح کیا ہے۔ اس بی بی کی حافظ صاحب نے وقتاً فوقتاً نہایت تعریف کی اور بیان کیا کہ اس ضعیفی میں جو تندرستی ایسی اچھی ہے اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ بیوی نہایت خدمت گذار نیک دل اور خدا ترس عورت ہے۔ حافظ ابراہیم صاحب نے رائے دی کہ طواف کعبہ اور سعی اسی وقت فراغت کر لینا بہتر ہے صبح کو دھوپ ہو جائے گی اور نہایت تکلیف ہوگی۔ سب رفقا نے اتفاق کیا اور ہم لوگ وضو سے فراغت کرکے عباس کے بھائی حسن ابراہیم کے ساتھ حرم شریف کی طرف روانہ ہوئے۔ حرم شریف عباس کے مکان سے بہت قریب ہے۔ آہستہ آہستہ چلکر سات آٹھ منٹ میں پیادہ ہملوگ وہاں پہونچ گئے۔ راستہ بھر

حسن ابراہیم لبیک پڑھتے جاتے تھے ہم لوگ بھی اون کی تقلید کرتے جاتے تھے۔ بہ آواز بلند دعائے حج وزیارت و توفیق نیک کی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کہتے جاتے تھے۔ ہم لوگ اس کو دہراتے جاتے تھے۔ باب السلام سے ہم لوگ داخل ہوئے۔ بیت اللہ پر نظر پڑتے ہی تمام بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ بدن میں جنبش ہونے لگی۔ اعمال بد کی یاد نے بدن کو پسینہ پسینہ کردیا۔ دل کی جو حالت ہوئی بیان کے قابل نہیں۔ ایک محویت کا عالم طاری ہوگیا۔ حسن ابراہیم نے بہ آواز بلند کہا کہ آپ لوگ دو رکعت نماز تحیۃ مسجد ادا کریں۔ ہم لوگوں نے تعمیل کی اور نماز عشا جو اس وقت تک نہیں پڑھ سکے تھے باجماعت ادا کی شاہ محمد سلیم صاحب نے نماز پڑھائی۔ پھر ہم لوگ بیت اللہ کے قریب حاضر ہوئے مقام ابراہیم کے قریب جہاں پیشتر کسی زمانہ میں باب السلام کا پھاٹک تھا اور جہاں اب بھی ایک محراب باب السلام بنا ہوا ہے اسی باب السلام سے داہنا قدم آگے رکھ کر آگے بڑھے۔ یہاں سے سنگ مرمر کا فرش ہے پہلے مقام ابراہیم تک آئے پھر اور آگے بڑھے اور دس بارہ قدم بڑھے ہوں گے کہ ہم لوگ بیت اللہ کے سامنے حاضر تھے۔ سنگ اسود کو بوسہ دیا۔ پیچھے ہٹے اور حسن ابراہیم کی تقلید میں سات طواف کئے۔ پھر در بیت اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر بہ تقلید حسن ابراہیم دعا پڑھی۔ کوئی شخص ہمارے رفقا میں سے ایسا نہ تھا کہ جس پر گریہ طاری نہ تھا اور جو لرزاں اور ترساں نہ تھا۔ بعد فراغت طواف بیت اللہ سے باہر آئے اور صفا مروہ کے مابین سات مرتبہ دوڑے۔ صفا مروہ دو پہاڑیاں بیت اللہ کے قریب ہی ہیں۔ دونوں کے مابین کا راستہ بیت اللہ کے دو تین پھاٹکوں کے سامنے ہی سے گذرتا ہے۔ دونوں پہاڑیوں کے مابین کا فاصلہ کم از کم ایک فرلانگ ہے اب صرف پہاڑیوں کے نشان نظر آتے ہیں۔ دونوں پہاڑیوں پر عمارتیں ہیں اور راستہ میں نہایت عمدہ عمدہ دکانیں سوداگروں کی ہیں اور مکہ کا بہترین بازار صفا و مروہ کا بازار ہے۔ ہم لوگوں کو حسن ابراہیم نے اپنے ایک نائب کے سپرد کردیا جس نے یہ رکن بھی ادا کرایا۔ ہر مرتبہ کچھ دور دوڑ کر چلنا ہوتا ہے بقیہ راستہ معمولی چال سے

طے کرنا ہوتا ہے۔

معلّم یا اوسکا نائب دعا پڑھواتا جاتا ہے مقلدین وہی الفاظ دُہراتے جاتے ہیں اس رکن کے ادا کرتے کرتے ہملوگ تھک کر چور ہو گئے۔ مجھپر تکان سفر اور اوسپر گناہوں کا بوجھ اور اس سے زیادہ ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کے ہاتھ کا بوجھ تھا لیکن اس بوجھ کو شاہ سلیم صاحب اپنے کندھوں پر کبھی کبھی لے لیتے تھے۔ غرضکہ یہاں سے فارغ ہوکر ہملوگ گرتے پڑتے گھر پہنچے۔ اب ہندوستان کے حساب سے رات کے دو بج چکے تھے۔ عباس وغیرہ جاگ رہے تھے اور ہملوگوں کے منتظر تھے۔ کھانا تیار تھا۔ عباس اور ان کے بھائیوں نے نہایت مدارات سے کھانا کھلایا اور ہملوگ زمین کے فرش پر دراز ہوکر فوراً سو گئے۔

۲۷ مارچ سے ۵ اپریل ۱۹۳۱ء تک ہم لوگ مکہ معظمہ میں مقیم رہے۔ جہانتک ممکن ہوا نمازیں بیت اللہ کے اندر ادا کرتے رہے۔ روزمرہ کئی کئی مرتبہ طواف کعبہ کرتے تھے شام کے وقت اکثر عصر کے وقت کی نماز سے عشاء کی نماز کے بعد تک صحن بیت اللہ میں بسر کرتے۔ خانہ کعبہ کی زیارت میں محو رہتے۔ اگر کوئی چیز اس میں مخل ہوا کرتی تھی تو وہ بھیک مانگنے والے بچوں - لڑکیوں عورتوں اور مردوں کا گروہ ہوتا تھا انمیں سے کسی کو اگر کسی نے ایک قروش یعنی ایک آنہ یا ایک حلالہ یعنی ایک پیسہ دے دیا تو پھر اس پر چاروں طرف سے ایسا نرغہ ہوتا تھا کہ جان بچانا مشکل ہوتا تھا۔ اگر ان سے تنگ آکر کوئی کمزور حاجی بھاگتا تو یہ سب اُس پر دوڑتے اور اُسکو دھکا دیکر گرا دیتے لیکن لوٹ مار کی نوبت نہیں آنے پاتی تھی کیونکہ سرکاری سپاہی جو کثرت سے اِدھر اُدھر موجود رہتے ہیں فوراً بید لیکر دوڑتے اور اُن پر اچھی طرح ہاتھ صاف کر کے اونکو منتشر کر کے غریب حاجی کی جانبری کرتے۔ لیکن اس حد تک نوبت کم پہنچتی تھی۔ اکثر بھیک مانگنے والیاں دست طلب دراز کرتیں اور جہاں اللہ کریم اللہ کریم کہا وہ خاموشی سے آگے بڑھ جاتیں۔ اگر کوئی شخص مراقبہ میں ہے یا دعا میں مشغول ہے تو یہ بھیک مانگنے والے بلا تکلف اُس کا ہاتھ یا شانہ پکڑکر

ہلاتے اور پیسہ مانگتے تھے۔

ایک روز ہم لوگوں کی موجودگی میں داخلہ کے لئے خانہ کعبہ کا دروازہ کھلا تھا۔ مجھ کو بھی داخلہ کا موقع مل گیا جس کی کیفیت بیت اللہ کے حالات کے ضمن میں بیان کی گئی ہے۔

بیت اللہ کے اندر جب تک قیام رہتا زمزمی برابر چھوٹے چھوٹے کٹورے اور مخروطی صراحیاں لئے ہوئے سامنے سے گذرتے۔ آب زمزم پیش کرتے اور ہم لوگ خوب سیر ہو ہو کر پیتے۔

حجر اسود کے بوسہ کا موقع کم ملتا تھا۔ حاجیوں کی کثرت اُوس جگہ پر اتنی ہوتی ہے کہ دو سپاہی بید لئے تیار رہتے ہیں اور بید کا استعمال حجر اسود کے بوسہ کے شائقین پر آہستہ آہستہ برابر ہوتا رہتا ہے اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو حجاج کشمکش سے باخود با خوب چوٹیں کھائیں۔ ہم لوگ اسی وجہ سے ہر طواف کے بعد دور ہی سے ہاتھ کے اشارہ پر اکتفا کرتے تھے۔

ایک روز ہمارا قافلہ جنت المعالی کی زیارت کے لئے گیا۔ یہ مقام حضرت رسول کریم کے زمانہ مبارک میں بھی قبرستان تھا جیسا کہ اب تک ہے۔ وہاں جاکر بہت افسوس ہوا دیواریں شکستہ۔ قبریں منہدم۔ کوڑہ کرکٹ اور مزاروں کے ٹوٹے ہوئے روڑوں سے زمین نہایت ناہموار۔ اسی کے احاطہ سے قریب دامن کوہ پر حضرت خدیجہ الکبریٰ کا مزار مبارک اور مقبرہ تھا۔ مقبرہ کی عمارت کھود ڈالی گئی ہے اور اسطرف جانے کی ممانعت ہے۔ دور سے فاتحہ پڑھی اور ہملوگ نہایت افسردہ خاطر یہاں سے واپس ہوئے۔

مکہ معظمہ کے شہر کے قریباً وسط میں مولد النبی تھا یعنی وہ مکان جہاں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تھی۔ اس مکان کے حالات میں نے سفرناموں میں دیکھے تھے۔ لوگ اس مقام کی زیارت کو عین سعادت سمجھتے تھے اوس کے اندر دو رکعت نماز نفل ادا کرتے تھے۔ اس مکان کے اندر اسقدر عود سلگایا

جاتا تھا اور اتنا عطر چھڑکا جاتا تھا کہ اُسکی خوشبو ہوا کے ساتھ مکہ معظمہ کے بازار
میں دور دور تک پہونچتی تھی۔ ہم لوگ جنت المعالی سے سیدھے مولد النبی کی طرف
روانہ ہوئے۔ جو حال وہاں کا دیکھا قابل بیان نہیں۔ مکان کھود ڈالا گیا ہے۔ اوسکے
وجود کا صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ دو ایک جگہ بنیاد کے منہدم نشانات موجود ہیں
باقی عملہ اینٹیں لکڑیاں وغیرہ کھود واکر کہیں دور پھنکوا دیا گیا ہے۔ ایک مربع
قطعہ زمین کا قریباً ساٹھ فیٹ لانبا اور پچاس فیٹ چوڑا باقی ہے۔ جس پر خردہ فروش
دُکاندار اپنی چھوٹی چھوٹی دکانیں لئے بیٹھے تھے باقی تمام حصہ پر کوڑا کرکٹ پڑا ہوا
تھا۔ قریب کے مکانوں کا سایہ جس حصہ پر تھا وہاں دو ایک گدھے اور دو تین
کتے آرام کر رہے تھے۔ اب ضبط کی طاقت کس کے دل میں باقی تھی۔ کوئی ایسا
نہ تھا جس کی آنکھوں سے آنسو نہ جاری ہوں۔ معلوم ہوا کہ اسی مقام کے قریب
"مولد علی" بھی ہے اوس کی بھی یہی حالت ہے لیکن اب کس کے پیروں میں طاقت
اور دل میں سکت باقی تھی جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مقام ولادت کو بھی
ایسی حالت میں جاکر دیکھتا۔ ہملوگ سیدھے عباس ابراہیم کے مکان کی طرف
واپس ہوئے۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور سب پر مُہر خاموشی لگی ہوئی تھی
راستہ بھر کوئی گفتگو آپس میں بھی نہیں ہوئی۔

دوسرے روز مکہ معظمہ کے شہر اور بازار گھومنے کے لئے گئے۔ یہاں سڑکیں عموماً
تنگ ہیں۔ آمنے سامنے کی دکانوں کا فاصلہ اسقدر کم ہے کہ اُس پر کھجور کی شاخیں
اور پتے اور لکڑی کے تختے رکھ کر سایہ دار کر دیا گیا ہے۔ صفا مروہ کا بازار بھی اسیطرح
سایہ دار ہے لیکن یہاں پر سڑک بہت کشادہ اور چوڑی ہے یعنی قریباً چالیس فیٹ
کی چوڑائی اس سڑک کی کوہ صفا سے کوہ مروہ تک ہے۔ صفا مروہ دوڑنے کے وقت
یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک اچھے آباد گنجان شہر کے اندر ہملوگ دوڑ رہے ہیں۔ اِسکے
دونوں جانب نہایت عمدہ دکانیں سوداگروں کی ہیں اور حج کے دنوں میں یہاں تجارت
کا بازار خوب گرم رہتا ہے کپڑے۔ برتن۔ پھل۔ ترکاریاں۔ تسبیح۔ ولایتی سامان

ہانڈیاں - چاے کے برتن - وغیرہ وغیرہ نہایت عمدہ اور کثرت سے ہر جانب سجے رہتے ہیں - ایک دوکان یہاں انگریزی دواخانہ کی بھی ہے - بڑے بازار کی سڑک خوب چوڑی اور کشادہ ہے یہاں پر شام کو میں نے بذریعہ موٹر لاری کے آبپاشی ہوتے دیکھا اور یہ آبپاشی کی مشین نہایت عمدہ حالت میں تھی اور اس سے اس زور سے پانی کی دھاریں نکلتی تھیں کہ کل سڑک جو چالیس فیٹ سے کم چوڑی نہ تھی ایک ہی مرتبہ میں تر ہو جاتی تھی -

مکہ معظمہ کے مکانات عموماً چار منزلہ ہوتے ہیں - کمروں کے اوپر کمرے بناتے ہیں - بالائی منزل پر صحن ہوتا ہے - کمروں کے سامنے خوبصورت چھجہ یا بالکونی ایک ضروری جزو ہر مکان کا ہوتا ہے -

آجکل یہاں بازار میں گاجر ۱ ؍ سیر - مولی پیسہ کی دو - خرفہ ۲ ؍ سیر - ولایتی بینگن ۲ ؍ سیر اور قریب قریب کل ترکاریاں ہندوستان کی قریباً اسی نرخ سے ملتی ہیں - ارہر کی دال یہاں نہیں ملتی - آٹا عموماً مشین کا پسا ہوا ملتا ہے - یہاں بازار کی روٹی کھانے کا عام رواج ہے - زیادتی خمیر کی وجہ سے یہ کھٹی ہوتی ہے اور اندر سے کچی بھی ہوتی ہے -

سڑی ہوئی اور سوکھی مچھلیاں بازاروں میں بکثرت بکتی ہیں - سڑکوں اور دکانوں پر سوکھی ہوئی بودار مچھلیوں کا ڈھیر لگا ہوتا ہے جس کے قریب سے گذرنا مشکل ہوتا ہے - عرب اس کو شوق سے کھاتے ہیں یہی حال مدینہ کا ہے اور درمیانی منزلوں پر بودار مچھلیاں بکثرت ملتی ہیں - سوکھی مچھلیوں کو پہلے تھوڑی دیر کے لئے پانی میں ڈوبا دیتے ہیں - جب وہ کچھ پھول جاتی ہے تو انکو پکا کر کھاتے ہیں -

عورتوں میں پردہ کا رواج اسی قدر ہے کہ وہ برقع پہنکر باہر نکلتی ہیں - برقعہ میں علاوہ آنکھ کے سب حصہ بند ہوتا ہے -

مرد یہاں کے ایک بڑے لمبے کرتہ کے اوپر ایک چھوٹا کوٹ جو انگریزی کوٹ

سے بہت مشابہ ہوتا ہے پہنتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ فیشن یہاں کب اور کس طرح آیا نجد کے لوگ اور سرکاری ملازم سر پر ایک رومال رکھ کر اس کے کونے ادھر ادھر شانوں پر لٹکائے رہتے ہیں اور اس کو سر پر ایک گول موٹے ریشم یا سوتی رسی باندھ کر قائم رکھتے ہیں۔ پولیس کی وردی قریباً ہندوستانی پولیس کی وردی کیطرح ہے لیکن ان کے سر پر دوپٹہ یا رومال رسی سے بندھا ہوا برا معلوم ہوتا ہے۔ خاصکر اسوجہ سے کہ ماتھے پر ایک ذرا سا گھونگھٹ بھی نکالے رہتے ہیں اور پولیس کے کام میں بجائے چاق و چوبند ہونے کے یہ گھونگھٹ مخل بھی ہوتا ہے۔

یہاں صفائی کا انتظام اچھا نہیں ہے۔ مکانوں میں سنڈاس بنے ہوئے ہوتے ہیں جو سال دو سال بعد صاف کئے جاتے ہیں۔ ان سنڈاسوں کے اندر مچھروں کی کان ہوتی ہے جو رات کو سنڈاسوں سے نکل کر انسانوں پر حملہ کرتے ہیں۔ میں نے یہاں اکثر مریض بخار کے دیکھے جن کی ٹلحال بڑھی ہوئی تھی اور جن کے خون کی سرخی بہت کم ہو گئی تھی۔ یہ سب میری رائے میں ملیریا کے مریض تھے حاجیوں کو یہاں اکثر پیچش کی شکایت ہو جاتی ہے۔ عرب چائے بہت پیتے ہیں اور سگریٹ ہر وقت پیتے رہتے ہیں۔ تمباکو اور چائے یہاں عموماً عدن سے لائے جاتے ہیں۔ سگریٹ عام طور پر خود بنا کر پیتے ہیں۔ بنے ہوئے سگریٹ مصر سے آتے ہیں۔ تمباکو اور چائے کی کاشت کیطرف یہاں توجہ نہیں کیجاتی ورنہ بہت نفع ہو۔ ترکاریاں سب پیدا ہو سکتی ہیں مگر توجہ اسطرف نہیں ہے۔ سنڈاسوں کی کھاد جب سال دو سال بعد نکالی جاتی ہے تو شہر کے باہر دور پھینک دی جاتی ہے۔ کاشتکاری کے کام میں نہیں لائی جاتی۔

ہم لوگوں نے غار حرا وغیرہ جانا چاہا مگر معلوم ہوا کہ وہاں جانے کی ممانعت ہے۔ ہمارے معلم نے ۲۸ مارچ کو ہر ایک حاجی سے دو سو چودہ روپیہ وصول کر لیا تھا۔ یعنی ایکسو ساٹھ روپیہ کرایہ موٹر آمد و رفت مدینہ منورہ اور چون روپیہ فیس معلمی اس روپیہ کی کوئی رسید نہیں دیگئی نہ تفصیل بتلائی گئی۔ بعد میں رفتہ رفتہ معلوم ہوا

کہ اس چون روپیہ میں کرایہ مکان اور کرایہ اُس خیمے کا شامل ہے جو سفر عرفات میں ملے گا۔ معلم صاحب نے ہم سے بتلایا کہ کرایہ موٹر حکومت کے دفتر میں جمع کردیا گیا۔ جس تاریخ کو اجازت ملے گی اوسی تاریخ کو ہملوگ روانہ ہوسکیں گے اور جس کمپنی کو حکم ہوگا اوسی کمپنی کے موٹروں پر ہم لوگ روانہ ہونگے۔ کرایہ موٹر داخل کرنے کے دو تین روز بعد ہملوگ روانگی مدینہ طیبہ کے لئے بہت بیقرار ہوئے صبح شام ہمارے معلم صاحب کا آدمی دفتر جاتا اور واپس آکر کہتا کہ آج حکم نہیں ہوا۔ انشاء اللہ کلہ ضرور مل جائے گا۔

۱۴ اپریل کی صبح کو نہایت انتظار اور اشتیاق بلکہ بے صبری کے عالم میں ہملوگ بیٹھے تھے کہ حسن ابراہیم نے آکر اطلاع دی کہ الحمدللہ مدینہ جانے کا حکم نافذ ہوگیا۔ ہملوگ علی جان کمپنی کے ذریعہ سے کل صبح مدینہ روانہ ہوجائیں گے اُسوقت کی خوشی کا عالم قابل تحریر نہیں۔ فوراً ہمارے سب رفیق تیاری سفر میں مشغول ہوئے۔ میں اور شاہ سلیم اور ڈاکٹر سراج الحسن صاحب دفتر علی جان موٹر کمپنی جس کا نام "الجنہ سیارہ" تھا گئے۔ وہاں کے مینیجر صاحب سے ملاقات کی۔ آدمی بہت خلیق تھے۔ ہم نے درخواست کی کہ ہمکو موٹر مضبوط دیا جائے تاکہ راستہ کے حوادثات سے محفوظ رہیں۔ انھوں نے اطمینان دلایا۔ انکی عمر قریب پینتالیس سال کی تھی۔ اثنائے گفتگو میں معلوم ہوا کہ ان کے اعزا دہلی سے آئے تھے۔ اور لوگ کبھی کبھی ہندوستان آتے جاتے رہتے ہیں۔ مگر انھوں نے ابتک سمندر اور جہاز نہیں دیکھا۔ یعنی دنرات انکے موٹر جدہ جاتے رہتے ہیں اور صرف چار پانچ گھنٹہ کا سفر ہے مگر اب تک انکو جدہ جانے کا بھی اتفاق نہیں ہوا۔ ہملوگ شام تک مکہ معظمہ کی سیر میں مصروف رہے۔ عصر مغرب اور عشاء کی نمازیں حرم شریف میں پڑھیں۔ شب میں ایک رفیق سفر نے راستہ کے لئے ناشتہ پراٹھے اور حلوہ وغیرہ تیار کیا۔ اس کے بعد ہم لوگ حسین ابراہیم کے مکان پر سونے کے لئے گئے۔ یہ مکان مسفلہ محلہ میں عباس کے مکان سے بہت فاصلہ پر تھا۔ لیکن عباس کے

مکان پر مچھروں نے سونا ناممکن کر دیا تھا۔ کئی شبیں جاگتے گذری تہیں۔ اس لئے عباس نے اپنے بھائی حسین کے گھر پر ہم لوگوں کے سونے کا انتظام کر دیا تھا۔ اس مکان میں بڑا صحن تھا جو مکہ معظمہ کے لئے ایک غیر معمولی بات ہے۔ ہم لوگ اس صحن میں کمبل اوڑھ کر سوتے تھے۔ اسوجہ سے مچھروں سے بہت کچھ پناہ ملتی تھی۔ غرضکہ قریب بارہ بجے رات کے یہاں پہنچے۔ ایک ہلکی نیند لی۔ صبح تڑکے مکان پر پہنچے اور (۵ اپریل ۱۹۳۱ء) فوراً عربیہ پر بیٹھ کر مکہ گیٹ روانہ ہوے۔ یہاں طلوع آفتاب کے وقت ہم لوگ پہنچ گئے۔ یہاں سات موٹر موجود تھے۔ جو موٹر لاری ہمارے قافلہ کو دیگئی وہ نہایت عمدہ اور بالکل نئی تھی۔ اسکا شوفر مکی نامی اپنے فن میں بہت ہوشیار تھا۔ تیرہ آدمی اس پر بیٹھے۔ اسیطرح چھ دیگر لاریاں لدیں اور ایک موٹر خالی اسباب مرمت موٹر سے لدا ہوا تھا جس پر ایک مہندس یعنی موٹر مستری ہمراہ جانے کے لئے موجود تھا۔ قریب ایک گھنٹہ دن چڑھے سب لاریاں روانہ ہوئیں۔ پہلی چوکی جہاں مسافر جانچے جاتے تھے مکہ گیٹ سے بہت قریب یعنی قریباً دو فرلانگ فاصلہ پر ہے۔ یہاں سب موٹر روکے گئے۔ حسب دستور نہایت توقف ہوا۔ ایک شخص آیا۔ مسافروں کو گن کر چلا گیا۔ دوسرا آیا گن کر چلا گیا۔ قریب دو گھنٹہ بعد خدا خدا کر کے پروانہ روانگی ملا۔ پانچ موٹر آگے ہوئے۔ چھٹا نمبر ہمارے موٹر کا تھا کیونکہ مکی بہت ہوشیار ڈرائیور اور مستری تھا۔ اگر کوئی موٹر راہ میں بگڑتا تو یہ اوسکی مرمت میں مدد دیتا۔ ہمارے پیچھے خالی موٹر اسباب سے لدا ہوا تھا۔ مکہ سے جدہ تک کا راستہ بلا زیادہ دقت کے طے ہوا۔ ہملوگ ۱۲ بجے دن کے قریب جدہ پہنچے۔ یہاں الجنہ کمپنی کے دفتر کے سامنے سب لاریاں روک دی گئیں۔ عباس ہمارے ہمراہ تھے۔ یہ اور مکی ناشتہ وغیرہ کے لئے کہیں چلدیے۔ ہم لوگوں پر تاکید کر گئے کہ کہیں کوئی چلا نہ جائے بہت جلد روانگی ہوگی۔ اب پھر انتظار شروع ہوا تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر سراج الحسن کو ضرورت بیت الخلاء کی ہوئی۔ بڑی دقت سے ایک بہت تنگ اور کثیف گوشہ نصیب ہوا۔ انھوں نے اپنی ضرورت رفع کی سب

مسافر پیاسے ہوئے۔ پانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ تھوڑا تھوڑا پانی ہمراہ تھا وہی کام آیا۔ غرضکہ انتظار روانگی کرتے کرتے عصر کا وقت ہوگیا۔ اُس وقت عباس اور مکی نظر آئے اور دیگر موٹروں کے ڈرائیور بھی آئے۔ یہاں سے روانہ ہوئے۔ جدہ گیٹ پر پہنچکر سب موٹر پھر روکدیئے گئے۔ یہاں پر پھر نہایت توقف جانچ پرتال میں ہوا۔ مغرب کے قریب مدینہ طیبہ کی طرف روانگی ہوئی۔ جدہ سے مدینہ طیبہ کی طرف بحر قلزم کے کنارے کنارے موٹر کا راستہ ہے۔ سمندر کا منظر شام کے وقت نہایت دلچسپ اور پُر لطف تھا۔ راستہ نہایت ہموار اور زمین کی قدرتی نرمی کی وجہ سے میلوں تک یہ معلوم ہوتا تھا کہ پانی چھڑکا گیا ہے۔ زمین نہایت ہموار اور باریک باریک چکنے پتھر کے ٹکڑے بجری کی طرح بچھے ہوئے۔ قریب تیس میل کے بعد ریگستان شروع ہوا۔ لق و دق میدان اور ریت کے ٹیلے اور پہاڑیاں ہر طرف نظر آنے لگیں۔ ریگستان میں دو ایک پرانی شکستہ لاریاں ملیں جو اتفاق سے یہاں ٹوٹ کر پڑی رہ گئیں تھیں۔ الہ آباد کے حساب سے قریب پانچ بجے شام کے جدہ سے روانہ ہوکر برابر نہایت تیزی سے لاریاں دوڑتی رہیں۔ رات کا بڑا حصہ گذرنے کے بعد مسافر نیند سے جھومنے لگے جب آنکھ کھلتی تو دیکھتے کہ لاریاں اسی تیزی سے چلی جا رہی ہیں۔ غرضکہ تین بجے صبح کے قریب رابق کی منزل پر پہنچے یہاں لاریاں رکیں۔ رابق کی منزل مثل دیگر منازل کے جنگلی لکڑی کے ستونوں پر کھجور کے پتوں کا چھپر ہے۔ آرام کے لئے کھجور کے بنے ہوئے پلنگ جنکو یہاں کرسی کہتے ہیں بچھے ہوئے تھے۔ ہم لوگ نیند کے متوالے تکان سفر سے چور ان کرسیوں پر جا پڑے۔ نیند نے فرشتہ رحمت کا کام کیا۔ ابھی نیند پوری کیا بلکہ تھوڑی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس رباط کے بھٹیارے نے جگا دیا اور محصول کرسی کا طلب کیا۔ نیند تو فوراً کافور ہوگئی لیکن بدن کا درد اور تکان سفر دونا ہوگیا۔ ایک پیالی

(۷ اپریل ۱۹۳۱ء) چاء پی۔ دو انڈے کھائے۔ صبح کی نماز پڑھی اور موٹر پر جا بیٹھے آفتاب نکلتے نکلتے موٹر روانہ ہوئے۔ اب اصلی ریگستان شروع ہوا۔ اکثر موٹر بار

بار رکنے لگے - کسی کا کوئی پرزہ بگڑا اور کسی نے اس کو ٹھیک کیا - کسی کے پہیے بالو میں دھنسے اور بدقت تمام موٹر اُٹھایا گیا - برابر یہی عمل جاری تھا کہ ظہر کے وقت الہ آباد کے حساب سے ٹھیک ایک بجے دن کے وقت میری موٹر کے پہیے بھی ایکبارگی بالو میں دھنس گئے - بجز بھائی صاحب کے ہم سب لوگ موٹر سے اُترے دیکھا تو مڈگارڈ تک بالو آگیا ہے - جیک پر موٹر اٹھایا گیا - نیچے پتھر رکھے گئے - موٹر بدقت تمام اُبھرا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھا - قریب ایک فرلانگ کے ہم لوگوں کو پیادہ پا چلنا پڑا - اوس وقت کی دھوپ اور جلتے ہوئے بالو میں چلنا پڑا - تب اندازہ اُن غریبوں کی محنت اور عقیدت کا ہوا جو پیادہ پا اس سفر کو طے کرتے ہوئے راستہ میں ملتے ہیں - تمام سفر میں صرف یہ ایک واقعہ تھا کہ ہم لوگوں کو بوجہ خرابی راستہ کے موٹر سے اوترنا پڑا - اور سب موٹروں کو پانچ پانچ چھ چھ مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا - غرضکہ ہم لوگ تمام دن سفر کرتے رہے - رات کے وقت جب الہ آباد میں دس بجے شب کا وقت ہوگا ہملوگ منزل پر پہنچے - اس منزل کا نام علی بیر ہے - تکان سفر سے ہر شخص چور چور تھا - بعد فراغت احتیاج ضروری اور نماز عشاء کرسی پر لیٹے اور ایک ہی نیند میں رات گذر گئی -

مدینہ طیبہ کے سفر میں نہایت دردناک وہ منظر ہوتا ہے جو یہاں کے غرباء اور گداگروں کا ہے - یہ غریب ہر پڑاؤ پر اور راستہ میں پہاڑیوں پر جابجا دو رویہ دست سوال دراز کئے کھڑے رہتے ہیں - انکی غربت کا یہ عالم ہے کہ کسی کے بدن پر کپڑا ثابت نہیں ہوتا - اکثر لڑکیاں دس گیارہ برس کی عمر کی اونٹوں کے بالوں کی جھالر بنا کر کمر پر لپیٹے تھیں اور اسطرح اپنی ستر پوشی کئے ہوئے تھیں - ایک ٹکڑہ روٹی کا پھینک دیا جاتا تو اُسپر جھنڈ کے جھنڈ بچے اور عورتیں لوٹ پڑتے - تربوز کھا کر اوسکا چھلکا پھینک دیا جاتا تو اُسپر بدحواس ہوکر گرتے اور جس کے ہاتھ لگ جاتا وہ لیکر بھاگتا اور بہت شوق سے کھاتا - چلتی ہوئی موٹر پر سے روٹی کے ٹکڑے پھینکے جاتے تو اُن کو اپنی جان کا ڈر نہ ہوتا فوراً اوس کے لوٹنے کے لئے موٹر کے سامنے آجاتے

اور اکثر مجھکو اندیشہ ہوا کہ کوئی نہ کوئی دب کر مر جائے گا۔ کسی پڑاؤ پر اگر کوئی کچھ ناشتہ کرنے بیٹھتا تو یہ غریب ہزاروں دعائیں دیتے اور ایک نوالہ کی امید پر کھانے والے کے چاروں طرف حلقہ کئے رہتے۔

آج کی تاریخ کا سفر بالکل ریگستان میں گذرا۔ دوپہر کے وقت جب ہوا زور سے چلتی اور بالو کا غبار بلند ہوتا۔ خواجہ آتش کی ایک غزل مجھکو بے اختیار یاد آتی اور اس کے حسب ذیل اشعار زبان پر جاری ہو جاتے تھے۔ درمیانی شعر کچھ ترمیم یعنی ایجاد بندہ کر کے حسب حال کر لیا گیا تھا ؎

گدا نواز کوئی شہسوار راہ میں ہے — بلند آج نہایت غبار راہ میں ہے

ہزاروں ٹھوکریں کھلوائیگا حضور کا عشق — سفر مدینہ کا ہے کوہسار راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ رک آتش — گل مراد ہے منزل پہ خار راہ میں ہے

۷ اپریل ۱۹۳۱ء۔ صبح نور کے تڑکے پھر روانہ ہوئے۔ تیسرے روز کا راستہ بالکل پہاڑی تھا۔ اس ناہموار پہاڑی زمین پر پتھر کے ٹکڑے چھوٹے بڑے برابر اسطرح بچھے ہوئے تھے کہ زمین نظر نہیں آسکتی تھی۔ اسی سنگلاخ پہاڑیوں پر حیرت ناک تیزی سے موٹر برابر دوڑے جا رہے تھے۔ اور مسافروں کی یہ حالت تھی کہ کوئی اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ سب کے سب تھالی کے بینگن کی طرح خود بخود اچھلتے چلے جا رہے تھے۔ پہیے کے نیچے ایک بڑا پتھر آیا۔ موٹر نے دھکا کھایا اور آدمی اپنی نشست سے اُچھلا۔ سر کو ایک ٹکر موٹر کی چھت سے لگی اور فوراً اپنی جگہ پر یا اپنے برابر والے کے کسی حصۂ جسم پر دھڑ سے گرا۔ ہنوز اپنی جگہ پر سنبھلنے نہ پایا تھا کہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ کہیں کہیں پر ایسے منظر بھی نظر پڑے جو چڑھاؤ اُتار کے اعتبار سے نینی تال کے سفر سے کسیقدر مشابہ تھے۔ قریب دس بجے دن کے ہم لوگ پہاڑیوں کے اوتار کی جانب پہنچے۔ تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ پہاڑی ندیاں ملنی شروع ہوئیں اور یکے بعد دیگرے آٹھ ندیاں ملیں۔ انمیں پانی نہایت تیز دھارے سے بہ رہا تھا۔ عبور کے مقام پر کسی میں تین فیٹ گہرائی تھی کسی میں

اس سے کچھ کم۔ ہمارا موٹر تو ہر ندی کو بلا تکان پار کرتا ہوا نکل گیا لیکن اور تمام موٹر بیچ دہارے میں رُکے اور ان سے مسافر اُتارے گئے اور نہایت دقت اور توقف کے ساتھ موٹر کھینچ کھینچ کر ندیوں سے نکالے گئے۔ جب آخری ندی ملی تو بجائے اور موٹروں کی تقلید کرنے کے ملّی ڈریور نے موٹر رو کا تھوڑی دیر غور کرتا رہا اور یکایک ندی کے عبور کا خیال چھوڑ کر بائیں جانب کی پہاڑی پر موٹر چڑھانے لگا قریب بیس فیٹ بلندی پر جا کر ایک کھڈ بائیں جانب ایسا ملا کہ اُس کے قریب سے موٹر کے نکلتے وقت مشکل سے دو انچہ کا فاصلہ رہ گیا۔ بہت سے مسافروں کو تو اس خطرہ کا پتہ بھی نہیں چلا لیکن میری نظر اس کھڈ پر پڑی اور جی سن سے ہو گیا۔ لیکن خدا نے بڑا فضل کیا کہ سلامتی سے موٹر آگے نکل گیا۔ کچھ اور بلندی پر جا کر ملّی نے موٹر کو پھر پہاڑی سے اُتارنا شروع کیا۔ جب موٹر نیچے اُترا تو وہی ندی جس کو چھوڑ کر ابھی آئے تھے یہاں بھی بڑے زور شور سے بہ رہی تھی۔ لیکن یہاں ملّی نے کچھ تردد نہیں کیا اور زن سے موٹر اُس پار نکال لے گیا۔ ملّی کو پانی کی گہرائی کا خوب اندازہ تھا کیونکہ اُس پار پہونچکر معلوم ہوا کہ اور سب موٹر جو اس پہاڑی پر سے نہیں آئے اور براہ راست ندی پار کرنے کی غرض سے آگے بڑھائے گئے تھے وہ بیچ دہارے میں رُک گئے تھے۔ مسافر سب اُتار دئے گئے تھے اور موٹر یکے بعد دیگرے کھینچ کھینچ کر نکالے گئے۔ ملّی بھی ان موٹروں کے عبور کرانے میں مصروف ہو گیا تھا اسوجہ سے قریب ایک گھنٹہ کے ہم کو بھی توقف کرنا پڑا ٹھیک دوپہر کے وقت جب سب مسافر اپنے اپنے موٹروں پر بیٹھ گئے تو سامنے والی پہاڑی پر موٹر چڑھائے گئے اُسکی بلندی پر پہونچتے ہی سامنے گنبد خضرا نظر پڑا۔ اب کیا تھا۔ تمام تکان سفر دور ہو گیا۔ ہر شخص پر ایک وجد کا عالم تھا کون شخص تھا جو آبدیدہ نہ تھا۔ کون زبان تھی جس پر نعرۂ صلوٰۃ و سلام جاری نہیں تھا۔ چشم زدن میں موٹر نے مدینہ طیبہ کے پھاٹک پر آکر دم لیا۔ یہاں پر جو چیز پہلے نظر پڑی وہ ترکوں کا بنایا ہوا عالیشان ریلوے اسٹیشن۔ ریلوے لائن۔

الٹی پلٹی ریل گاڑیاں اور انجن تھے۔ یہ سب سامان زبان حال سے اپنی سرگزشت اور گذشتہ چہل پہل کا افسانہ بیان کر رہے تھے۔ موٹر سے اُتر کر ہم لوگ عربیہ پر بیٹھ گئے۔ اسباب کو معلم صاحب مدینہ کے سپرد کیا گیا۔ ہم لوگ مسجد نبوی کے سامنے ذرا سا میدان ہے وہاں پر عربیہ سے اُترے اور باب السلام کے ٹھیک سامنے ایک گلی میں ابو سعود صاحب معلم کے مکان پر مقیم ہوئے۔ یہاں پہونچکر ذرا دم لیا۔ پھر غسل کر کے کپڑے بدل کر آستانہ مبارک پر حاضر ہونے کی تیاری کی۔ ابو سعود صاحب معلم نے ایک نوجوان عربی کو سلام پڑھانے کے لئے ہمارے ساتھ کر دیا تھا۔ ایک ایک روپیہ اُن کے نذر کیا گیا۔ اور دو منٹ کا راستہ طے کر کے آستانہ مبارک پر حاضر ہوئے۔ وہاں جو حال دلپر نہ ا نہیں کبھی اس کو نہ محسوس کر سکتا ہوں نہ اُس کا بیان کرنا میرے امکان میں ہے۔ نہ میرا بیان کسی کے سمجھ میں آسکتا ہے۔

مسجد نبوی کی مختصر تاریخ اور اُس کی موجودہ کیفیت میں نے علٰحدہ قلمبند کی ہے۔ اس مقام پر اتنا لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعد ہر نماز تمام زائرین حضور سرور کائنات اور حضرت خلیفۂ اول و دوم پر سلام پڑھتے ہیں اور اسکا طریقہ یہ ہے کہ ہر ایک معلم یا اون کے نائب اپنے اپنے زائرین کو اپنے ساتھ لیکر حلقہ بنا کر زور زور سے سلام پڑھتے ہیں اور اونکے ہر جملہ کو تمام زائرین بہ آواز بلند دُہراتے جاتے ہیں۔ اور اس پختہ عمارت میں آواز اسطرح گونجتی ہے کہ ایک شور عظیم برپا ہوتا ہے تھوڑی سی جگہ میں سب لوگوں کے سمٹ کر کھڑے ہونے اور زور زور سے چیخ کر سلام پڑھنے کی وجہ سے غشی کا عالم طاری ہوجاتا ہے اور اسقدر شور و غل پاس ادب سے بھی خلاف معلوم ہوتا ہے۔ بالخصوص اسبات پر نظر کرتے ہوئے کہ ہمارے سرکار کو شور و غل نہایت ناپسند تھا۔ اسوجہ سے میری رائے ہے کہ سلام کے طریقہ میں یہ ترمیم کیجائے کہ بعد نماز امام یا کوئی اور بآواز بلند سلام پڑھے اور کل مقتدی آہستہ آہستہ اس کو دہراتے جائیں۔ اس طریقہ میں صرف اتنا نقص معلوم ہوتا ہے

کہ معلم صاحبان کی آمدنی میں کچھ فرق پڑ جائے گا۔ لیکن اگر سلام کا حق فیس معلمی میں بڑھا دیا جائے تو پھر کوئی وجہ اعتراض کی نہیں معلوم ہوتی۔

آجکل مدینہ کی آب وہوا نہایت خوشگوار ہے۔ ہملوگ کمرہ کے اندر کمبل اوڑھ کر سوتے ہیں۔ صبح حرم شریف جاتے وقت اچھی خاصی سردی محسوس ہوتی ہے مچھروں کا یہاں پتہ نہیں ہے کھانے کا انتظام ابوسعود صاحب کے سپرد ہے۔ نہایت آرام سے یہاں مقیم ہیں۔ مدینہ کے مکانات کی قطع مکہ مکرمہ کی طرح ہے گلیاں عموماً تنگ ہیں۔ صفائی کا انتظام اچھا نہیں ہے گلیاں مرطوب اور کوڑہ کرکٹ ہٹانے کا کوئی عمدہ انتظام نہیں معلوم ہوتا۔ یہاں مکانات کے اندر کنوئیں ہیں جنکا پانی شیریں ہے۔ سڑکوں پر پانی کے نل لگے ہوئے ہیں۔ بارش کے پانی کو قریب کے پہاڑوں کے نیچے بند بنا کر روکا گیا ہے وہی ذخیرہ ہے جہاں سے نل شروع ہوتے ہیں۔ میں نے اکثر مقامات پر دیکھا کہ نل کھلے رہتے ہیں کوئی توجہ اسپر نہیں ہے کہ پانی لینے کے بعد نل بند کر دیئے جائیں۔ مدینہ طیبہ کے گرد و نواح میں ترکاریاں بکثرت بوئی جاتی ہیں۔ یہاں کی زمین بہت سرسبز ہے ہر قسم کی ترکاریاں بازار میں بکثرت ملتی ہیں۔

۱۰ اپریل ۱۹۳۱ء۔ ہملوگ آج معلم صاحب کے نائب کے ہمراہ جنت البقیع گئے۔ یہ مقام شہر کے قریب مگر شہر سے باہر ہے۔ ایک معمولی دروازہ کے ذریعہ سے احاطہ کے اندر گئے۔ وہاں کا نظارہ قابل بیان نہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی زمین کھود کر ہل چلایا گیا ہے مٹی کے تودے کنکر پتھر کا انبار ہر طرف دیکھ کر نہایت قلق ہوا۔ چونکہ ہم لوگوں کے آنے سے تین دن قبل یہاں بارش ہوئی ہے۔ اس وجہ سے بہت سی قبریں بیٹھی ہوئی نظر آئیں۔ نائب معلم ہم کو اس احاطہ کے مشرقی اور شمالی گوشہ کیطرف لے گیا۔ وہاں ایک منہدم قبر دکھلا کر بتلایا کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مزار ہے وہاں ہم لوگوں کو سلام پڑھوایا گیا۔ وہاں سے واپسی کے وقت حضرت رسول کریم کے صاحبزادہ قاسم رضؓ کا چھوٹا سا مزار ملا اوسپر سلام اور فاتحہ پڑھنے کے بعد اس

احاطہ کے جنوب کی طرف گئے۔ نائب معلم نے دور سے بتلایا کہ سرھانے جو مزار ہے وہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا ہے۔ اس کے جنوب کی طرف قریب چار پانچ ہاتھ کے فاصلہ پر جو مزار ہے وہ جناب سیدہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا ہے اور حضرت امام حسن کے مزار کے پائنتی حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ حضرت امام جعفر صادق رضؓ اور حضرت امام باقر رضؓ اور حضرت امام تقی رضؓ کے مزارات ہیں قریب پہنچکر دیکھا کہ ان مزارات کے چاروں طرف کا کوڑہ کرکٹ اور پتھر کنکر تین چار ہاتھ کے حاشیہ میں صاف ہے۔ مزار موجود ہیں مگر انکا پلاسٹر اور کہیں کہیں پتھر کی جوڑائی [illegible] ہوئی ہے۔ یہاں پر ہم لوگوں کو سلام اور فاتحہ پڑھوایا گیا۔ جس وقت سے ہم لوگ جنت البقیع کے احاطہ میں داخل ہوئے تھے کسی کی آنکھوں سے آنسو خشک نہیں ہوئے تھے لیکن یہاں پہونچکر ضبط کی تاب کسی میں نہ رہی۔ ڈاکٹر سراج الحسن صاحب ہم سب میں کمزور تھے۔ وہ حضرت امام حسن رضؓ کے مزار کے قریب زمین پر بیٹھ گئے اور مجھ سے دریافت کرنے لگے کہ ہر مزار کو علیحدہ علیحدہ بتلاؤ کہ کون کسکا ہے۔ ابھی انکو بیٹھے دو منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ سعودی سپاہی بجلی کی طرح کڑک کر اوپر آیا اور زور سے بازو تھام کر اٹھا دیا۔ یہ بیچارے سہم گئے کہ آخر کیا قصور سرزد ہوا میں نے کہا کہ اس کو خیال ہوا کہ شاید آپ مزار کو مس کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مزار پر اور اہلبیت کے مزار پر نہایت عمدہ مقبرے صدیوں کے بنے ہوئے تھے۔ انکے فرش۔ جالیوں اور نقش و نگار کی نہایت تعریف کیجاتی ہے۔ ابھی تین چار برس ہوئے حکومت موجودہ نے سب کھدوا ڈالا اور جنت البقیع کے احاطہ کے اندر کے تمام مزارات کے متعلق جسقدر عمارتیں تھیں کسی کا نشان باقی نہ رہا۔ میری رائے میں حکومت حجاز نے عمارتوں کے کھدوانے میں سخت غلطی کی اول تو یہ کہ اسکی طرف سے تمام دنیا کے مسلمانوں کے دل کو صدمہ پہنچا۔ وہابیوں کا یہ اعتراض ہے کہ لوگ یہاں آکر منتیں مانگتے تھے۔ سجدہ کرتے تھے۔ بدعتیں کرتے تھے۔ اسلئے عمارتیں کھدوا ڈالی گئیں۔ میں کہتا ہوں کہ جو لوگ ایسا

کرتے بھی تھے وہ کچھ اس بلڈنگ کی وجہ سے وہاں سجدہ نہ کرتے تھے۔ نہ منتیں مانگتے تھے۔ وہ لوگ آج بھی اوس خاک کے ڈھیر پر جہاں اُن کے بزرگوں کے مدفن کا نشان ہو یہ سب کرنے کو تیار ہیں اور باوجود عمدہ عمدہ عمارتوں کے کھود ڈالنے کے لوگ جوق جوق وہاں جاتے ہیں اور ان کو بدعت کرنے سے روکنے کیلئے حکومت کو سپاہی رکھنے پڑتے ہیں۔ چنانچہ جنت البقیع کے دروازہ پر ایک گارڈ اسی لئے تعینات رہتا ہے۔ پس بلا عمارتوں کے کھودنے کے بھی گارڈ موجودہ لوگوں کو ان بیجا حرکتوں سے باز رکھ سکتا تھا۔ اس سے کیا فائدہ ہوا کہ ایک صاف ستھری اور خوشنما جگہ کو مسمار کر دیا اور عمدہ عمارتیں کھود ڈالیں۔ آخر رسول کریم کے روضہ مبارک کی جالیوں پہ سپاہیوں کا پہرا رہتا ہے اور کوئی زائر جالیاں لمس بھی نہیں کرنے پاتا۔ اسیطرح یہاں بھی ہو سکتا تھا۔ یہی غلطی مکہ معظمہ میں جنت المعالی کے قبرستان۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مقبرہ اور حضرت رسول کریم اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ولادت گاہوں کے کھودنے میں حکومت کی طرف سے ہوئی۔ اس عمل سے اسقدر ناراضی ہے کہ اکثر ایسے اشخاص جو حج اور زیارات کے لئے جاتے اب اُنھوں نے ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ میری آواز اگر حکومت کے ارباب حل و عقد کے کانوں تک پہنچ سکے اور اسپر کچھ توجہ کی اُمید ہو تو میں نہایت خلوص اور ادب سے لیکن نہایت بلیغ اصرار سے ضرور یہ عرض کرونگا کہ ان تمام عمارتوں کو فی الفور بہ حیثیت قدیم بنوا دیا جائے اور امید ہے کہ اس کام کے لئے مسلمان نہایت فراخ دلی سے چندہ دینے کے لئے تیار ہو جائینگے ہاں موجودہ انتظام لوگوں کو بدعتوں سے روکنے کے لئے قائم رکھا جائے اسمیں کوئی اعتراض نہیں کر سکتا۔ غرض کہ قریب ایک گھنٹہ کے ہم لوگ جنت البقیع میں رہنے کے بعد اپنے مسکن کو نہایت ملول اور پریشان خاطر واپس آئے۔

۱۳ / اپریل ۱۹۳۱ء۔ آج ہم لوگ کوہ اُحد کی طرف بذریعہ سواری عربیہ روانہ ہوئے کلہ ہم لوگوں نے جنت البقیع سے کوہ اُحد کی طرف دیکھا تو معلوم ہوتا تھا کہ شاند

مشکل سے دو فرلانگ ہوگا۔ آج تانگہ پر بیٹھ کر آئے تو دوری کا صحیح اندازہ ہوا یہ مقام مدینہ طیبہ سے قریب چار میل کے فاصلہ پر ہے۔ راستہ نہایت ناہموار ہے۔ یہاں بھی تانگہ کے گھوڑوں کے منہ میں لگام نہیں دیجاتی۔ صرف قزنی لگائے رہتے ہیں۔ اس میں ایک رسی بندھی تھی جس کو تانگہ والا ہاتھ میں لئے ہوئے زمین پر دوڑتا ہوا اور تانگہ ہانکتا ہوا چلا آتا تھا۔ ایک ناہموار جگہ پر ایک طرف کا پہیہ اتنا اُٹھا اور ایسا دھکہ لگا کہ میں نے سمجھا کہ تانگہ الٹا۔ خیر تانگا تو بچ گیا لیکن تانگہ والے کے ایسی ٹھوکر لگی کہ پہیہ کے آگے چاروں شانہ چت دھڑام سے گرا میں تو سمجھا کہ یہ مرا۔ لیکن پہیہ اُس کے جسم پر گذرنے ہی کو تھا کہ وہ بجلی کی طرح کود کر ایک طرف کھڑا ہوگیا اور فوراً رسی ہاتھ میں لے کر گھوڑے کی پیٹھ پر تین چار ڈنڈے کس کس کر رسید کئے۔ ہم لوگ قریب پون گھنٹہ میں میدان جنگ اُحد میں پہونچ گئے جو کوہ اُحد کے دامن میں ہے لیکن پہاڑ کے عین نیچے ایک ندی بہت زور شور سے رواں تھی جس کا پاٹ قریب پچاس فٹ کے تھا۔ اکثر زائرین اسمیں سے ہوکر اس پار جارہے تھے کمر تک پانی تھا۔ میں نے اس پانی میں ہاتھ ڈالا نہایت ٹھنڈا تھا۔ ایک زائر کو میں نے دیکھا کہ ایک قلی کی پیٹھ پر بیٹھ کر اس پار جارہا تھا۔ بیچ دریا میں قلی نے ٹھوکر کھائی اور دونوں پانی کے اندر گرگئے میرے دوساتھی بہت کمزور تھے بھائی شوکت حسین صاحب قبلہ اور ڈاکٹر سراج الحسن صاحب۔ ان کے خیال سے ہم لوگوں نے عبور کا قصد نہیں کیا چشمہ کے اسی طرف کھڑے ہوکر نائب معلم نے سلام اور فاتحہ پڑھوا دیا۔ اس پار نہ جاسکنے کی وجہ سے حضرت سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضری کا موقع نہیں ملا۔ اسیطرف سے اُن کے حضور میں بھی سلام اور فاتحہ عرض کیا گیا۔ حضرت امیر حمزہ رضؓ کا مقبرہ بھی حکومت موجودہ نے کھدوا ڈالا ہے۔

قریب دو گھنٹہ کے ہم لوگ اس میدان میں حاضر رہنے کے بعد واپس ہوئے راستہ میں دور سے داہنی جانب مسجد قبلتین کی زیارت کی یہی وہ مسجد ہے جہاں حضرت

رسول کریم نے بجائے اُتر رخ نماز پڑھانے کے ایک روز یکایک دکھن جانب یعنی روبقبلہ ہوکر نماز جماعت ادا فرمائی۔ اور اُسی وقت سے نماز روبقبلہ ادا کیجاری ہے۔

۱۸ اپریل ۱۹۳۱ء۔ آج ہم لوگوں کو مکہ معظمہ واپس جانا ہے۔ بہت تڑکے نذر غیب سے اٹھ کر آستانہ مبارک پر حاضر ہوئے۔ نماز ادا کی سلام عرض کیا اور چشم پُرآب رخصت ہوکر مکان پر واپس آئے۔ ابوسعود صاحب کی خدمت میں آٹھ روز کا سول روپیہ کرایہ مکان پیش کیا۔ جس کو انھوں نے نہایت کشادہ پیشانی سے قبول کیا کھانے پینے کا خرچ ہم لوگ دوسرے تیسرے ادا کرتے جاتے تھے۔ معلمی کی فیس کے بارے میں معلوم ہوا کہ ابوسعود صاحب پر کئی سال سے ایک دعویٰ فیس کی آمدنی اور ... کے متعلق دائر ہے جو اب تک طے نہیں ہوا۔ لہذا فیس ایک کمیٹی کے پاس جمع کی جاتی ہے۔ اور کمیٹی کی جانب سے ایک صاحب تشریف لائے۔ پانچ روپیہ ان کی نذر کیا لیکن انھوں نے بہت ہاتھ پیر پٹکائے۔ دو روپیہ اور پیش لیا گیا تو خاموش ہوئے۔ مدینہ گیٹ تک ہم لوگ آٹھ بجے صبح کے وقت پیادہ پا آئے۔ یہاں ہمارا اسباب دوسرے موٹر پر رکھ دیا گیا تھا۔ ہمارے موٹر پر اور لوگ قبضہ کئے ہوئے تھے۔ عباس کی مدد سے اپنے موٹر پر قبضہ کیا اور اپنا اسباب اپنے موٹر سے بندھوایا۔ تھوڑی دیر بعد موٹر روانہ ہوکر شہر پناہ کے پھاٹک کے سامنے روکے گئے۔ یہاں حسب دستور شمار کرنے اور پرچہ روانگی دینے میں نہایت توقف ہوا۔ قریب دو گھنٹہ بعد روانگی ہوئی۔ واپسی کے وقت کوئی ندی یا چشمہ نہیں ملا بارش کی وجہ سے عارضی ندیاں چند روز طغیانی پر رہ کر بہت جلد ان کا پانی بہہ جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ کے ساتوں موٹر قریب چھ گھنٹہ چلنے کے بعد قریب سہ پہر کے رابق پہنچے۔ یہاں تھوڑی دیر کے لئے موٹر روکے گئے۔ ہم لوگوں نے وضو کیا نماز ادا کی۔ دو رکعت نماز بہ نیت عمرہ ادا کی۔ احرام باندھا اور پھر اپنی اپنی جگہ پر موٹروں میں جا بیٹھے۔ یہاں سے روانہ ہوکر قریب بارہ بجے رات کے ایک چھوٹے سے پڑاؤ پر موٹر روک دیئے گئے۔ زمین پر چٹائیاں بچھا کر رات بسر کی۔

۱۶؍اپریل ۱۹۳۲ء۔ صبح کی نماز ادا کی چائے پی۔ تربوز خریدے پانچ آنہ کا ایک اچھا تربوز میں نے خریدا۔ ایک
پیسہ کا نمک خریدا آدھ سیر سے زیادہ ملا۔ یہاں سے قریب ایک گھنٹہ دن چڑھے
ہم لوگ پھر روانہ ہوئے۔ دن بھر برابر موٹر نہایت تیزی سے چلتے رہے۔ راستہ
میں بجز ہمارے موٹر کے اور سب موٹر بگڑے اور اُنکی مرمت کی گئی۔ ہم نے سب
کی مرمت کی۔ ایک موٹر کا لو با الیسا لوٹا کہ اس کی مرمت میں قریب دو گھنٹہ صرف
ہوا۔ قریب غروب جدہ پہنچے۔ وہاں معلوم ہوا کہ جدہ میں پڑاؤ نہ کیا جائیگا۔ ایک
گھنٹہ قیام کے بعد مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ قریب پانچ گھنٹہ رات گذرے
مکہ گیٹ پر پہونچے۔ یہاں روشنی کا انتظام بہت خراب تھا۔ اسباب موٹروں سے
اُتار دیئے گئے۔ سب کے اسباب مخلوط ہو گئے۔ بھائی شوکت حسین صاحب اور
ڈاکٹر سراج الحسن صاحب تو معذور تھے۔ علیحدہ بیٹھ گئے اور شاہد سلیم بھی بیکار ثابت
ہوئے۔ مجبوراً میں نے اور ایک رفیق سفر نے سب اسباب علیحدہ کر کے قلیوں
کے سپرد کیا۔ تانگوں پر بیٹھکر مکان پہنچے۔ رات ہی کو خانہ کعبہ میں حاضر ہوئے
نماز پڑھی طواف کیا۔ صفا مروہ دوڑے۔ مکان آکر کھانا کھایا۔ اسی وقت عباس
نے ایک تار بشیر سلمہ کا لاکر دیا جو یہاں میری عدم موجودگی میں آیا تھا اور رکھا
ہوا تھا۔ اس سے سب کی خیریت معلوم ہو کر نہایت اطمینان ہوا۔ سجدۂ شکر ادا کیا
۷؍مارچ کو ہم لوگ الہ آباد سے چلے تھے اس تار سے قبل کوئی خبر گھر کی نہیں ملی تھی۔
نہ کسی کا کوئی خط اسوقت تک آیا ہے۔ رات قریب ڈھائی گھنٹے باقی تھی جب
ہم لوگ لیٹے۔ نیند تو گویا پیشوائی کے لئے کھڑی تھی پڑتے ہی سو گئے۔

۱۷؍اپریل ۱۹۳۲ء۔ آج تڑکے حرم شریف سے واپس آنے کے بعد حجامت بنوائی
غسل کیا۔ عمرہ کے کل ارکان ادا کرنے کے بعد احرام دور کیا۔ معمولی کپڑے پہن لئے
شیخ عباس صاحب نے ایک خط عبدالرحمٰن صاحب کا لاکر دیا جو انھوں نے بذریعہ
ہوائی جہاز اپنی بیوی کے نام روانہ کیا تھا۔ اس سے بھی سب کی خیریت مجملاً معلوم ہوئی

۲۰؍اپریل ۱۹۳۲ء۔ آج میری چھوٹی لڑکی انیس فاطمہ عرف چھٹن سلمہا کا خط ملا۔

یہ پہلا خط ہے جو اس وقت تک ہندوستان سے موصول ہوا ہے۔ آج یہاں بقرعید کی تیسری تاریخ ہے۔ بھائی شوکت حسین صاحب قبلہ اور شاہ محمد سلیم صاحب مدرسہ صولتیہ کے جلسہ سالانہ میں شرکت کے لیئے گئے اور دونوں نے کچھ کچھ چندہ دیا۔ پیر کو بھائی صاحب نے بخار کی شکایت کی۔ آناً فاناً بخار نے بہت تیزی اختیار کی۔ فوراً دوا شروع کی گئی۔ رات بھر میں جاگتا رہا۔ دوسرے روز بغل کا ٹمپریچر ۱۰۴ تھا۔ کوئی غذا نہیں ہوئی۔ سر پر گل روغن۔ سرکہ پانی برابر رکھا گیا۔

۲۱ و ۲۲ اپریل ۱۹۳۱ء۔ ۴ ذی الحجہ۔ تمام رات بیخوابی۔ ہذیان۔ متلی۔ قے۔ بار بار دست اور پیشاب۔ کھانسی۔ کھانسی میں خون۔ تیمار داری کے لیئے ایک میں اور ایک رفیق سفر دن رات مریض کے پاس سے نہیں ہٹتے ہیں۔ میں نے خود حرم شریف کی حاضری ملتوی کر دی ہے۔

مکہ میں ایک گورنمنٹ ہند کا شفا خانہ حاجیوں کے لیئے ہے۔ وہاں جا کر ڈاکٹر صاحب سے ملا۔ انکا نام محمد خاں ہے۔ مدراس کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے گھر پر آ کر بہت توجہ سے دیکھا اور جب تک ہم لوگ حج کے لئے روانہ نہیں ہوئے روز آتے تھے۔

۲۳ اپریل ۱۹۳۱ء۔ ۵ ذی الحجہ کو حالت اور خراب ہوئی حسب مشورہ عباس ابراہیم مکہ معظمہ کے صدر شفا خانہ میں گیا۔ شفا خانہ کی عمارت حرم شریف کے قریب ہی ہے اور اچھی عمارت ہے۔ دوائیں کافی مقدار میں موجود ہیں۔ متعدد ڈاکٹر ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں کوئی ڈاکٹر ہندوستانی زبان نہیں بول سکتا۔ اور صرف ایک ڈاکٹر ہے جو انگریزی جانتا ہے۔ میں اُن سے ملا۔ انکا نام ڈاکٹر حسنی الطاہر ہے۔ نہایت اخلاق سے پیش آئے۔ بہت مفصل گفتگو ہوئی۔ جب اونکو معلوم ہوا کہ میں بھی ڈاکٹر ہوں تو پھر مصافحہ کیا اور دیگر ڈاکٹروں سے ملوایا۔ پھر فوراً میرے ہمراہ مکان پر آ کر نہایت غور سے بھائی صاحب کو دیکھا۔ انکو پندرہ روپیہ فیس پیش کی گئی۔ نہایت اصرار کیا گیا مگر یہ آزردہ ہو کر کہنے لگے کہ میں اپنے ایک بڑے بھائی سے فیس لے کر اپنے دل میں اپنی اس حرکت کو کسقدر حقارت کی نظر سے دیکھوں گا۔ غرضکہ

کسی طرح فیس نہیں لی۔ دوائیں بنوا کر بھیجیں۔
۵ رذی الحجہ آج بادشاہ ابن سعود کا نویدی کارڈ میرے اور ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کے نام آیا۔ ۶ رذی الحجہ کو رات کے کھانے پر مدعو کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہر سال منتخب حاجیوں کی دعوت سلطان ابن سعود کرتے ہیں۔ کارڈ نہایت اعلیٰ درجہ کے کاغذ پر چھپا ہوا ہے۔ عبارت یہ ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رئیس الدیوان العالی یتشرف بان یدعو حضرتکم للحضور الی القصر العالی الملوکی بالمعابدة عقب صلاة مغرب یوم الجمعة الموافق ۶ الجاری لتناول طعام العشاء علی المائدة الملوکیة علی ان یکون الاجتماع قبیل المغرب المذکور بدار الحکومة السنیة حیث اعدت سیارات لنقل المدعوین الی القصر العالی واللہ یحفظکم ۔

۱۳۴۹/۱۲/۵

ترجمہ۔ رئیس دیوان عالی اس بات کا شرف حاصل کرتا ہے کہ آپ کو قصر عالی شاہانہ میں نماز مغرب کے بعد جمعہ کے روز مطابق تاریخ ۶ ماہ رواں کے شاہانہ دستر خوان پر رات کے کھانا کھانے کے لئے مدعو کرے۔ اجتماع قبل مغرب دار الحکومت شریفہ میں ہوگا جہاں مدعو صاحبان کو قصر عالی تک لیجانے کے واسطے موٹر تیار ملیں گے اللہ آپ کی حفاظت کرے۔

۵ رذی الحجہ

۲۴ راپریل ۱۹۳۱ء ۔ ۶ رذی الحجہ تمام دن اور تمام رات حالت بدستور رہی۔ ہاتھ پیر پٹکنا۔ بخار ۱۰۵ درجہ۔ ہذیان مسلسل۔ کھانسی۔ کھانسی میں خون۔ بیخوابی وغیرہ وغیرہ سب حالتیں کل سے بھی زیادہ خراب ہیں۔
اب مجھ کو سخت تشویش ہوئی کہ سفر حج میں انکو کسطرح ہمراہ لیچلوں اور کسطرح اور کس پر مکہ میں چھوڑوں۔ پرسوں تڑکے اونٹ کی سواری پر ڈیڑھ دن کا مسلسل سفر ہے۔ میرے ایک رفیق سفر نے اس معاملہ میں ایسی متانت اور پختگی سے رائے

دی کہ دل کو بڑی تقویت ہوگئی - اوس نے کہا کہ انکا حج اب ملتوی نہیں ہوسکتا ان کو اسیطرح ہمراہ لے کر جینیں گے - انکی زندگی ہے تو حج کر کے صحیح سلامت واپس آئیں گے ورنہ جو خدا کو منظور ہو گا ہو گا -

آج بادشاہ ابن سعود کی دعوت میں جانا ہے - میرا ارادہ لوجہ علالت بھائی صاحب قبلہ کے شرکت دعوت کا نہ تھا - مگر عباس صاحب نے بہت اصرار سے کہا کہ جانا ضروری ہے ضرور جائیے - ورنہ آپ کی عدم موجودگی میں بھائی صاحب کے پاس سے نہ اٹھونگا اور میرا خدمتگذار رفیق بھی مصر ہوا غرضکہ شام کو ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کے ہمراہ حرم شریف میں حاضر ہوئے - نماز مغرب ادا کرنے کے بعد حکومت کے دفتر میں جو حرم شریف سے متصل ہے حاضر ہوئے - یہاں اور مہمان بھی جمع تھے - بعد مغرب سرکاری موٹروں پر سب لوگ سوار ہو کر قصر شاہی تک پہونچے - یہ مقام مکہ کی آبادی سے ملا ہوا ہے - یہ ایک بہت شاندار بلند عمارت ہے - پھاٹک کے اندر ایک چھوٹا صحن ہے اس میں چمن لگا ہوا ہے - اس چمن میں چند درخت نیم کے بہت تکلف سے لگائے گئے ہیں - درخت ابھی چھوٹے ہیں بانس کی کھپاچوں سے سنبھال کر باندھ دئے گئے ہیں اسی صحن سے زینہ ملتا ہے جس کے ذریعہ سے دوسری منزل پر گئے - یہاں ایک دالان سے ہو کر ایک بہت وسیع لق و دق ہال میں داخل ہوئے - عرب کے دستور کے مطابق دیواروں سے ملے ہوئے بلند گدے دار کوچ بچھے ہوئے تھے - ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کا بوجھل ہاتھ میرے کندھے پر تھا اُنھوں نے باہر جوتہ اُتار دیا اور میں انکو گھسیٹتا ہوا ہال کے انتہائی داہنے گوشہ تک لیجا کر ایک کوچ پر بیٹھا - تھوڑی دیر میں تمام ہال مہمانوں سے بھر گیا - پھر اور لوگ آئے تو درمیانی خالی جگہ میں جہاں بہت خوبصورت قالین بچھا ہوا تھا اُسپر کرسیاں رکھی گئیں جب سب لوگ بیٹھ چکے تو میرے متصل اور ملحق جو کوچ اسوقت تک خالی تھا اسپر بادشاہ ابن سعود آکر بیٹھے - اون کے ساتھ ایک صاحب اور تھے جو غالباً اُنکے بڑے شاہزادے تھے - انکے ساتھ ساتھ آٹھ دس سپاہی تلواریں نیام کے اندر

ہاتھوں میں لٹکائے آکر ان کے کوچ کے سامنے ادھر ادھر کھڑے ہو گئے۔ جو لوگ دور تھے وہ بادشاہ کو اس رکاوٹ کی وجہ سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ بادشاہ دو منٹ بیٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ لوگوں نے آ آکر ان سے مصافحہ کرنا اور اُن کے گال یا شانہ یا ہاتھ پر بوسہ دینا شروع کیا۔ جو شخص اُن کے چہرہ کی طرف رُخ کرتا بادشاہ اپنا منہ جھکا دیتے تھے اور وہ شخص بوسہ لیکر پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ تھوڑی دیر تک یہ منظر دلچسپی کے ساتھ دیکھنے کے بعد میں بھی ایک قدم آگے بڑھا۔ بادشاہ نے ہاتھ بڑھا دیا میں نے صرف مصافحہ پر اکتفا کیا۔

اس رسم کے بعد بادشاہ بیٹھ گئے اور ایک اسپیچ عربی زبان میں دی۔ اونکی آواز نہایت بلند تھی اور تلفظ بہت صاف تھا۔ بادشاہ کی اسپیچ ختم ہوتے ہی ایک ہندوستانی ملازم بادشاہ کے کھڑے ہوئے اور بادشاہ کی اسپیچ کا خلاصہ اُردو میں انھوں نے بیان کیا۔ اس اسپیچ کا مضمون مختصر طور پر یہ تھا کہ میں آپ سب حاجیان سے ملکر بہت خوش ہوا۔ مسلمانوں کو رسول کریم کے قدم بقدم چلنا چاہئیے اگر کوئی عرب طریق رسول پر نہیں ہے تو وہ میرے لئے بیگانہ اور اگر کوئی ہندی یا افغانی یا مصری رسول اللہ کی پیروی کرتا ہے تو وہ میرے لئے بہترین انسان اور میرا پیارا بھائی ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو علوم اور فنون میں ترقی کرنے کا حوصلہ دلایا تھا۔ اور یورپ کی ترقی علم و ہنر کی مثال پیش کی ان صاحب کے بیٹھنے کے بعد میں فوراً کھڑا ہوا اور میں نے اُردو میں اجازت چاہی کہ میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ بادشاہ نے اشارہ بولنے کا کیا۔ میں نے پہلے اونکی دعوت کا شکریہ ہندوستانی حاجیوں کی طرف سے ادا کیا۔ پھر یہ کہا کہ حج کا سفر ہمیشہ نہایت خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستان سے جو حاجی آتے تھے ان کے عزیز انکے مال اور اُنکی جان کو صبر کر لیتے تھے۔ لیکن حکومت موجودہ بہت تعریف کی مستحق ہے کہ مدینہ منورہ کی آمد و رفت میں کوئی کھٹکا جان و مال کا باقی نہیں رہا اور اس سفر کو بیخطر بنا دینے میں حکومت موجودہ ہم سب حاجیوں کے نہایت شکریہ کی

مستحق ہے۔ اس کے بعد دو چار منٹ اور بول کر میں بیٹھ گیا۔ جب تک میں تقریر کرتا رہا ایک مترجم بادشاہ کے قریب کھڑا ہو کر بہت آہستہ آہستہ عربی میں ترجمہ کرتا جاتا تھا۔ بعد ختم تقریر بادشاہ نے بنظر لطف میری طرف دیکھا۔ اور میرے بیٹھتے ہی بادشاہ اور ان کے ساتھ ہم سب لوگ کمرہ سے باہر نکلے۔ اس کمرہ میں قریب ایک ہزار آدمی کے تھے۔ اندازاً قریب پانچسو کے حاجی ممالک غیر کے تھے اور باقی عرب اور افسران سرکاری تھے۔ اس نشست میں ایک امر بہت نمایاں یہ تھا کہ کوئی جگہ کسی کے لئے مخصوص نہ تھی اگر ایسا ہوتا تو مجھکو اور ڈاکٹر سراج الحسن کو بادشاہ سے ملے ہوئے کوچ پر بیٹھنے کا موقع نہ ملتا۔ اسیطرح کھانے پر جس کو جہاں جگہ ملی بیٹھا کوئی تفریق نہیں رکھی گئی۔ کمرہ سے نکلتے وقت میں اور ڈاکٹر سراج الحسن بادشاہ سے بہت دور ہوگئے اسوجہ سے کہ ڈاکٹر صاحب نے جوتہ غلطی سے کمرہ کے باہر اُتار دیا تھا۔ وہ ٹھوکریں کھاتا ہوا بہت دور چلا گیا تھا بمشکل ایک سرکاری ملازم کی مدد سے ملا۔ کھانے سے قبل ہاتھ دھلائے گئے۔ اس کے لئے عمدہ صابون بہت صاف تولیے اور بڑی بڑی سلفچیاں عمدہ قلعی کی ہوئی رکھی تھیں بادشاہ کے ملازم ہاتھ دہلاتے تھے۔ کھانے بہت لانبی لانبی میزوں پر چنے ہوئے تھے۔ نشست کے لئے کرسیاں تھیں۔ کُل چار صفیں تھیں۔ کھانے کے کمرہ میں داخل ہوتے ہی کچھ عجیب نقشہ پیش نظر ہوا۔ پچاسوں مُسلم دنبے آنکھیں ثابت۔ دانت مُسلم منہ پھاڑے ہوئے بڑے بڑے قابوں میں بریانی کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ عرب اور مصری نہایت ذوق شوق سے اوسکو اڑا رہے تھے۔ ہم لوگوں کو اس میں کوئی مزہ نہیں ملا۔ اسوجہ سے کہ نمک بالکل نہ تھا اور گھی کی خوشبو کے بجائے کچھ ہیک چربی کی سی آتی تھی۔ میٹھے چاول اچھے تھے۔ کباب پھیکے۔ مٹر کی پھلیاں بہت بڑی بڑی جو یہاں کم نظر آتی ہیں۔ جیلی نہایت خوشرنگ برف پر لگی ہوئی۔ ہمارے دوست ڈاکٹر سراج الحسن کو یہی چیز سب سے زیادہ پسند آئی۔ جو عرب کھانا کھلا رہا تھا اوسکی طرف اشارہ کیا۔ اوس نے کل کشتی سامنے رکھ دی۔ ڈاکٹر صاحب نے

خوب آسودہ ہوکر نوش فرمایا۔ پانی نہایت سرد تھا اوسمیں برف بکثرت پڑی ہوئی تھی۔ مکہ معظمہ میں آجکل برف بکثرت ملتی ہے۔ عموماً ۳ر سیر نرخ رہتا ہے۔ غرضکہ سب لوگ کھاپی کر فارغ ہوے تو پھر دربار کے بڑے کمرے میں جمع ہوئے اس مرتبہ ہم لوگ بادشاہ سے چار پانچ کوچ کے فاصلہ سے تھے۔ سب کے بیٹھتے ہی قصیدہ خوانی شروع ہوئی۔ یہاں کے شعرا اپنے قصائد ہمراہ لائے تھے۔ عمدہ مضمون کی داد تالیاں بجاکر دیجاتی تھی۔ اسی درمیان میں کئی آدمی قہوہ پلا رہے تھے۔ قہوہ نہایت گرم اور بہت سخت اور بہت تیز تھا۔ سنہرے ظروف میں جو آفتابہ کی شکل کے تھے قہوہ بھرا ہوا تھا۔ اور بہت چھوٹی چھوٹی چینی کی پیالیوں میں قریب تین تولہ کے ایک مرتبہ میں دیا جاتا تھا مگر بار بار قہوہ پلانے والے آتے تھے اور اگر پلانے والے کے ہاتھ سے ایک پیالی پی جاتی تو تین پیالیاں فی کس پی سکتا تھا۔ عرب اور مصری تو خوب پی رہے تھے۔ مگر ہندوستانیوں نے ایک پیالی کے بعد دوسرے کا حوصلہ نہیں کیا۔ مزہ اس کا تلخی مائل اور کرخت تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ عود دان گردش کررہا تھا۔ اس میں آگ رکھی ہوئی تھی عود سلگ رہا تھا اور اس کی خوشبو سے تمام کمرہ بلکہ کل ایوان شاہی معطر تھا۔ ہر ایک مہمان کے قریب عود دان لایا جاتا تھا ہم لوگوں نے صرف ہاتھ بڑھاکر اوس کے دھوئیں کو اپنے قریب کیا۔ عرب اپنی عبا پھیلا دیتے تھے۔ عود دان اوس کے اندر کردیا جاتا تھا اور اس کا دھواں انکے تمام ملبوس میں بھر جاتا تھا۔ قریب ایک گھنٹہ تک قصیدہ خوانی اور قہوہ نوشی کی مجلس گرم رہی۔ اوس کے بعد بادشاہ کھڑے ہوئے اور سب لوگ رخصت ہوئے۔ واپسی کے لئے موٹر موجود تھے۔ ہندوستان کے حساب سے قریب دس بجے رات کے ہم لوگ عباس کے مکان پر واپس آئے۔

۷ ذی الحجہ۔ آج صبح کو میں ڈاکٹر حسنی الطاہر سے ملا۔ انھوں نے مجھکو دیکھتے ہی میری اسپیچ کی تعریف کی۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ پھر میں نے بھائی صاحب کے متعلق مشورہ کیا۔ انھوں نے بہت ہمت بڑھائی۔ کہا کہ آپ کے بھائی صاحب کو

میں سرکاری موٹر پر لے چلونگا۔ آپ بھی اور ایک خدمتی آدمی بھی اوسی موٹر پر چل
سکتے ہیں اور یہ بھی کہا کہ برف کا انتظام میرے ساتھ رہے گا۔ انکے سر پر برابر برف
رکھی جاے گی اور دو سرکاری تیمار دار ہر وقت انکی خدمت کریں گے۔ عباس بھی
ہمراہ تھے اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ موٹر عرفات تک بڑی مشکل سے جاتے ہیں۔
راستہ بہت ناہموار ہے۔ مسافروں کو بہت دھکے برداشت کرنے پڑتے ہیں وغیرہ وغیرہ
میں نے ڈاکٹر طاہر سے ان دقتوں کو بیان کیا اُنھوں نے اتفاق راے کیا کہ اونٹ
کا سفر ایسے راستہ میں بہتر ہے۔ غرضکہ آج تیسرے پہر کو ہم لوگوں نے احرام بہ نیت
حج باندھا۔ ایک شبری میں لٹا کر جو بجنسہ مثل تابوت کے ہوتی ہے۔ قلیوں پر اُٹھوا کر
عباس کی ہمراہی میں بھائی صاحب کو طواف خانہ کعبہ کرایا گیا۔ ہملوگوں نے بھی
طواف بہ نیت حج کیا۔ تمام رات تیمارداری میں مصروف رہے آج پانچواں روز ہے
کہ کسی رات کو سونا نصیب نہیں ہوا۔ مریض کا جو عالم ہو۔ میری تو یہ کیفیت ہے کہ پیر
زمین پر سیدھے نہیں پڑتے۔ شب و روز جاگتے جاگتے۔ دماغ معطل ہو گیا ہے۔
۸ ذی الحجہ۔ صبح نور کے تڑکے اونٹوں پر اسباب لادا گیا۔ گود میں بھائی صاحب
کو لے کر شغدف میں لٹایا گیا۔ دوسری طرف میں بیٹھا۔ یہ معلوم ہوا کہ میری طرف
شغدف اُلٹا آتا ہے۔ کچھ بھاری بھاری چیزیں بھائی صاحب کی طرف رکھ کر میزان
برابر کی گئی۔ قافلہ روانہ ہوا۔ ہملوگ دوپہر کے قریب منے پہنچے۔ منے ایک قصبہ ہے
آبادی اس کی قریب دو ہزار کے ہے۔ صدر سڑک پر تین چار منزل کی عمارتیں مکہ
معظمہ اور مدینہ طیبہ کے نمونہ کی ہیں۔ آبادی کو طے کرنے کے بعد بڑی مسجد ملتی ہے
اسکا صحن بہت وسیع ہے اس کے وسط میں ایک قُبّہ ہے۔ جہاں خیمہ حضور سرور
کائنات کا نصب ہوا تھا اور اسی مقام پر سورۃ والصافات نازل ہوئی تھی۔ مسجد
کے سامنے بہت وسیع میدان ہے۔ اسی میدان میں حافظ ابراہیم کے خیمے استادہ
تھے۔ ہم لوگ اونٹوں سے اُتر کر خیمے میں مقیم ہوئے۔ اس میدان کے ہر دو جانب
پہاڑ ہیں اور میدان کی وسعت میں خیموں کا ایک بہت بڑا شہر آباد تھا۔ شام تک

بھائی صاحب کی تیمار داری میں مصروف رہا۔ بخار تیز چڑھا ہوا تھا۔ سر پر برف اور روغن گل برابر رکھتے جاتے تھے۔ عصر اور مغرب کی نماز بڑی مسجد میں پڑھی۔ اس مسجد کے دروازے پر دور تک حاجیوں نے بول و براز کرکے آمد و رفت کا راستہ خراب کر رکھا تھا۔ مسجد کے اندر کم از کم دو ہزار حاجی ٹھہرے ہوئے تھے۔ مکبر کے کھڑے ہونے کی جگہ پر میں نے نماز ادا کی۔ مغرب کے وقت یہاں سے روانگی ہوئی قریب تین گھنٹہ رات گذرے ہملوگ مزدلفہ کے مقام سے گذرے۔ اس سے ذرا آگے بڑھ کر حافظ ابراہیم صاحب معلم نے فرمایا کہ اسی مقام پر اصحاب فیل کا لشکر جو مکہ معظمہ پر حملہ کرنے جارہا تھا تباہ ہوا تھا۔ یہاں سے آگے بڑھ کر مجھ کو نیند آگئی اور ایسی گہری نیند آئی کہ شائد عمر میں اس سے قبل کبھی نہیں آئی۔ نہ شغدف کی میزان کا خیال رہا نہ بھائی صاحب کی تیمار داری کا۔ جب قافلہ آدھی رات کے بعد عرفات کے میدان میں پہنچا تو عباس نے اور میرے رفقا نے مجھ کو پکارنا شروع کیا۔ کئی آوازوں کے بعد آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ بایاں گھٹنا شغدف کے رستے سے چپک گیا ہے اوسکے علٰحدہ کرنے میں سخت درد ہوا۔ بمشکل اپنا پیر علٰحدہ کرکے اونٹ سے اُتر کر گھٹنہ دیکھا تو ایک روپیہ کے برابر گھٹنہ کی کھال چھل گئی تھی۔ خون نکل رہا تھا۔ اسی وجہ سے گھٹنا رسے سے چپک گیا تھا۔ اسقدر گہری نیند پر تعجب ہوا۔ بھائی جان پر ہاتھ رکھ کر دیکھا بے حس و حرکت تھے۔ میں بہت ڈرا۔ نبض دیکھی تو کمزور ضرور تھی مگر بخار کا پتہ بھی نہ تھا۔ سجدہ شکر بجالایا۔ شغدفوں کی قطار بنائی گئی۔ اوسکے سامنے خیمے نصب کئے گئے اونمیں ہم لوگ مقیم ہوئے۔ صبح ہوتے ہوتے تمام میدان عرفات میں خیموں کا ایک بڑا شہر آباد ہوگیا۔ یہاں پر کیمپ کسی خاص نقشے کے مطابق نہیں بنائے جاتے۔ درمیان میں باقاعدہ راستے اور چوراہے نہیں قائم کئے جاتے ہزاروں خیمے ایک نمونہ کے نصب ہوتے ہیں۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی حاجی اپنے خیمہ سے ذرا فاصلہ پر گیا تو پھر لوٹ کر اسی خیمہ میں آنا محال ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ مشہور ہے کہ عرفات کا بھولا واپسی پر منیٰ میں ملتا ہے۔

۲۸ر اپریل ۱۹۳۱ء۔ صبح نور کے تڑکے سامنے عرفات کا بلند پہاڑ نظر پڑا اور اسکے دامن میں ایک پلیٹ فارم پر ایک پتھر کا کھمبا چونے سے رنگا ہوا نظر آیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوکر خطبہ فرماتے تھے۔ اس مقام کو دیکھ کر دل نہایت بیچین ہوا۔ افسوس صد افسوس کہ اب کوئی ایسا نہیں ہے جو مسلمانوں کی رہبری اور فلاح و بہبودی کا وعظ موجودہ ضروریات کے مطابق اس مقام پر دے اور یہاں سے بذریعہ براڈ کاسٹ کے وہ خطبہ تمام دنیا میں سنا جائے اور اوس سے فائدہ دین و دنیا کا حاصل ہو۔ تمام دن حاجی اپنے کھانے پینے کے سامان میں مصروف نظر آئے۔ سیکڑوں دنبے کاٹے گئے۔ مزے مزے کے کھانے پکتے رہے خوب ذوق شوق سے کھانے کھائے گئے۔ آپس میں خوب گپیں رہیں اور باتوں باتوں میں اکثر تکرار لفظی کی نوبت پہنچتی۔ خاص خاص ہستیاں ایسی ضرور تھیں کہ وہ تسبیح خوانی میں مصروف نظر آئیں اور بہت کم ایسی ہستیاں تھیں جن کے سامنے اسلام کا گذشتہ موجودہ اور آئندہ مرقع موجود تھا۔ بہرکیف عصر کے قریب ہمارے معلم صاحب نے دعائے توبہ پڑھوائی۔ برائیوں سے بچنے کی نصیحت کی دل سے بغض و عداوت دور کرنے کا حکم دیا۔ بعد ختم دعا ہم لوگ خوب روئے اور آپس میں گلے ملے یا مصافحہ کیا اور ایمان تازہ کرکے واپسی کے لئے تیار ہوئے۔ مغرب سے ذرا قبل عرفات کے پہاڑ اور منبر نبوی پر ہزاروں حسرت کے ساتھ نگاہ ڈالتے ہوئے عرفات کے میدان سے واپس ہوئے۔

عرفات سے واپسی کے وقت جو ہل چل مچتی ہے۔ اُس کا اندازہ بہت محال ہے اونٹوں کی سیکڑوں قطاریں۔ پیادہ اور خچر سوار آدمیوں کی کثرت۔ شغدفوں کا ایک دوسرے سے ٹکرانا۔ ہر قدم پر اُلٹنے کا اندیشہ۔ چوٹ کا ڈر۔ گرد و غبار سے سانس کا رکنا۔ غرضکہ اسی عالم میں آدھی رات کے قریب مزدلفہ پہنچے اور ایک نہایت ناہموار کنکریلے مقام پر ہمارا قافلہ اُترا اور آن کی آن میں اس گھاٹی میں قدم رکھنے کی جگہ باقی نہ رہی۔ ایک مختصر جگہ میں ہم لوگوں نے آدھی رات کے وقت نماز مغرب اور

عشار ادا کی اور کنکریاں چننے میں مصروف ہوئے ۔ اونچاس کنکری اپنے لئے اونچاس
بھائی صاحب کے لئے چنکر احرام کے کونہ میں احتیاط سے باندھا کیونکہ ڈاکٹر
سراج الحسن نے یہ مسئلہ بتلایا کہ اگر کنکریاں کم ہوں گی تو پھر اسی مقام پر آکر اور
کنکریاں لیجانا پڑیں گی اور اگر زیادہ ہوں گی تو پھر یہاں واپس آکر اسی مقام پر
پھینکنا پڑے گا ۔ غرضکہ بمشکل دو گھنٹہ آرام کے بعد پھر روانگی کے لئے بل چل مچی صبح
کی نماز کی تیاری شروع ہوئی ۔ نماز صبح اول وقت پڑھکر یہ جم غفیر منٰی کی طرف
روانہ ہوا ۔ دو گھنٹہ دن چڑھے بقر عید کے روز منٰی کے قریب کی گھاٹی میں پہنچے
یہاں پر شغدفوں کا ٹکرانا اور چوٹیں آنا ایک معمولی بات ہے ۔ ہملوگ بفضلہ محفوظ
رہے لیکن بہت سہمے ہوئے تھے ۔ دو ایک حاجیوں کی نسبت سنا گیا کہ گرے اور
سخت چوٹیں آئیں ۔

۲۸ اپریل ۱۹۳۱ء ۔ قریب ڈھائی گھنٹہ دن چڑھے منٰی میں پہونچ گئے ۔ وہ میدان
جہاں پہلے قیام ہوا تھا ۔ اب خالی نہ تھا ۔ اوس سے ملا ہوا ایک پختہ تالاب ترکوں
کا بنوایا ہوا ہے اوسی کی دوسری جانب ہم لوگ خیمہ زن ہوئے ۔ اس تالاب میں ترکوں
کے وقت میں پانی بھرا رہتا تھا اور نہایت کار آمد تھا اب یہ بالکل خشک ہے اور اسکے
اندر اور اطراف میں بول و براز سے کوئی جگہ خالی نہیں ہے ۔ اسکے متصل ایک کنواں ہے
اسکا پانی بہت اچھا ہے مگر کوئی حاجی ڈول رسی سے خود پانی نہیں بھر سکتا کنوئیں
کے مالک کا پہرہ ہے وہ مزاحم ہوتا ہے یا قیمت پانی کی لیتا ہے ۔ ایک کنستر پانی کی
قیمت ۸ سے ۱۲ تک ہوتی ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ امسال پانی بہت ارزاں ہے ۔ ہملوگ
خیمہ میں اترتے ہی شیطان پر کنکریاں مارنے کے لئے روانہ ہوئے ۔ پہلے روز بڑے
شیطان پر سات کنکریاں ۔ دوسرے روز بڑے شیطان اور دو اور چھوٹے شیطانوں
پر سات سات کنکریاں یعنی کل اکیس کنکریاں اور اسیطرح تیسرے روز اکیس کنکریاں
ماری جاتی ہیں ۔ کنکریاں مارنے کا نظارہ بھی قابل دید ہوتا ہے ۔ خاصکر جب کوئی
کنکری کسی حاجی کے سر پر پڑتی ہے ۔ جہانتک یاد ہے ایک کنکری ڈاکٹر سراج الحسن صاحب بھی پڑ گئی ۔

شیطان نام ہے دیوار کے ایک حصہ یا ایک پتھر کے ستون کا جس پر کنکریاں مارتے ہیں - یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم کو شیطان بہکانا چاہتا تھا - اور انھوں نے کنکریاں اس پر ماریں تھیں - حضرت ابراہیم نے منےٰ کی کنکریاں ماری تھیں یا مزدلفہ سے کنکریاں لاکر منےٰ میں شیطان پر ماری تھیں - اسکا حال نہیں معلوم ہو سکا یہ تینوں شیطان منےٰ کی صدر سڑک پر واقع ہیں -

پہلے ہی روز کنکریاں مارنے کے بعد ہملوگ حجامت بنواکر غسل کرکے احرام سے باہر ہوئے - عباس اور حسن ابراہیم نے آکر قربانی اور دم کے واسطے جانوروں کی قیمت اپنے حاجیوں سے وصول کی - بعض حاجی خود قربانی کی مقررہ جگہ پر جاکر اپنے ہاتھ سے قربانی کرتے ہیں اور بہت سے اپنا اپنا نام اور ولدیت لکھوا دیتے ہیں اور معلم صاحب اونکی طرف سے قربانی کر دیتے ہیں - قربانی کے بعد جس کیمپ کی طرف نظر پڑتی ہے گوشت اور کلیجی پکاتے ہیں تمام حاجی اور معلم صاحبان مصروف نظر آتے ہیں اور بڑا حصہ گوشت کا معلم صاحبان اپنے گھر والوں کے خرچ کے لئے مکہ معظمہ روانہ کر دیتے ہیں

منےٰ میں دن کے وقت خیمہ کے نیچے جو گرمی ہوتی ہے اوس کا اندازہ مشکل ہے اسیطرح شام ہوتے ہی جیسی عمدہ خوشگوار اور خنک ہوا شروع ہوتی ہے اور رات بھر چلا کرتی ہے وہ کہیں اور نصیب ہونا محال ہے -

۳۰ اپریل ۱۹۳۱ء - بقرعید کے دوسرے روز سب سے پہلا کام یہ ہوا کہ ہملوگ شیطانوں کو کنکریاں مارنے گئے - وہاں سے آکر پھر قربانی کا سلسلہ جاری ہوا اور اس کے بعد اوس لو اور دھوپ میں گوشت اور کلیجی پکنے کی بہار قابل دید تھی - عین ظہر کے وقت جب گرمی کی شدت سے ہملوگ تلملا رہے تھے ایکبارگی ہوا کا ایسا تیز جھونکا آیا کہ ہمارا خیمہ اپنی جگہ سے اکھڑ کر معہ چوب اور سترہ میخوں کے دور جا پڑا اور یکایک ہملوگ چٹیل میدان کی تیز دھوپ میں بیٹھے نظر آئے - سخت حیرت ہوئی کہ خیمہ کیا ہوگیا - ذرا حواس بجا ہوئے تو دیکھا ہمارا خیمہ کچھ دور کے فاصلہ

پر پڑا ہوا ہے۔ ہمارے معلم صاحب کے صاحبزادے اور ملازمین دوڑے اونھوں نے فوراً اس کو بدستور سابق نصب کر دیا۔ خیمہ کا درمیانی چوب قریباً بارہ فیٹ اونچا تھا اور اوس کی لکڑی کا قطر ۴ انچہ سے کم نہ تھا اللہ نے بڑا فضل کیا کہ ہملوگوں میں سے کسی کے چوٹ نہیں لگی۔

منٰی کے قیام میں ایک نظارہ بہت دلسوز نظر آتا ہے وہ یہ کہ دن بھر کچھ کچھ وقفہ کے بعد حاجیوں کی میت سامنے سے گذرتی ہے ایک تابوت پر سرخ کپڑا سرکاری پڑا ہوا جس کے سرھانے اور پائنتی کی طرف سے میلا کفن نظر آتا ہے صرف دو قلی سرکاری اپنے سر پر تابوت رکھے ہوئے تیزی سے چلے جاتے ہیں نہ کوئی حاجی میت کے ساتھ ہوتا ہے نہ کوئی شخص کندھا دیتا ہے۔ یہی مزدور مقام مقررہ پر لیجا کر اوسکا گور گڑھا کر دیتے ہیں۔ جس مقام پر ہزاروں آدمی اپنا اپنا ایمان تازہ کرنے کے لئے جمع ہوئے ہوں وہاں مسلمان حاجی کی میت اس شان سے اٹھنا ایک عبرتناک منظر ہے۔

یکم مئی ۱۹۳۱ء۔ بقر عید کے تیسرے دن صبح تڑکے شیطانوں کو کنکریاں مارنے کے بعد مکہ معظمہ کی طرف روانگی شروع ہو جاتی ہے کیونکہ اسی روز عصر کے وقت تک طواف کعبہ اور صفا مروا دوڑنا لازمی ہے۔ یہ وقت بھی منٰے میں بڑی ہل چل کا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سراج الحسن اور چند رفقاء کنکریاں مار کر واپس نہیں ہوئے تھے کہ ہمارے اونٹ منٰے سے روانہ کر دئے گئے اور پروگرام یہ طے پایا کہ بڑے شیطان سے آگے بڑھ کر اونٹ روک کے جائیں گے اور سب حاجی اپنے اپنے اونٹ پر آکر سوار ہو کر مکہ معظمہ روانہ ہونگے ہمارے قافلہ کے اونٹ جس راہ سے گذرے وہ تنگ تھی۔ اوس کے ایک جانب موٹر کار سرکاری رکے ہوئے تھے دوسری جانب دیگر قافلوں کے اونٹ کھڑے تھے۔ جیسے ہی ہمارے اونٹ موٹروں کے پاس سے گذرے کہ ایک موٹر والے نے اپنے موٹر کا ہارن بجایا۔ اس کی ہولناک آواز سے اونٹ ایسے بچکے اور اسطرح کودنے اور اُچکنے لگے کہ سخت چوٹ کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ علی ملازم معلم صاحب میرے شغدف کا

محافظ تھا اُس کو ہرچند آواز دی مگر اوس کا پتہ بھی نہ تھا۔ میں تو ضرور کود پڑتا لیکن بھائی صاحب جو دوسرے شغدف کے اندر انتہائی ضعف اور پریشانی کے عالم میں لیٹے ہوئے تھے انکا خیال میرے کودنے کا مانع رہا۔ غرضکہ قریب پندرہ منٹ کے بعد اس خطرہ کے مقام سے قافلہ آگے بڑھا اور مقررہ مقام پر پہونچکر اونٹ روکے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر سراج الحسن صاحب اور دیگر رفقاء سفر آپہونچے سب کے آنے پر معلوم ہوا کہ دو اونٹ گم ہیں یعنی موٹر سے بھڑکنے کے وقت وہ رسیاں توڑا کر معہ اسباب نہ معلوم کس طرف روانہ ہوگئے۔ یہ دونوں اونٹ الہ آباد اور رام پور کی عورتوں کے تھے۔ وہ بیچاریاں اوسی جگہ بٹھلائی گئیں اور اسحاق ابراہیم اپنے گدھے پر اور معلم صاحب کے ملازمین منے کی طرف معہ ایک اونٹ والے کے تلاش میں روانہ ہوئے اور سب حاجی اپنے اپنے اونٹوں پر بیٹھے۔ ڈاکٹر سراج الحسن صاحب اپنے اونٹ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کا ہینڈ بیگ بھی اوسی ہل چل کے وقت گر گیا۔ عباس ابراہیم نے اُسکی تلاش کے لئے بھی آدمی روانہ کئے مگر ہینڈ بیگ آجتک نہیں ملا۔ ہرچند کہ مکہ معظمہ پہونچکر اونٹ والوں کے چودھری پر بہت تاکید کیگئی اور ڈاکٹر صاحب نے معلم صاحب کی معرفت حکومت میں اس کی رپورٹ بھی لکھوائی۔

غرضکہ ہم لوگ قریب دوپہر کے اپنے گھر پہنچے بھائی جان کو گود میں کرکے اپنے کمرہ تک پہنچایا اور ذرا دم لے کر خانہ کعبہ کے طواف کے لئے گئے۔ اوس سے فارغ ہوکر صفا مروا دوڑے۔ شام کو قبل عصر شبری کے اندر لٹا کر بھائی صاحب کو طواف کرایا گیا اور اسیطرح صفا مروا دوڑا گیا۔ ہملوگ کل ارکان حج سے بحمداللہ فارغ ہوگئے۔

حج کے مجمع کے متعلق کوئی صحیح تعداد دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ جہازوں کے شمار اور حرم شریف کے اندر جمعہ کی نماز میں حج سے تین چار روز قبل اور عرفات اور منٰے میں جو اندازہ میں نے کیا اوس سے میری رائے میں بیس پچیس ہزار آدمی سے زیادہ نہیں تھے۔ جاوہ کے مسلمان بہت آتے ہیں۔ مشہور ہے کہ جب تک حج سے فارغ نہ ہولیں اون کی شادی نہیں ہوتی۔ یہ لوگ قد قامت میں عموماً بہت مختصر اور ہلکے

پھلکے ہوتے ہیں۔ ان کے کپڑے اور سامان عموماً بہت صاف ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کم سخن ہوتے ہیں۔ تعداد ان کی قریب سات ہزار کے تھی۔

مصری مسلمان نہایت تنومند۔ صاف ستھرے۔ کم سخن مگر اشتعال پذیر۔ گورے چٹے ہوتے ہیں۔ عورتیں اُن کی گراں ڈیل۔ ہاتھوں اور چہرے پہ گدنا گدائے ہوئے ہوتی ہیں۔ تعداد اونکی قریباً چار ہزار۔ مراکو کے مسلمانوں کو یہاں مغربی کہتے ہیں۔ یہ مصریوں سے مشابہ مگر لباس میں کچھ مختلف۔ اُن کی تعداد مشکل سے ایک ہزار ہوگی۔ ہندوستانی مسلمان قریب آٹھ ہزار کے ہونگے۔ انمیں بنگالی مسلمان عموماً اوس طبقہ کے ہوتے ہیں جو بہت میلے اور لڑاکا اور ضدی ہوتے ہیں۔ سندھی مسلمان زیادہ نیک حلیم ہوتے ہیں۔ افغانی قریب پانسو کے ہوں گے۔ یہ لوگ شورغل بہت مچاتے ہیں۔ لباس بہت کثیف پہنتے ہیں۔

بخاری جن میں تاشقند اور یارقند کے لوگ زیادہ ہوتے ہیں۔ شکل صورت میں افغانیوں سے مشابہ لیکن ان سے کچھ زیادہ مہذب اور صاف ہوتے ہیں۔ باقی تعداد زیادہ تر قرب و جوار کے غریب عربوں کی تھی۔ یہ لوگ انتہائی غربت کی حالت میں نظر آتے تھے۔ شامیوں اور ترکوں کا کوئی قافلہ باضابطہ جیسا کہ آتا تھا نہیں آیا۔ لیکن شامی اور ترک اکثر نظر آئے۔ مرد عورتیں نہایت سُرخ سپید اور صاف ستھرے تھے۔

<u>۲ر مئی سے ۶ر مئی ۱۹۳۰ء تک</u>۔ ۱۳ر۔ ۱۸ر ذی الحجہ۔ اب ہم لوگ مکہ کی سیر۔ تحائف اور تبرکات کے خریدنے اور اوقات مقررہ پر حرم شریف میں نماز ادا کرنے اور طواف کعبہ میں مصروف ہیں اور ہر وقت عباس اور حسن ابراہیم سے تقاضا ہے کہ جدہ کی روانگی کی فکر کریں۔ منشی احسان اللہ صاحب نائب کونسل جدہ پہلی مرتبہ قبل حج جب مکہ معظمہ آئے تھے تو اونسے بھی میں ملا تھا۔ نہایت تپاک اور اخلاق سے پیش آئے تھے۔ انھوں نے بھی عباس سے تاکید کردی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کو بعد حج جلد جدہ روانہ کردینا۔ غرضکہ ۵ر مئی کو معلوم ہوا کہ ہم لوگ کل جدہ روانہ

ہو نگے۔ بھائی صاحب کی انتہائی کمزوری کیوجہ سے مجھکو فکر ہوئی کہ مکہ گیٹ تک بھائی صاحب کو عربیہ پر جانے اور وہاں گھنٹوں قیام اور انتظار کرنے میں سخت تکلیف ہوگی اگر خلاف قاعدہ عام مجھ کو خاص طور پر اجازت ملجاتی تو ایک عمدہ چھوٹا موٹر میں اپنے مکان سے بھائی صاحب کو سوار کراکر جدہ لیجاتا۔ چنانچہ اسی خیال سے میں ڈاکٹر حسنی الطاہر کے پاس گیا۔ بہت تپاک سے ملے۔ معانقہ کیا۔ فرمانے لگے کہ عرفہ کے میدان میں بہت دور تک آپ کو تلاش کرتے کرتے تھک گیا۔ کہیں پتہ نہ چلا۔ بہت سی برف بھائی شوکت حسین کے لئے اپنے پاس محفوظ رکھے رکھا۔ اونکی طرف سے اتنا اندیشہ تھا کہ جب کوئی رپورٹ فوتی کی ہوتی تو میں غور سے نام پڑھ لیتا تھا کہ کہیں آپ کے بھائی کے انتقال کی خبر نہ ہو الحمدللہ کہ وہ بخیریت واپس آئے۔ اب کیسے ہیں۔ میں نے کہا کہ بہت اچھے ہیں۔ لیکن کمزور ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے موٹر کے لئے خاص اجازت ہو جائے کہ مکان تک آکر ہم کو سوار کرا کر جدہ لیجائے۔ انھوں نے فوراً سپرنٹنڈنٹ پولس کے نام خط لکھکر مجھکو دیا اور کمرہ کے باہر تک پہنچانے کے لئے آئے اور بہت محبت اور دلسوزی کے ساتھ رخصت کیا۔ میں ڈاکٹر صاحب کا خط لے کر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے دفتر گیا۔ انھوں نے فوراً ایک دستی تحریر اجازت موٹر کی نسبت لکھ کر مجھ کو دیدی یہ سارٹیفکٹ عباس کی معرفت موٹر والے کے پاس بھیجدیا گیا۔ مکان آکر جو سامان موٹر پر لیجانے کے قابل نہ تھا۔ دوسرے حاجیوں کے سامان کے ہمراہ اونٹوں پر جدہ روانہ کیا گیا اور مختصر سامان کے ساتھ ہم لوگوں نے رات بسر کی۔

۷ مئی ۱۹۳۱ء۔ بہت سویرے حرم شریف میں حاضر ہوئے۔ نماز پڑھی۔ طواف الوداع سے فارغ ہوئے۔ خانہ کعبہ اور کل حرم شریف پر حسرت اور ارمان کی نظر ڈالتے ہوئے اور الوداع کہتے ہوئے اولٹے پیروں باب الوداع تک آئے۔ پھر اپنے گھر پہونچکر کچھ ناشتہ کیا۔ ہمارے ساتھی سب لاریوں پر سوار ہونے کے لئے مکہ گیٹ کی طرف تانگہ پر روانہ ہوئے۔ ہمارا موٹر دروازہ پر آلگا۔ حافظ ابراہیم صاحب معلم سے رخصت ہوکر میں اور بھائی صاحب اور مسٹر عبدالرحمن اور ایک رفیق سفر موٹر پر بیٹھ کر رخصت ہوئے

مکہ گیٹ پر عباس اور ان کے سب بھائیوں سے ملاقات ہوئی۔ یہ سب ہملوگوں کو رخصت کرنے کے لئے یہاں تک آئے تھے۔ عباس اور حسن ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کے قافلہ کے ساتھ جدہ تک چلیں گے۔ ہمارا موٹر چند منٹ قیام کے بعد روانہ ہوا۔ شہر کی پہلی چوکی پر جانچ پڑتال میں قریب بیس منٹ کے صرف ہوا۔ یہاں سے جدہ تک کا راستہ نہایت سہولت اور تیزی سے طے ہوا۔ موٹر نہایت عمدہ اور نیا تھا کئی لاریاں ریگستان میں پھنسی ہوئی ملیں مگر ہمارا موٹر بہت آسانی سے گذرتا ہوا قریب ۵ گھنٹہ دن چڑھے جدہ پہنچ گیا۔ یہاں عین بازار میں ہم لوگ موٹر سے اتر کر اور ایک عربیہ کر کے کرایہ کے مکان کی تلاش میں نکلے کیونکہ مسافر خانہ حاجیوں سے بھرا ہوا تھا اور آتے وقت یہاں پر قیام کرنے میں جس قدر تکلیف ہوئی تھی۔ اوسکو مکرر برداشت کرنا منظور نہ تھا۔ مجتبے شلبی کے مکان پر ہم لوگ تین روپیہ روزانہ کرایہ پر ٹھہرے یہاں سے سمندر نظر آتا ہے۔ اس مکان میں ایک چھت ہے۔ جہاں رات کو ہملوگ آرام سے سوتے ہیں۔ دس بجے رات کو ڈاکٹر سراج الحسن صاحب بہمراہی جماعت آ پہنچے۔ چونکہ ہمارا کمرہ مختصر تھا لہذا انھوں نے دوسرا کمرہ لے لیا۔ جدہ میں پانچ روز آرام تمام قیام رہا۔ مجتبے شلبی ایک غریب آدمی ہے۔ مُعیلہ چلاتا ہے۔ مگر اس کے مکان کا کمرہ جس میں ہم لوگ ٹھہرے تھے ایسا ستھرا اور آراستہ تھا کہ یہاں عموما سو روپیہ مہینہ پانے والے کا بھی نہیں ہوتا۔ اس کے دو بیویاں تھیں اور اسقدر میل و محبت سے رہتی تھیں کہ اسکی نظیر ہندوستان میں ملنا محال ہے۔

۱۰ ر مئی ۱۹۳۱ء کو معلوم ہوا کہ جہاز سروستان کلہ روانہ ہو گا۔ ہم لوگوں نے رات کو اپنا اسباب ٹھیک کرنے کے بعد ذرا آرام کیا۔ آفتاب نکلنے سے دو گھنٹہ قبل مسافر خانہ (۱۱ ر مئی ۱۹۳۱ء) پہونچے وہاں ڈاکٹر سراج الحسن اور دیگر ہمراہیوں کو بیدار کیا عباس نے اسباب بندرگاہ پر روانہ کیا۔ ہم لوگ آفتاب نکلنے سے قبل ایک موٹر بوٹ پر بیٹھ گئے عباس ہم لوگوں سے رخصت ہوتے وقت بہت آبدیدہ ہوا۔ آفتاب نکلتے نکلتے موٹر بوٹ روانہ ہوا۔ ہملوگ آناً فاناً جہاز سروستان پر پہنچ گئے۔ بھائی جان اب بفضلہ

کچھ کچھ اپنے پیروں چل پھر لیتے ہیں۔ جہاز پر اُن کے آرام کا انتظام کرکے اسباب کی کشتی کا انتظار کرتے رہے۔ قریب ۵ گھنٹہ دن چڑھے اسباب کی کشتی پہونچی اور دیگر رفقاے سفر بھی اسی کشتی پر آئے۔ شام تک دھوپ میں جر ثقیل کے پاس کھڑے ہوکر اپنے اسباب کے انتظار اور اس کے نکالنے میں مصروف رہے بمشکل نشست کی جگہ محفوظ کی۔ ہمارے چاروں طرف افغانی اور بخاری حاجیوں کی اتنی کثرت تھی کہ واپسی کے سفر میں کپتان صاحب کا روزانہ گشت جو معمولاً ہر طرف ہوتا تھا۔ ادھر اتفاق سے بھی نہیں ہوا۔ جن لوگوں کو سب لوگ بخاری کہتے ہیں یہ عموماً چینی ترکستان یعنی یارقند اور تاشقند کے باشندے ہوتے ہیں۔

روانگی جدہ سے دوسرے روز جہاز کے خلاصی دو تین لچھے ستلی کے ہماری نشست کے قریب بھولے سے چھوڑ گئے تھے اسی پر ایک پنجابی مسلمان حاجی آکر کھڑا ہوا۔ یہ بیچارہ بہت علیل تھا اور اس کو سلسل بول کا مرض تھا اُس نے کھڑے کھڑے پیشاب کیا اور ستلی کے لچھے پیشاب سے تر ہوگئے۔ لوگوں نے اُس کو پیشاب کرتے دیکھا تو اُس مقام سے کھینچتے ہوے دور لیجاکر چھوڑ آئے۔ ایک بخاری صاحب اپنی جگہ سے اُٹھے۔ ستلی کے لچھوں کو لپیٹا اور بنا بیگ کھول کر اپنے کپڑوں کے اندر اس کو احتیاط سے رکھ لیا۔ اس منظر سے سخت عبرت ہوئی۔ یہ شخص ابھی حج کرکے آرہا ہے اور نیت کا یہ حال ہے۔

آمد کے وقت حاجی زیادہ تر مرض پیچش میں مبتلا ہوتے اور چار پانچ موتیں روز ہونے لگیں۔ ایک بڑھیا پیچش سے قریب المرگ تھی۔ میں نے چار روز برابر ایمی ٹین کا انجکشن دیا۔ مرض جاتا رہا۔ ایک افغانی بوڑھا آدمی بہت بیمار تھا۔ اُسکے رفیق اسکو جہاز کے اسپتال میں پہنچا آئے تیسرے روز ہم لوگوں نے دیکھا کہ اسپتال کے قلی اُس کو افغانی قافلہ کے درمیان لٹا کر چلے گئے۔ اُس کی حالت نہایت خراب تھی۔ سسک رہا تھا۔ اُس کے رفیق اُس کے قریب بیٹھکر قرآن پڑھنے لگے۔ قریب شام اُس کا انتقال ہوا۔ افغانیوں نے نماز جنازہ پڑھی۔ نماز میں ہم لوگ بھی شریک

ہوئے۔ جہاز سے کفن ملا۔ اوس کا جنازہ تختہ پر رکھ کر سمندر کے نذر کیا گیا۔
شام کو ڈاکٹر صاحب جہاز سے ملاقات ہوئی میں نے بہت اعتراض کیا کہ ایسی حالت میں مریض اسپتال سے کیوں نکالا گیا۔ کوئی معقول جواب نہ ملا۔ ہر روز صبح کو بیماروں کا مجمع میرے قریب ہوجاتا تھا اور میں اپنے پاس سے دوائیں تقسیم کرتا تھا۔ ایک بخاری کو یرقان ہوا میں نے دوا دی تیسرے روز اسکو افاقہ ہوا۔ اُس کے ساتھ ایک ضعیف العمر آدمی تھا۔ اوس نے پانچ روپیہ نذر کئے میں نے شکریہ کے ساتھ واپس کیا اور کہا کہ صرف دعاے خیر چاہتا ہوں اس جملہ کا میرے منہ سے نکلنا تھا کہ وہ بوڑھا اور اسکے ساتھ سب بخاری کھڑے ہوگئے اور ہاتھ اٹھا کر میرے لئے دعا کرنے لگے۔ دو تین منٹ بعد دعا ختم کی اور بیٹھ کر سب نے مصافحہ کیا اور شکریہ ادا کیا۔

ہمارے قافلہ میں اسبارہ میں اختلاف راے تھی کہ ہملوگ کراچی میں جہاز سے اُتریں یا بمبئی چلیں۔ ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کو زیادہ اصرار بمبئی چلنے کا تھا اور وجہ اُس کی یہ تھی کہ انھوں نے بمبئی میں ایک دوکان پر اپنا پنکھا کائی کو مرمت کے لئے دیا تھا۔ اوسکو خود دیکھ کر اور امتحان کر کے واپس لینا منظور تھا۔ لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ اٹھارہ مئی کو چار گھنٹہ رات گذرے ایک ایسا طوفانی جھونکا آیا کہ سارے مسافر سہم گئے۔ بجائے پہلوی حرکت کے جہاز آگے پیچھے جھونکے کھانے لگے۔ کھانا پکانے کے برتن ادھر اُدھر گرنے لگے۔ غرضکہ خدا خدا کر کے تھوڑی دیر میں یہ طوفان پسپا ہوا۔ اب کراچی اوترنے کے لئے سب لوگ بدل وجان راضی ہوگئے کہ خدا رات بھر کی خیر رکھے تو صبح کراچی ضرور اُتر جائیں گے رات کو نیند بہت کم آئی۔

۱۹ رمئی ۱۹۳۱ء۔ بہت تڑکے اوٹھ کر دیکھا۔ کراچی کے بندرگاہ کے سامنے ہمارا جہاز رکا ہوا تھا۔ میں نے فوراً غسل کیا۔ نماز پڑھی۔ اسباب ٹھیک کیا۔ قریب سات بجے صبح کے مسافر جہاز سے اوترنے لگے۔ ہملوگوں نے اسباب قلیوں کے ذریعے

نیچے بھیجا۔ یہاں قلی نے للعہ رچار روپیہ اُجرت لی۔ آتے وقت بمبئی میں اسی اسباب کی مزدوری نو روپیہ دیگئی تھی۔

کراچی میں حج کمیٹی کا انتظام نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے اور اُن کے ممبروں کا اخلاق اور برتاؤ حاجیوں کے ساتھ نہایت ہمدردی کا ہے۔ جہاز کے پلیٹ فارم پر بہت تڑکے سے ایک بڑا مجمع اُون نیکبخت مردوں اور عورتوں کا موجود تھا جو حاجیوں کے لئے آئے تھے۔ عورتیں عورتوں کے اوتارنے میں مدد دیتی تھیں۔ ہر ایک سے مصافحہ کرتی تھیں۔ اور مرد عموماً کمزور اور ناتواں مردوں کی دستگیری کرتے تھے۔ ہم لوگ نہایت آرام سے بھیڑ کم ہونے کے بعد جہاز سے اوترے اور تلاش کرتے ہوئے اپنے اسباب تک پہونچے۔ یہاں ایک طرف حاجیوں کے لئے بہت بڑا دستر خوان بچھا ہوا تھا جہاں سیکڑوں حاجی جی کھول کر کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ ہم لوگوں نے دستر خوان کی جانب پیش قدمی نہیں کی مگر ہماری جگہ پر ایک سینی بھر کر نہایت عمدہ بریانی ایک صاحب لے آئے۔ اوس میں کچھ مرچ بڑی ہوئی تھی اس لئے میں نے دو ہی چار لقمہ کے بعد ہاتھ کھینچ لیا لیکن اور سب ساتھی خاصکر ڈاکٹر سراج الحسن صاحب بہت دیر تک کھانے میں مصروف رہے۔ اس کے بعد برف کا پانی آیا۔ ہم لوگوں نے خوب آسودہ ہو کر پیا۔ یہ سب انتظام یہاں کے فراخ حوصلہ مسلمان حاجیوں کے ہر جہاز کے لئے کرتے ہیں۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں ریل کا ٹکٹ لینے کے لئے گیا۔ پندرہ منٹ بعد آیا تو دیکھا کہ یہاں کے کسٹم آفس کا ایک انگریز ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کی دواؤں کے بکس کا جائزہ لے رہا ہے اور دواؤں کی فہرست سے دوائیں ملا رہا ہے۔ میں نے پہونچتے ہی اوس سے انگریزی میں بیان کیا کہ ہم لوگ ڈاکٹر ہیں یہ دوائیں اپنی اور دیگر مسافروں کی ضرورت کے خیال سے ساتھ لے لی گئیں تھیں ان میں کوکین وغیرہ نہیں ہے۔ اسپر وہ فوراً اُٹھ کر چلا گیا اور کل اسباب پر نشان پاس کا ڈالا گیا۔ اب میں سب اسباب اُٹھوا کر ترازو پر لوالے گیا۔ وہاں اسباب تولا گیا۔

قریب ستر روپیہ کے محصول ادا کیا۔ اسی اثنا میں معلوم ہوا کہ سامنے پلیٹ فارم پر جو ٹرین کھڑی ہے یہی حاجیوں کی اسپشل ٹرین ہے اور ابھی فوراً روانہ ہونیوالی ہے فوراً اس کی خبر اپنے رفقاء کے پاس بھیجی وہ گاڑی تک پہنچ گئے میں نے بعجلت تمام اسباب درجہ تک روانہ کیا اور ہم سب لوگ فراغت سے ایک بڑے درجہ میں بیٹھ گئے۔ اس درجہ میں بجز میرے ساتھیوں کے اور کوئی مسافر نہیں بٹھلایا گیا۔ کراچی میں جو انتظام حاجیوں کے اسپشل کا ہے۔ شاید اُس کی نظیر دوسری جگہ موجود نہیں ہے۔ یعنی اس گاڑی پر بجز حاجیوں کے عام مسافر کہیں نہیں بٹھلائے جاتے۔ ایک درجہ میں باورچی خانہ ہوتا ہے اوسمیں تازہ کھانا شوربہ دال چاول پلاؤ وغیرہ ہر وقت تیار رہتا ہے۔ ایک درجہ میں برف سادہ پانی اور لوتل کے پانی رہتے ہیں۔ ہر مقام پر جہاں گاڑی ٹھہرتی ہے اپنے اپنے درجہ میں حاجی اپنا کھانا منگوا کر کھاتے ہیں۔ قیمت نہایت معمولی رکھی گئی ہے۔ کراچی سے کئی اسٹیشن تک دودھ کا شربت برف پڑا ہوا ہر درجہ میں لایا جاتا ہے۔ اور حاجیوں کو باصرار اور بلا قیمت پلایا جاتا ہے۔ اس گاڑی کی رفتار مثل ڈاک گاڑی ہے۔ صرف بڑے اسٹیشنوں پر روکی جاتی ہے اور وقت اس عمدگی سے مقرر کئے گئے ہیں کہ وہ وقت عموماً نماز کا ہوتا ہے مگر میں نے کسی پلیٹ فارم پر نماز باجماعت ہوتے نہیں دیکھی۔ مسافروں کے بٹھلانے میں یہ انتظام کیا جاتا ہے کہ لاہور کی طرف جانے والے حاجی ٹرین کے اگلے نصف حصہ میں بٹھلائے جاتے ہیں اور دہلی کی طرف جانے والے مسافر پچھلے حصہ میں بٹھلائے جاتے ہیں۔

۲۰ مئی ۱۹۳۱ء۔ کمستا جنکشن پر پہونچکر لاہور کا حصہ دوسری ٹرین میں اور بقیہ نصف حصہ دہلی کی ٹرین سے لگا دیا گیا۔ لیکن پھر بھی دہلی تک ان درجوں میں کوئی اور مسافر بیٹھنے نہیں پاتا۔ کیونکہ ہر درجہ کے باہر حاجی اسپشل لکھا رہتا ہے۔ کراچی سے کچھ آگے بڑھ کر ریگستان مثل عرب کے ریگستان کے ملتا ہے۔ کراچی کے قریب بوجہ قرب سمندر کے ہوا نہایت خوشگوار تھی۔ لیکن جیسے جیسے سمندر دور

ہوتا گیا گرمی بڑھتی گئی - دوپہر کے بعد درجہ کے اندر کا ٹمپریچر غالباً ۱۱۸ تک پہونچا ہوگا۔ باہر سے اسقدر ریگ اوڑ اوڑ کر درجہ کے اندر آتی تھی کہ بستر کے اوپر ایک تہ ریگ کی جمع ہوگئی تھی - اسیطرح دن گذارات آئی اور سفر آرام سے طے ہونے لگا -

۲۱ مئی ۱۹۳۱ء - آٹھ بجے صبح کے قریب ہم لوگ آرام سے دہلی پہنچے - معلوم ہوا کہ الہ آباد کا اکسپریس دوسرے پلیٹ فارم پر موجود ہے - فوراً اسباب اتروا کر اکسپریس پر لائے - میں نے اور ڈاکٹر سراج الحسن صاحب نے اور دو ایک ساتھیوں نے اپنے گھروں پر ارجنٹ ٹیلیگرام پہنچنے کی اطلاع کا دیا - دہلی سے گاڑی چھوٹی غازی آباد کے اسٹیشن پر مسافروں کا ہجوم تھا - دو آدمی ہمارے درجہ میں آنے کی ضد کرنے لگے - ہملوگ ان کو معمولی مسافر سمجھتے تھے - ڈاکٹر سراج الحسن صاحب بہت کچھ سمجھاتے رہے کہ یہاں جگہ نہیں ہے - ہملوگ حاجی ہیں وغیرہ وغیرہ مگر وہ لوگ اندر گھس آئے اور فوراً میرے صندوق پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ اسکو کھولو اس میں کوکین کا شبہ ہے - مجبوراً صندوق کھولا - مگر انھوں نے کوئی چیز نہیں دیکھی صرف اپنی ضد پوری کر کے فوراً اتر گئے - الہ آباد پہونچکر میں نے کمشنر صاحب بہادر اکسائز کو اطلاع دی - اون کا جواب آیا کہ اس تکلیف کا افسوس ہے مگر غلط فہمی نیک نیتی کیساتھ تھی -

ساڑھے سات بجے شام کو گاڑی فتح پور پہنچی - یہاں عزیز از جان مولوی انوار الحق صاحب میرے خویش اور لخت جگر شاہد سلمہ اور میرا نواسہ انوار مصطفےٰ عرف مجن سلمہ اور مکرمی خان بہادر عبد القیوم خاں صاحب اور مکرمی عبد الرحمن خاں صاحب ہم لوگوں کی پیشوائی کے لئے موجود تھے - نہایت گرمجوشی سے معانقہ اور مصافحہ ہوا - اور معلوم ہوا کہ وطن میں پہنچ گئے - بات چیت میں راستہ کا پتہ اور بھی نہ چلا - قریب دس بجے رات کے الہ آباد اسٹیشن پر گاڑی پہنچی - یہاں پر اعزا اور احباب کا مجمع سیکڑوں کی تعداد میں خیر مقدم کے لئے موجود تھا - ٹرین کے پلیٹ فارم کے اندر داخل ہوتے ہی اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوئے - مشکل سے ٹرین رکنے پائی تھی کہ معانقے ہونے لگے - اسباب کا خیال تک باقی نہ رہا - اگر عزیزی

مولوی انوارالحق نہ ہوتے تو میرے انگریزی پلنگ اور ہاتھ کی چھڑی کی طرح کُل اسباب ریل کے اندر چھوٹ جاتا۔ پھولوں کے اسقدر ہار پہنائے گئے اور اسقدر معانقے ہوئے کہ میرے حواس بجا نہ رہے۔ مکرمی خان بہادر اکرام حسین صاحب کو اس کا احساس ہوا۔ اُنھوں نے اشارہ کیا کہ ان کو جلد اسٹیشن کے باہر لے چلو ورنہ بیہوش ہو جائیں گے۔ عزیز مکرم ضرغام صاحب پنکھا جھلتے ہوئے اور لخت جگر بشیر سلمہ اور ظہیر سلمہ اور سب احباب باہر تک آئے یہاں موٹر موجود تھے اوس پر بیٹھکر گھر پہنچے۔ جو عزیز عورتیں روانگی کے وقت تھیں تقریباً وہ سب موجود تھیں۔ دونوں لڑکیون اور سب بچوں کو گلے سے لگایا اور سجدہ شکر خدائے پاک ذوالجلال والاکرام کا بجالایا۔

شکر صد شکر ٹھکانے لگی محنت میری
طے ہوئی آج کی منزل میں مسافت میری

مسئلہ بقاء و اصلاح ندوہ

جناب ایڈیٹر صاحب اخبار الھلال - تسلیم !

معاملات ندوہ کے متعلق آجکل تقریباً کل اسلامی اخباروں میں جو بحث جاری ہے باوجود دیگر مشاغل ' راقم حروف نے بڑی دلچسپی کے ساتھہ مطالعہ کیا - میں اس موقعہ پر علامہ شبلی یا آنکے مخالف گروہ کی تائید یا تردید کرنا نہیں چاہتا ' لیکن سلسلۂ بحث میں دو ایک باتیں ایسی پیش آگئی ہیں جنکی نسبت چند کلمے عرض کرنا ضروری معلوم ہوتے ہیں - کیونکہ آنکے متعلق میرے خیال میں اسوقت تک کسی نے بے لاگ راے قائم نہیں کی ہے -

مثلاً مولوی عبد السلام صاحب ندوی نے اپنے ایک خط میں طلباے ندوہ کو اسٹرائک کرنے کی جو تحریک کی ہے آسے تمام لوگوں نے ' عام اس سے کہ وہ مولوی شبلی صاحب کے موافق ہوں یا مخالف ' حد درجہ مذموم اور قابل ملامت فعل قرار دیا ہے - اور الھلال نے بھی سخت ملامت کی ہے -

مجھکو چونکہ بفضلہ تعالے کسی گروہ سے تعلق نہیں ہے اسلیے بلا خوف تردید و لومۃ لائم اس راے کا ظاہر کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ تحریک اسٹرائک کو علامۂ شبلی کے ایما سے منسوب کرنے کے سوا باقی اور کوئی بات مولوی عبد السلام صاحب کے خط میں قابل اعتراض نہیں ہے -

جو لوگ اُنکی تحریر کو جنون، شکایت، یا فتنہ پردازی قرار دیتے ہیں، اُنہیں پہلے یہ بات ثابت کرنا چاہیے کہ بحالت مجبوری اسٹرائک کرنا یا اسکی تحریک کرنا کوئی نامعقول فعل ہے - ہم کہتے ہیں کہ زبردست کے مقابلے میں کمزوروں کا اسٹرائک کرنا اُنکا ایک قدرتی حق ہے جسکو بلا دلیل ناجائز قرار دینے کا کسی شخص کو کوئی منصب حاصل نہیں - اگر کسی کو اس بات کا دعوی ہو تو وہ اُسے پیش کرے - اُسکا مسکت جواب دیا جائیگا - انشاء اللہ تعالے -

مولوی عبد السلام صاحب نے اسٹرائک کی جو تحریک کی تھی وہ بالکل صحیح تھی، اور اگر وہ پختہ کار یا صاحب استقلال ہوتے تو اپنی تحریر پر اطمینان اور صداقت کے ساتھہ قائم رہ سکتے تھے - لیکن افسوس کہ اعتراض کی کثرت سے گھبرا کر انہوں نے خود ہی اپنے ایک بالکل جائز فعل کو ناروا تسلیم کرلیا - تحریک اسٹرائک کو مولوی شبلی صاحب کے نام سے منسوب کرنے کو ہم اچھا نہیں کہتے، لیکن وہ بھی کوئی اسدرجہ مذموم فعل نہیں ہے کہ اسکی بنا پر مولوی عبد السلام صاحب پر گالیوں کی بوچھاڑ کردی جائے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تحریک اسٹرائک کے متعلق مولوی شبلی صاحب نے کوئی علانیہ ایما نہ کیا ہوگا، لیکن فحوائے کلام سے ایسا ضرور دریافت ہوسکتا ہوگا کہ مولانا اس تحریک کو قابل اعتراض نہیں سمجھتے، جیسا کہ اب بھی انکی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بحالت مجبوری اسٹرائک کو جائز قرار دیتے ہیں - پس ایسی حالت میں اپنی تحریک کو پرزور بنانے کے لیے علامۂ شبلی کے نام کا حوالہ دے دینا گناہ کبیرہ یا کفر کی حد تک نہیں پہنچتا -

بلکہ میرا گمان تو یہ ہے کہ جو لوگ مولوی عبد السلام صاحب کو محض اس بنا پر گالیاں دے رہے ہیں وہ خود اس قسم کے گناہونکا ارتکاب بارہا کرچکے ہونگے، اور میرا دعوی ہے کہ غالباً آیندہ

بھی ضرور کرینگے - مثال کے لیے دہلی مسلم ڈیپوٹیشن کا واقعہ کافی ہے - میں سمجھتا ہوں کہ مختلف الخیال لوگوں کو شمول ڈیپوٹیشن کی ترغیب و تحریص میں جو پرائیوٹ خطوط لکھے گئے ہونگے یا زبانی گفتگو کی گئی ہوگی، اسمیں اس سے زیادہ دروغ مصلحت آمیز حرف پیش آیا ہوگا - اور یقیناً یہ ظاہر کیا گیا ہوگا کہ خود وایسراے کا منشا ہے کہ ایک ایسا ڈیپوٹیشن آئے، یا سر علی امام کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وایسراے کی یہ خواہش ہے - وقس علی ہذا -

اصل یہ ہے کہ ہم لوگ دوسروں کی اخلاقی کمزوریوں پر طعن کرنے میں بہت بے باک ہیں لیکن خود اسی قسم کی کمزوریوں میں مبتلا ہوجانے کیلیے بادنی تحریک آمادہ رہتے ہیں - مثلاً کیا یہ واقعہ حیرت انگیز نہیں ہے کہ نواب صاحب رامپور کے ڈیپوٹیشن کے متعلق جن جن باتوں پر سنگین سے سنگین اعتراض کیے جاتے تھے، بعینہ اسی قسم کی باتوں کی تائید میں اب جدید دہلی ڈیپوٹیشن کے ضمن میں قوی سے قوی دلائل پیش کیے جا رہے ہیں؟

اللہ تعالے مسلمانوں کو حق کی اعانت اور اسپر استقلال کی توفیق اور تلون سے احتراز کا حوصلہ عطا فرماے -

••

ماخذ: الہلال
۱۰ جمادی الآخر ۱۳۳۲ھ

نواب رائے

رہنمایانِ ہند

رہنمایانِ ہند کا تذکرہ کرتے ہوئے مجھکو وہ از منۂ قدیم یاد آتے ہین جنکی یادگار ین تاریخ نے نہین قائم کین ۔ اور وہ تخیّن سلف کے تاریک پردہ سے واقعات کو باہر لانیکی کوشش کرتی ہین ۔ اور کامیاب نہین ہوتین ۔ ایسے بزرگون کی تعداد ہمارے ملک مین بیشمار ہے ۔ کیونکہ ہر تمانے دراز سے ہمارے دیس کی خاک پاک سے اہل کمال پیدا ہوتے چلے آئے ہین اسلئے آج مین انہین سے چند ایسے ممتاز مہاتماؤن کے حالات بیان کرونگا جنھون نے وقت کے صفحہ پر اپنی مہرین ثبت کردی ہین ۔ سب سے پہلے مجھے اپنی قدیم کتابون کے متعلق چند باتین کہنا ہین ۔ ہماری کتابون مین صداقت کے دو معیار پائے جاتے ہین ۔ اوّل وہ جسے ازلی کہتے ہین اور جو زمان اور مکان کی قید سے آزاد ہے ۔ اور دوسرا اگرچہ ایسا اہم نہین ہے ۔ مگر خاص خاص حالتون ، ملکون اور زمانون مین ویسا ہی حکم رکھتا ہے ۔ قسم اوّل کی صداقتین روح اور پرماتما کی ماہیت ۔ اور آتما اور پرماتما کے درمیان تعلقات سے بحث کرتی ہین وہ شُرتیون مین درج ہین جنھین وید کہتے ہین ۔ قسم دویم کو سمرتی کہتے ہین ۔ جسکی تفصیل منو یاگ ولک اور دوسرے رشیون کی تصانیف مین پائی جاتی ہے ۔ حیاتِ انسانی کے مقاصد و انجام کے بنیادی اصول ویدون مین بیان کر دئے گئے ہین ۔

اور انکی تشریح و تفصیل سمرتیون اور پرانون کے لئے چھوڑ دی گئی ہے ۔ زندگی کے لئے عام اصول شرتیون مین کافی طور پر موجود ہین ۔ روحانیت کے متعلق ان سے زیادہ کوئی کیا کہہ سکتا ہے اور بیان کر سکتا ہے ۔ وہ تمام ہدایتین جو روح کو عرفان تک پہونچانے کے لئے لازم ہین شرتیون مین تکمیل کو پہونچا دی گئی ہین صرف تفصیلین باقی رہ گئی تھین ۔ اور یہ کمی وقتاً فوقتاً سمرتیون کے ذات سے پوری ہوتی رہتی ہے ۔ دوسری خصوصیت شرتیون کی یہ ہے کہ جن ارباب کمال نے اُسے جامۂ وجود پہنایا انکا کہین کہین ذکر نہین آتا ۔ انمین سے بیشتر مرد اور بعض عورتین بھی ہین ۔ مگر انکی ذاتیات ۔ انکی پیدائش اور سوانح پردۂ خفا مین مستور ہین لیکن انکے بہترین گوہر خیالات ۔ انکی بہترین تحقیقاتین سب ہمارے مقدس ویدون مین محفوظ ہین ۔ انکے برعکس سمرتیون مین شخصیتین زیادہ نمایان ہین ۔ بڑے بڑے اہل کمال جو اپنی طاقت سے دُنیا کو ہلا سکتے تھے ۔ اور قوانین فطرت کو بھی پلٹ دیتے تھے ۔ وہ پہلی بار ہماری نگاہون کے سامنے آتے ہین ۔ انکے ذاتی فضائل بعض اوقات انکی تلقینات پر بھی غالب آجاتے ہین ۔

ہمارے مذہب مین نرگن پرماتما اور سگن پرماتما کی یکسان تعلیم دی گئی ہے ۔ لیکن شرتیان جو ہمارے مذہب کی بنیاد ہین شخصیت سے پاک ہین یعنی وہ نرگن پرماتما کی تعلیم دیتی ہین ۔ دیوتا اور اوتار ۔ اور رشی ہمکو سمرتیون اور پرانون ہی مین نظر آتے ہین اور یہ بھی واضح رہے کہ سوا ہمارے مذہب کے دُنیا کے کل دیگر مذاہب اپنے بانی یا بانیون کی ذات اور شخصیت پر قائم ہین ۔ ۔ ۔

....

.... اسکا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان مذاہب مین انکے بانیون کے ذاتیات اور سوانحات کے متعلق تاریخی شہادتون پر خوب بحثین ہوتی ہین ۔ اگر کسی وقت یہ تاریخی شہادتین کمزور پڑ جائین تو ان مذاہب کی ساری عمارت معرض خطر مین آجائیگی ۔ ہم ان خطرون سے آزاد ہین ۔ ہمارا راستہ ان خندقون اور غارون سے پاک ہے ۔ کیونکہ ہمارا مذہب شخصون پر نہین بلکہ اصولون پر قائم ہے ۔ ہم اپنے مذہب کی پیروی اسلئے نہین کرتے کہ اسکا بانی کوئی رشی یا کوئی اوتار ہے ۔ سری کرشن ویدون کی سند نہین ہین ۔ بلکہ وید انکی سند ہین ۔ انکی عظمت صرف اسلئے ہے کہ وہ وید کی تعلیم دینے والے تمام رشیون مین سب سے زیادہ مقدم اور ممتاز ہین ۔ دوسرے اوتارون اور رشیون کا بھی یہی حال ہے ۔ ہمارا پہلا اصول یہ ہے کہ انسان کی تکمیل اور ترقی ۔ اور حصول نجات کے لئے جن ہدایات کی ضرورت ہے وہ سب ویدون مین موجود ہین ۔ اُن پر ایزاد یا اضافہ کرنا ہمارے امکان سے باہر ہے ۔ مذہبی تعلیم اپنے درجۂ انتہا کو پہونچ گئی جب ویدون نے مسئلۂ ذات توحید پر روشنی ڈالی ۔ اب صرف انسان کو وقتاً فوقتاً زمان و مکان حالات و اتفاقات کے مطابق رہنمائی کرنے کی ضرورت باقی رہگئی ۔ یہ بڑے بڑے صاحب کمال رشی اسی لئے مبعوث ہوئے کہ انسان کو قدیم راستہ سے منحرف نہ ہونے دین ۔ اور بھولے بھٹکون کو سیدھے راستے پر لگا دین ۔ اسی نکتہ کو سری کرشن بھگوان نے بھگوت گیتا مین بڑی صفائی سے بیان فرمایا ہے ۔

"جب نیکی کا زوال ہوتا ہے ۔ اور بدی غالب آجاتی ہے تو مین نیکی کی محافظت کے لئے اوتار لیتا ہون"

پس ایک طرف تو یہ ازلی اصول ہین ۔ جنکی بنیادین پہاڑون سے زیادہ مستحکم ہین ۔ اور جنہین کسی رشی کی خواہ وہ کیسا ہی کامل ہو ۔ یا کسی اوتار کی خواہ وہ کیسا ہی عظیم الشان ہو ۔ سہارے کی مطلق ضرورت نہین ۔ حتٰی کہ وہ دلیل اور مباحث کے قیود سے

بھی آزاد ہین۔ اسی بنیاد پر ہم دعویٰ کرتے ہین کہ صرف ویدانت ہی دُنیا کا عام مذہب ہو سکتا ہے۔ بلکہ اسوقت بھی اُسے یہ شرف حاصل ہے۔ کیونکہ وہ اصولون کی تعلیم دیتا ہے۔ دیگر شخصون کی کوئی مذہب جسکی جڑ شخصیت پر قائم ہو کُل اقوام دُنیا مین مقبول نہین ہو سکتا۔ تجربہ شاہد ہے کہ ایک ہی شہر کے باشندے وہان کے سربرآوردگان مین مختلف اشخاص سے عقیدت رکھتے ہین پھر کیونکر ممکن ہے کہ ایک ہی شخص یا ایک ہی پیغمبر کے ساتھ ساری دُنیا کو عقیدت ہو جائے۔ یہی نہین بلکہ اخلاق اور روحانیت اور معاشرت پر اسی ایک شخص کا قول سند سمجھا جاوے۔ ہمارے ویدانت مت کے لئے ایسے شخصی شہادت کی مطلق ضرورت نہین۔ اسکی سند انسان کی فطرت ہے۔ اور اُسکے اخلاقی اصول انسان کی روحانی حقیقت پر مبنی ہین۔

مگر اسکے ساتھ ہی زمانہ قدیم سے ہمارے رشیون پر یہ امر روشن تھا کہ بنی نوع انسان کے ایک معتدبہ حصہ کے لئے شخصیت کی ضرورت ہے۔ اُنکے لئے کسی نہ کسی صورت مین سگن پرماتما کا ہونا ضروری ہے۔ خود بدھ بھگوان کو جنہون نے سگن پرماتما کے وجود سے انکار کر دیا تھا اُنکے عقیدتمندون نے اُنکی وفات کے پچاس ہی برس بعد سگن ایشور مان لیا۔ اس سے واضح ہوا کہ دنیا مین سگن پرماتما کے بغیر کام نہین چل سکتا۔ مگر ایسے پرماتما کا نیا معیار قائم کرنا انسان کے دائرہ تخیل سے بہت ارفع ہے۔ ہان کبھی کبھی اسی دُنیا مین ایسی پاک روحین پیدا ہو جاتی ہین جنکی عظمت کو پہونچنا ہمارے خیالی معیارون کے لئے غیر ممکن ہے۔ یہ لوگ بمقابلہ کسی فرضی یا خیالی پرماتما کے جسے ہمارے تخیل نے بنایا ہو بدرجہا قابل پرستش ہوتے ہین۔ سری کرشن بھگوان پرماتما کے اس خیالی معیار سے کہین زیادہ بزرگ اور برتر ہین جو ہم یا آپ قائم کر سکتے ہین۔ بدھ بھگوان اُن بلندیون سے بدرجہا عالی اور برتر ہین جہان تک ہمارا طائر فکر پہونچ سکتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان بزرگون کے روبرو ساری دُنیا سر عقیدت خم کرتی ہے۔ ہمارے رشیون کو یہ خاصہ انسانی معلوم تھا۔ اور اسی سے انہون نے بھگوان پاک روحون کی پرستش کرنے کی پوری آزادی دیدی۔ کرشن بھگوان خود فرماتے ہین۔

"جب کبھی کسی آدمی مین غیر معمولی روحانی طاقت کا جلوہ دیکھو تو یقین کر لو کہ مین وہان موجود ہون۔ وہ طاقت میرے ہی وجود کا مظہر ہے۔"

اس لحاظ سے ہندو دُنیا کے سب اوتارون کی پرستش کرنے کے لئے آزاد ہین۔ ہندو دنیا کے ہر ایک نبی اور ہر ایک پیغمبر کی پرستش کر سکتا ہے۔ ہمارا مذہب عام ہے۔ وہ اسقدر جامع اور وسیع ہے کہ اسمین عظمت کے سبھی معیار شامل ہین۔ ویدانت کے سینہ بے پایان مین دنیا کے تمام موجودہ مذاہب کے لئے جگہ موجود ہے۔ اور آیندہ بھی جو مذاہب وجود پذیر ہونگے اُنہین بھی اپنا جزو بنانے کے لئے ویدانت تیار رہیگا۔

دُنیا کی ارواح عالیہ۔ یا پرماتما کے اوتارون کے متعلق یہ سب یہی خیال ہین۔ ان اوتارون کے علاوہ ویدون کے بزرگ بھی ہوتے آئے ہین۔ انہین رشی کہتے ہین۔ بھگود گیتا مین لفظ "رشی" بار بار ملتا ہے۔ اور آجکل یہ بہت ہی عام لفظ ہو گیا ہے۔ رشی کے معنی ہین خیالات کا جاننے والا۔ روشن ضمیر۔ عالم اسباب بجز روح اور پرماتما کے وجود۔ حیات ابدی۔ مقصد زندگی اور ایسے ہی دیگر مسائل کے متعلق کچھ نہین بتلا سکتا۔ وہ ہمیشہ حالت تغیر مین رہتا ہے۔ وہ محدود۔ اور اجزا مین منتشر ہے پس وہ غیر فانی۔ ازلی پرماتما سے کیونکر بحث کر سکتا ہے یہ امر ناممکن

ہے۔ ایسی حالت مین وہ ست گیان جس سے وید لبریز ہو رہے ہین کیونکر پیدا ہوا۔ جواب یہ ہے کہ رشیون کی برکت اور وسیلے سے۔ یہ گیان حواس ظاہر مین مضمر نہین ہے۔ بلکہ وجود انسانی کی علت غائی ہے۔ حواس ظاہر ہرگز انسان کا جوہر نہین۔ ہماری ہی زندگی مین جب ہماری آنکھون کے سامنے ہمارا کوئی عزیز اس جہان سے اٹھ جاتا ہے۔ یا جب ہمارے دل پر اور کوئی آفت نازل ہوتی ہے۔ تو ہمارے دلون پر ایک عالم سکون طاری ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی اور بھی موقع آتے ہین جبکہ ہمارا دل ایک لمحہ کے لئے اپنی حقیقت محسوس کرتا ہے۔ اور اُسے نور تجلی کی ایک جھلک سی نظر آجاتی ہے۔ رشی کا درجہ حاصل کرنے کے لئے انہین محسوسات کے تزکیہ اور تکمیل کی ضرورت ہے۔ ہندوون کو زمانہ قدیم سے معلوم تھا کہ روح حواس ظاہر یا ادراک کے احاطہ مین محدود نہین ادراک ہمارے وجود کے سلسلہ بے پایان کی ایک کڑی ہے ادراک ہماری ہستی کا ایک جزو ضعیف ہے۔ ارباب کمال میدان ادراک سے آگے بڑھنے کے لئے کمر ہمت باندھتے ہین۔ ادراک تو حواس ظاہر کے حلقہ مین گھرا ہوا ہے۔ انسان کو حقائق معرفت کا گیان حاصل کرنے کے لئے اس عالم ادراک۔ اس احاطہ حواس سے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ اور ہند مین آج بھی ایسے لوگ موجود ہین جو حواس کے گھیرے سے باہر نکلنے مین کامیاب ہو جاتے ہین۔ انہین کو رشی کہتے ہین۔ کیونکہ وہ روحانی حقائق کو نگاہ باطن سے دیکھتے ہین۔

ہندوستان کی خاک سے بڑے بڑے رشی اور مہاتما کے اوتار اٹھ چکے ہین جنمین بالخصوص دو اوتارون کی گھر گھر پرستش کی جاتی ہے۔ رام اور کرشن۔ رام جو صداقت اور اخلاق مجسم تھے۔ جو بیٹے۔ شوہر۔ باپ۔ اور فرمانروائے قوم کے اعلیٰ نمونہ اور بہترین مثال تھے۔ انکے گُن رشی والمیک نے گائے ہین۔ اس سے زیادہ پاکیزہ اور روشن۔ فصیح اور بلیغ کوئی انداز بیان نہین ہو سکتا جواس فخر شعرائے روزگار نے سری رام کے بھینٹ کیا ہے۔ اور مہارانی سیتا کا کن الفاظ مین ذکر کیا جائے۔ ساری دُنیا کی داستان ہائے پارینہ کا مطالعہ کر جاو۔ مگر تمہین دوسری سیتا ہرگز نہ ملیگی۔ اور مین تمہین یقین دلاتا ہون کہ آنیوالے زمانہ مین بھی شعرا کے دماغ اور قلم تمہارے سامنے کوئی ایسی مثال ہرگز نہ پیش کر سکینگے۔ سیتا یگانہ روزگار ہے۔ رام شاید کئی ہو گذرے ہین۔ مگر سیتا واحد ہے۔ اُسکا کوئی جواب نہین۔ ایک کامل ہندوستانی عورت مین جو اوصاف ہونے چاہئین وہ سب سیتا کی ذات مین مجتمع ہو گئے ہین۔ اور سارے بھارت ورش مین آج ہزارون برسون سے اس دیوی کی ہر مرد و زن اور بچہ پرستش کرتا چلا آتا ہے۔ یہ شاندار سیتا۔ یہ پاکیزگی سے بھی زیادہ پاک سیتا۔ یہ صبر اور حلم کی مورت ہمیشہ ہماری دیوی بنی رہیگی۔ وہ جسنے زندگی کی کڑی مصیبتین جھیلین۔ اور چہرہ پہ میل نہ آنے دیا۔ وہ عفت اور عصمت کی تصویر۔ وہ خلق اللہ کی دیوی۔ وہ دیوتاؤن کی ماتا۔ اسے ہم ابد تک اپنی قومی دیوی مانتے رہینگے۔ اُنکے کمالات سے ہم سب واقف ہین۔ اور اُنکے اعادہ کی یہان ضرورت نہین ہے۔ ہماری تمام پُرانی کتابین مٹ جائین۔ ہماری وید صفحہ ہستی سے معدوم ہو جائین۔ اور سنسکرت زبان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے۔ لیکن جبتک دنیا مین پانچ ذی روح بھی ہندوؤن کے نام لیوا باقی رہینگے اسوقت تک مہارانی سیتا کا نام برقرار رہیگا۔

اب ہم اُس مہاتما کا ذکر کرتے ہین جسکی اُپاسنا مختلف صورتون مین کیجاتی ہے۔ جو ہر مرد و زن اور برنا و پیر کا پیارا دیوتا ہے۔

میرا مطلب اس بزرگ سے ہے جسکی نسبت سری بیاس جی فرماتے ہین "دوسرے اوتارون مین پرماتما کے کچھ انش پائے جاتے ہین - مگر مہاراج سری کرشن شاکشات ایشور تھے" - اُنکے کمالات کی وسعت ہماری عقل کو حیرت مین ڈالدیتی ہے - وہ اعلیٰ درجہ کے سنیاسی - اور اسی کے ساتھ اپنے فرائض کے پابند گرہست بھی تھے - اُنکی ذات مین بے انتہا مادّی قوت کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز ترک اور استغنا کا اتصال ہوگیا تھا - اُنکے حالات کی حقیقت ہماری سمجھ مین نہین آسکتی تاوقتیکہ ہم بھگوت گیتا کے رموز و نکات کو بخوبی نہ سمجھ جائین - کیونکہ وہ اپنی ہی تلقینات کی شکل مجسم تھے - انھین اپنی ہدایات کا نمونہ مثال کہہ سکتے ہین - ترک کی اس سے اعلیٰ مثال نہین ملسکتی - کیسا غنی دل ہے - دوسرون کو تخت اور تاج بانٹتا پھرتا ہے - مگر خود اسکی مطلق ہوس نہین - وہ جسکے ابرو کے اشارے سے سلطنتین بنتی اور بگڑتی تھین خود وہی آزاد و بے لوث اور غریب کرشن ہین جو گوپیون سے پیار کیا کرتے تھے - غور کیجئے - اُنکی زندگی کا کیسا حیرت انگیز پہلو ہے - جہان ہم ضعیف انسانون کی سمجھ نہین پہونچ سکتی - اور جسے سمجھنے کی کوشش کرنا ہمارے لئے بالکل بیکار ہے جبتک کہ ہم کامل طور پر پاک اور صاف نہو جائین - وہ محیط کل محبت کی کتھا - اور وسیع پریم کی کہانی - وہ بندرابن کی گلیون اور لب جمنا کے کنجون اور سایہ دار درختون کے [illegible] ہماری سمجھ مین نہین آسکتے جبتک کہ ہم شراب محبت سے متوالے نہو جائین کون گوپیون کے ہجر و فرقت کے صدمہ کا اندازہ کرسکتا ہے - محبت اُنکی جان و ایمان تھی - وہ محبت جو کسی چیز کی محتاج نہین - وہ محبت جو بہشت کی بھی پروا نہین کرتی - وہ محبت جو کونین کی نعمتون سے مستغنی ہے - انھین اسکی مطلق پروا نہین کہ کرشن خالق کونین ہین - وہ صرف اتنا جانتی ہین کہ اُنکی ذات محبت بے پایان ہے - وہ کرشن کو بندرابن کے کھلاڑی کرشن کے سوا اور کچھ نہین سمجھتین - وہ کرشن جو راجون کے مہاراجہ - اور فوجون کے سردار تھے - وہ گوپیون کی نگاہ مین سدا گوالے ہی بنے رہے - یہ محبت کا اعلیٰ معیار - محبت صرف محبت کی غرض سے - کام صرف کام کی غرض سے - فرض صرف فرض کی غرض سے - پہلی بار ایشور کے سب سے بڑے اوتار مہاراج کرشن کی زبان سے سرزمین ہند مین پیدا ہوا - اور اُسے دُنیا کی تاریخ مذاہب مین ایک قابل یادگار واقعہ سمجھنا چاہئے - اس معیار نے خوف اور دھمکیون کے مذہب کا خاتمہ کردیا - کیسی عالمگیر - کیسی محیط کل محبت ہے - مین ابھی کہہ چکا ہون کہ گوپیون کی محبت کی تہ تک پہونچنا بہت مشکل ہے - اور ہم مین ایسے بیخبرون کی کمی نہین ہے جو اس حیرت انگیز داستان الفت کے معنی اور اسرار سمجھنے سے قاصر ہین - بلکہ ہم مین کچھ ایسی پلید روحین بھی ہین جو اسمین کچھ اور ہی معنی پیدا کر اپنی روحانی غلاظت کا ثبوت دیتی ہین - ان لوگون سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ پہلے اپنے نفس کو پاک کرو - اور یاد رکھو کہ جسنے یہ پریم کہانی لکھی ہے وہ بیاس رشی کا فرزند سکھ دیو ہے - جسکی ذات دنیا کی تحریصات سے پاک تھی - اور جسکے دل پر گناہ کا کبھی اثر نہین ہوا - جبتک کہ تمھارے دل مین غرض کی بو موجود ہے تم پرماتما سے لو نہین لگا سکتے - غرضمندانہ عبادت توہین دین ہے - جبتک ہمارے دل مین غرضمندانہ خیالات بھرے ہون کیونکر ممکن ہے کہ ہم گوپیون کی دیوانگی اور مدہوشی کے معنی سمجھ سکین - پیارو! پہلے مال و زر - نام و نمود اور دنیا کا خیال دل سے نکال ڈالو تب گوپیون کا عشق تمھارے سمجھ مین آئیگا - وہ عشق اسقدر لطیف تھا کہ تم بغیر دنیا سے دل ہٹائے اسکا لطف نہین اٹھا سکتے

اور ایسا پاکیزہ کر جبتک، آئینۂ دل پاک ہو جائے خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ یعنی ہے کہ وہ لوگ جنکے دل حرص اور ہوس کے تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں گوپیوں کے پریم کو سمجھیں اور انہیں بھی پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی پریم کرشن کے اوتار کا زیور اور سنگار ہے اس مدہوشی کے مقابلہ میں گیتا کی تلقینات بھی نہیں ٹھہرتیں گیتا میں جگیاسو کو منزل مقصود تک پہونچنے کا راستہ بتلایا گیا ہے۔ لیکن وہ مدہوشی۔ وہ محبت کی دیوانگی۔ جہاں گرو اور شیشل۔ عالم اور علم سب ایک ہو جاتے ہیں۔ بجائے خود منزل مقصود ہے۔ جہاں عذاب و ثواب۔ نیک و بد کسی کا وجود نہیں باقی رہتا۔ سب حس و خیال مٹ جاتا ہے اور صرف بیخبری باقی رہجاتی ہے۔ جب عاشق پریم مستی۔ اور خود فراموشی کی کیفیت آجاتی ہے تب اُسے ہر چہار طرف کرشن ہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اسکی صورت کرشن سے مل جاتی ہے۔ اور اُسکی آتما کرشن کے رنگ میں رنگ جاتی ہے۔ یہ مہاتما کرشن کی عظمت ہے۔ ذرا ذرا سی باتوں پر تضیع اوقات مت کرو۔ بلکہ زندگی کے اصول اور اُسکے جوہر باطنی پر نگاہ رکھو۔

ممکن ہے کہ کرشن کے حالات میں بکثرت سی باتیں قرین قیاس نہ معلوم ہوں۔ اور شاید تاریخی شبہات بھی کہیں کہیں پیدا ہوں۔ مگر مذہب اور زندگی کے اس نئے معیار کی کوئی نہ کوئی بنیاد ضرور ہو گی۔ کسی دوسرے پیغمبر یا نبی کی زندگی کا مطالعہ کیجئے۔ وہ اپنے زمانہ کے خیالات و تمدن کا مظہر نظر آتا ہے۔ اور اُنہیں خیالات کی اشاعت کرتا ہے جو اسکے ملک میں اُس وقت عوام کے دلوں میں پیدا ہونے لگے تھے۔ حتیٰ کہ اس نبی یا پیغمبر کے وجود پر بھی شک کرنیوالے لوگ نکل آتے ہیں۔ لیکن کون ایسا شخص ہے جو انکار کر سکے کہ زندگی اور مذہب کا یہ رفیع معیار

یعنی کام کام کی غرض سے۔ محبت محبت کی غرض سے۔ فرض فرض کی غرض سے۔ کرشن کی ذات پاک سے وجود میں نہیں آئے۔ انکا موجد ضرور کوئی نہ کوئی ہو گا۔ کرشن کے زمانۂ طفولیت تک یہ معیار زندگی صفحۂ دنیا پر معدوم تھا۔ مہاراج کرشن نے پہلی بار انکی تلقین کی۔ اور انکے شاگرد بیاس رشی نے ان خیالات کو دنیا پر روشن کر دیا۔ بندرابن کے گوال منس والے کرشن گوپیوں کے ساتھ پھرنیوالے کرشن اس اوتار کی روح ہیں جب وہ بیخودی ہم پر طاری ہو جائیگی۔ جب ہم مبارک گوپیوں کے راز الفت سمجھ جائینگے۔ تب محبت کی حقیقت ہم پر روشن ہو گی۔ جب تمہاری نظروں میں ساری دنیا مٹ جائیگی۔ جب تمہارا باطن صاف اور بے غرض ہو جائیگا۔ حتیٰ کہ تمکو تلاش حقیقت کی بھی خبر نہ رہیگی تب اور تب ہی تم پر اس محبت کی دیوانگی کا غلبہ ہو گا۔

اب اس سے کمتر درجہ کے گیتا والے کرشن کو لیجئے۔ ہم میں سے اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کرشن کا گوپیوں کے عشق میں سرشار ہونا کسیقدر معیوب سا معلوم ہوتا ہے۔ اور علماء یورپ اسے پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے۔ ڈاکٹر فلاں اور فلاں نے اسپر اعتراض کیا ہے۔ اسلئے گوپیوں کا ذکر نہ کیجئے۔ بغیر یورپین علما کی سند کے ہم اس واقعہ کو کیونکر صحیح تسلیم کر سکتے ہیں۔ مہابھارت میں بجز دو ایک موقعوں کے گوپیوں کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ اور وہ بھی واضح طور پر نہیں۔ دروپدی کی پرارتھنا میں چند الفاظ میں بندرابن کا ذکر آگیا ہے۔ اور سسپال کی تقریر میں بھی ایک جگہہ بندرابن کا نام ملتا ہے۔ مگر یقیناً یہ سب حریفوں کی کارستانیاں ہیں۔ جو فضلاء یورپ نہیں مانتے۔ اسکی قطع و برید کر دینا چاہئے۔ حیف ہے کہ یہ لوگ جو ہیوپلہ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جنکا معیار مذہب بھی

تجارت کے اثر سے محفوظ نہیں ہے۔ جو اس دنیا میں نیک کام کرکے بہشت میں جائینگی آسنو رکھتے ہین وہ گویون کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کرتے ہین۔

اس بحث مکمل کرشن سے قطع نظر کرکے ہم گیتا کے مصنف کرشن کیطرف متوجہ ہوتے ہین۔ اس حیثیت مین بھی وہ ذات عالی انتہاے کمال پر پہونچی ہوئی ہے۔ گیتا سے بہتر اسرار حقیقت کی تصنیف نہین کی گئی۔ اور نہ کیجا سکتی ہے۔ مگر شرتیون اور اپنشدون کے مفسر اس کثرت سے گذرے ہین کہ پردہ ابر مین ماہتاب تک نگاہ کا پہونچنا غیر ممکن سا ہوگیا ہے۔ ہر مفسر اپنے ہی خیالات کے موافق تفسیر کرتا ہے۔ ایسی حالت مین وہ ذات برحق جبکے شرتیون کا وجود ہوا شرو گیتا کے معلم کی حیثیت سے دنیا مین جنم لیتا ہے۔ اور اصلی معنی پھر روشن کرتا ہے۔ تعجب ہے کہ زمانہ مابعد کے مفسر بھی گیتا کی تشریح کرکے اکثر اسکے مفہوم اور موضوع تک نہین پہونچ سکتے۔ گیتا مین کچھ اور لکھا ہے۔ اور یہ زمانہ حال کے ٹیکا کار کچھ اور کہتے ہین۔ ایک "ادویت" مت کا پیرو کسی اپنشد کی تشریح کرنے بیٹھتا ہے۔ اور اُسے جتنے اشلوک "دویت" خیال کے ملتے ہین۔ ان سبھون کو توڑ مروڑ کر اپنے ہی خیال کے موافق معنی نکال لیتا ہے۔ علیٰ ہذا "دویت" عقیدہ کا عالم ادویت خیال کے اشلوکون کو کھینچ کر کے اپنے رنگ مین ڈھال لیتا ہے۔ مگر گیتا مین سارے نکتے آئینے کی طرح روشن کر دئے گئے ہین۔ اور اُسکا لب لباب چند الفاظ مین یہ ہے کہ روح انسانی بتدریج قدم بہ قدم کثیف سے لطیف۔ اور لطیف سے لطیف تر مدارج پر پہونچتی ہوئی بالآخر ذات مطلق مین وصل ہوجاتی ہے۔ کرم کانڈ سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اور ثابت کیا گیا ہے کہ بلا خلوص قلب کے وہ ویدک رسوم محض لا حاصل ہین۔ پاخت۔

نہین ہوسکتا۔ مورتی پوجن۔ اور مراسم دینی جائز تسلیم کئے گئے ہین مگر صفائی قلب درکار ہے۔ عبادت اُسی حالت مین وسیلہ نجات ہوسکتی ہے جبکہ باطن صداقت سے معمور۔ اور دل کثافت سے دور ہو۔ عبادت کے مختلف طریقے مختلف اُپاسنا مین بھی ضرورۃً پیدا ہوئے ورنہ اُنکا وجود ہی نہوتا۔ ہماری نئی روشنی کے اکثر نوجوان خیال کرتے ہین کہ یہ مختلف فرقے اور مذاہب خود غرضون اور مکارون نے دنیا کمانے کے لئے بنا رکھے ہین۔ انکا یہ خیال مادی نظر مین کیسا ہی صحیح نظر آتا ہو مگر واقعیت کے برعکس ہے۔ فرقے اور مذاہب کی ابتدا یون نہین ہوئی۔ وہ سب روح انسانی کے رجحانات کے نتیجے ہین۔ وہ سب دنیا کے مختلف طبائع کی تسکین و تشفی کرنیوالے ہین۔ اور تمہین ان مین عیب ڈھونڈھنے کی ہرگز کوشش نہ کرنی چاہئے۔ جس دن اُنکی ضرورت باقی نرہیگی وہ خود بخود صفحۂ ہستی سے مٹ جائینگے۔ مگر جبتک اُنکی ضرورت رہیگی وہ ضرور قائم رہینگے۔ خواہ تم اُنکی کتنی ہی مخالفت کرو۔ اور کتنے ہی عیوب نکالو۔ تو پین اور بندوقین گنڈے آگ برسائین۔ تلوارون سے خون کی ندیان بہین۔ مگر جب تک ان مورتیون اور فرقون کی ضرورت موجود رہیگی انہین کوئی مٹا نہین سکتا۔ اور بھگوان سری کرشن نے صاف صاف فرمایا ہے کہ انکا قائم رہنا برحق اور لازم ہے۔

اب تاریخ ہند کا ایک افسوسناک زمانہ آتا ہے۔ فرقون کے عناد و فساد اور شور و شر کی آوازین گیتا ہی مین آنے لگی تھین۔ مہاراج کرشن کی وفات سے پہلے ہی عنصر فساد نے پھر زور پکڑ لیا تھا۔ اور اُنکی ملک پر جو طوفان آیا وہ مذہب کی بنیاد پر نہ تھا۔ بلکہ ذات پانت کی تفریق پر۔ برہمن اور چھتری

جو ہندوستان کے دور کن ہنگم مین اپنے اپنے احاطے سے قدم باہر رکھنے
لگے۔ اور نتیجہ وہی ہوا جو ایسی حالتون مین اکثر ہوا کرتا ہے۔
تقریباً ایک ہزار برس کے طوفان اور سیلاب کے بعد ایک اور
بڑے مہاتما کا جنم ہوتا ہے۔ اور یہ گوتم شاکیہ مُنی ہین۔ آپ لوگ
انکی تعلیم اور تلقین سے واقف ہین۔ ہم انکو ایشور کا اوتار
مانتے ہین۔ حُسن اخلاق اور رحم کا جیسا اعلیٰ معیار اُنھون نے
قائم کیا وہ بردہ دنیا پر اور کہین نظر نہین آ سکتا۔ وہ زبردست
کرم یوگی تھے۔ گویا خود مہاراج سری کرشن اپنے اصولون پر عمل
کرنے کے لئے اپنے ہی شاگرد بنکر دنیا مین آئے۔ ایک بار پھر
وہی پُر زور۔ الوہیت سے لبریز آواز سُنائی دی جسنے گیتا مین
کہا تھا "عورتین۔ اور ویش اور شودر سب اپنے اپنے کرمون
کے مطابق نجات حاصل کرتے ہین" گویا گیتا کی تلقینات کی زندہ
مثال پیش کرنے کے لئے۔ گویا اُسے عملی صورت مین لانے
کے لئے۔ گرو نے نیا سروپ دھارن کیا۔ اور یہ شاکیہ مُنی تھے۔
جنکا مقصد پامال قومون کو سُدھارنا تھا۔ جنھون نے دیوتاؤن
کی زبان کو خیرباد کہدیا۔ تاکہ عوام کی زبان مین تعلیم دیکر اُنکے
دلون تک پہونچ سکین۔ جنھون نے درویشون اور بیواؤن
کے لئے شاہی تخت اور تاج کو ترک کر دیا۔ اور جو سری رامچندر
کیطرح شودرون کو بھی چھاتی سے لگاتے تھے۔ آپ لوگ انکے
عظیم الشان کام اور اُنکے اوصاف بالذات سے بخوبی واقف
ہین۔ لیکن اُنکے مشن مین ایک نقص تھا۔ جسکا خمیازہ ہم ابتک
اٹھا رہے ہین۔ وہ ذات بابرکات اس نقص کے لئے جوابدہ
نہین کہی جا سکتی۔ مگر بدقسمتی سے وہ غیر مہذب اور نیم وحشی قومین
جو آریون کے حلقہ اثر مین آ گئی تھین مذہب کے ایسے اعلیٰ معیار
پر عمل نہ کر سکین۔ یہ قومین جنکے توہمات اور عبادت کے طریقے
جُدا جُدا تھے آریون کے حلقہ مین آ کر ملگئین۔ اور کچھ دنون تک ایسا
معلوم ہوا کہ اُنکی خو بو تبدیل ہو گئی ہے۔ مگر ایک صدی بھی نہ
گذرنے پائی تھی کہ اُنھون نے وہ بھوت اور پریت اور سانپ
بچھو اور لکڑی پتھر پوجنے شروع کئے جو اُنکے بزرگ پوجتے چلے
آتے تھے۔ اور اسطرح سارا ہندوستان توہمات اور بطلان کے
ایک سیلاب مین غرق ہو گیا۔ ابتداً بودھون نے جیو رکشا
کے جوش مین ہَون کی بھی ممانعت کر دی تھی۔ اُسوقت تک گھر
گھر بخورات جلائے جاتے تھے۔ اگن کنڈ مین آگ جلتی رہتی تھی۔
اور اسکے سوا پرستش کے اور لوازمات رائج نہ تھے۔ مگر بودھون
نے یہ رواج مٹا کر اُنکی جگہ عالیشان مندر۔ اور نمائشی طریق
عبادت۔ اور زاہدانہ طمطراق۔ اور عالی شان خانقاہون کا
رسم پھیلایا۔ جنکے بچے کھچے اثرات اب بھی موجود ہین۔ جب مین
آجکل کے مصنفین کو جنھین زیادہ تحقیق سے کام لینا چاہئے تھا یہ
لکھتے ہوئے پاتا ہون کہ بودھون نے برہمنون کی بُت پرستی کا خاتمہ
کر دیا تو مجھے ہنسی سی آتی ہے۔ انھین اسکی مطلق خبر نہین کہ بودھ
مت ہی نے ہندوستان مین بُت پرستی کی بنیاد ڈالی جگن ناتھ
کا مندر بودھون کا ایک پرانا مندر ہے۔ جسنے اسپر اور اسکے
ساتھ اور بھی کتنے ہی مندرون پر دوبارہ ہندوین کی قلعی کی
گئی۔ باوجود اہنسا کی تعلیم کے۔ باوجود رفیع اخلاقی معیار
کے۔ باوجود اُن موشگافیون کے جو پرماتما کے ہستی یا نا ہستی
ہونے کے متعلق ہوتی رہتی تھی۔ بودھ مت کی عالیشان عمارت
منہدم ہو گئی۔ اور اُسکے در و دیوار شکستہ کی جیسی مٹی پلید ہوئی
اُسکا ذکر فضول ہے۔ انتہا درجہ کا کراہیت آمیز طریق پرستش۔
انتہا درجہ کی فحش کتابین۔ اور مذہب کے پردے مین انتہا درجہ
کی ذلیل حرکتین۔ یہ سب بودھ مت کے زوال کے تبرکات ہین۔

لیکن بھارت ورش کو دُنیا میں ابد تک قائم رہنا تھا۔ ایشور نے پھر اوتار لیا۔ وہ جسنے فرمایا تھا کہ "جب کبھی نیکی کو زوال ہوتا ہے تو میں دُنیا میں آتا ہون"۔ پھر آیا۔ اب کی بار یہ شرف جنوبی ہند کو حاصل ہوا۔ وہ نوجوان برہمن جسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ سولہوین سال میں اُسکی تمام اعجاز نما تصنیفیں مکمل ہوگئی تھیں جنوبی اُفق سے آفتاب درخشان بنکر نکلا۔ یہ تصنیفات آجتک عماب رونگار ہیں۔ سری شنکر اچارج کا معیار یہ تھا کہ ہندوستان کو اس اخلاقی رتبہ پر پہونچائیں جہان وہ ابتداءً قرنیش میں تھا۔ خیال کیجئے کیسی نظر وسیع اور ہمت بلند تھی۔ مین نے اُسوقت کی حالت کا چند لفظوں مین ذکر کیا ہے۔ یہ تمام نقائص تمدن اور معاشرت جنہیں آج ہم اور آپ دائرۂ اصلاح میں لانا چاہتے ہیں اسی اخلاقی ادبار کے زمانہ کے آثار ہیں۔ بلوچی۔ تاتاری اور دُنیا کی دوسری قومیں ہندوستان میں آئیں اور بودھ مذہب میں داخل ہوکر ہمارے ساتھ رہنے سہنے لگیں۔ اُنکے مراسم اور معاشرت کا اثر ہمارے طرز تمدن پر اس حد تک پڑا کہ ہماری قومی زندگی مکروہ ترین حرکات وخیالات کا ایک صفحۂ ظلم بنگئی۔ قوم کی یہ حالت گویا نوجوان شنکر کو دھوکون سے ترکہ میں ملی۔ اور ویدانت آج تک اسی زمانہ کے بوئے ہوئے کانٹے کاٹ رہا ہے۔ شنکر نے اپنے زبردست فلسفہ کے زور سے ثابت کر دکھایا کہ ویدانت اور بودھ مت کی حقیقتوں میں بہت زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ لیکن شاگردوں نے اُستاد کا مطلب نہ سمجھا۔ اور آتما و پرماتما کے وجود سے منکر ہوگئے یہ تھا سری شنکر کی تعلیم کا ماحصل۔ اور بودھ لوگ اپنے پرانے مت میں پھر آنے لگے۔

تب سری رامانج نے جنم لیا۔ شاید سری شنکر باوجود بیشتر فلاحی قوتون کے ایسی وسیع نگاہ نہ رکھتے تھے۔ رامانج کا دل زیادہ فراخ تھا۔ نیچ ذاتون کے درد سے اُنکا سینہ لبریز تھا۔ انہون نے طریق عبادت کے اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ اور مشہور زوائد کو منسوخ کرکے اُنکے بجائے نئے نئے مراسم جاری کئے۔ کیونکہ قوم کا بڑا حصہ بلا ظاہری مراسم کے نہ رہ سکتا تھا۔ اسکے ساتھ ہی اُنہون نے روحانی عبادت کا دروازہ برہمن سے لیکر شودر تک سب کیلئے یکسان طور پر کھولدیا۔ یہ تھا سری رامانج کا مشن۔ اور اس مشن کا دائرہ وسیع ہوتے ہوتے شمال تک جا پہونچا۔ وہان کے چند بزرگون نے اُسکی اعانت کی۔ اور رامانج کے زمانہ سے روحانیت کے سعید کو مرجع خاص وعام بنانے کی مسلسل کوششیں ہوتی آئی ہین۔ جتنے اولیا اور رشی سری رامانج کے بعد آئے اُن سبھون نے یہی وتیرہ اختیار کیا۔ میری سمجھ مین نہین آتا کہ شنکر پر کیون نیچ ذاتون کو علیحدہ رکھنے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ مجھے اُنکی تمام تصانیف مین اس الزام کی تائید نہین ملی۔ غالباً اسکا سبب یہ ہے کہ بدھ بھگوان کے پیروؤن کی طرح سری شنکر کے معتقدون نے بھی اُنکا مطلب نہ سمجھا۔

اب مین شمالی ہندوستان کے اس مقدس راہب سنّیاسی کا تذکرہ کرکے تقریر کا خاتمہ کرتا ہون جو سری رامانج کے پیرو دعاوی تھے۔ وہ خوروزات کے برہمن تھے۔ علما کے گھرانے مین پیدا ہوئے۔ اور منطقی مباحث مین اپنا وقت صرف کرنے لگے یہی اُنکی زندگی کا شعار تھا۔ مگر یکایک کسی رشی کی دعا نے اُنکی زندگی کی رفتار پلٹ دی۔ اُنہون نے منطقی مباحث سے کنارہ کیا۔ اور بھگتی کے اعلیٰ درجہ کے گرو بنگئے۔ اُنہین لوگ دیوانہ چیتن کہا کرتے تھے۔ وہ گوپیون کی دیوانگی کے عاشق تھے۔ اُنکی بھگتی کی لہر بنگال مین شرق سے غرب تک پھیل گئی۔ اُن کا جذبہ محبت وسیع تھا۔ اُسکی کوئی انتہا نہ تھی۔ نیک اور بد ہندو و

مسلمان - اونچ اور نیچ بھی اُنکی محبت اور ہمدردی مین شریک تھے۔ ورنہ بھی اگرچہ انکا ست دُنیا کی ہر شے کیطرح ابتری کی حالت مین آگیا ہے - تاہم ابھی تک کتنے ہی بے ذات ہندو قوم کے مظلوم آدمی اُنکے نام لیوا باقی ہین۔

سری شنکراچارج کا دماغ وسیع تھا اور سری رامانج کا دل۔ مگر اب ایک ایسے رشی کے جنم لینا کا وقت آگیا جسکا دل و دماغ دونون وسیع ہو۔ جو ایک ہی قالب مین شنکر کا دماغ اور چیتن کا غیر محدود دل رکھتا ہو۔ جو ہر ایک فرقہ مین ایک ہی پرماتما کی قدرت کا جلوہ دیکھے۔ جسکی آنکھین غربا اور مساکین مظلوم اور خستہ حال آدمیون کی حالت پر آنسو بہاتین۔ جسے ہر فرد بشر خواہ ہندوستانی ہو یا غیر ہندوستانی یکسان ہمدردی ہو۔ اور جسکی جبین عالی ایسے بلند خیالات کا منبع ہو جو تمام متضاد فرقون اور ذاتون کو صلح اور محبت کے رشتہ مین منسلک کرے۔ اور ایک ایسا مذہب وجود مین لائے جو دل و دماغ دونون کیلئے باعث تقویت ہو۔ وہ نفس عالی ہندوستان کی خاک پاک سے اُٹھا - اور مجھے اُسکی صحبت سے فیض اُٹھانیکا عرصہ تک شرف حاصل رہا۔ اُسکی زندگی کا کام ایک ایسی سرزمین مین شروع ہوا جو مغربی روش پر فریفتہ ہو رہی تھی۔ جہان کا ہر شخص مغربی خیالات کے پیچھے دیوانہ بنا ہوا تھا۔ جنپر ہندوستان کے دوسرے شہرون کے مقابلہ مین یوروپ کا جادو زیادہ اثر کر گیا تھا۔ یہ مرد کامل اُمّی محض تھا۔ اُسے اپنا نام لکھنے کی بھی قابلیت نہتی مگر یونیورسٹی کے بڑے بڑے علما اور پروفیسر اُسکی وسعت معلومات پر متحیر ہو جاتے تھے - وہ عجیب و غریب آدمی تھے۔ اُنکے سوانح زندگی بہت طول ہین - اور مجھے آج اتنی فرصت نہین کہ اُنکا ذکر کرون۔ سری رام کرشن کا نام آج آفتاب کیطرح چمک رہا ہے۔ اور غور کیجئے کہ کتنی زبردست روحانی طاقت اُنکے ذریعہ سے اپنا کرشمہ دکھا رہی ہے۔ ایک مفلس پوجاری کا لڑکا جو ایک آبادی سے دُور کے گانوان مین پیدا ہوا آج یوروپ اور امریکہ مین ہزارون آدمیون کا معبود بنا ہوا ہے۔ اور کل لاکھون اُسکے نام پر عقیدت سے سر جھکاینگے۔ اگر وقت آیا اور موقع ملا تو مین اپنے مرشد کا تذکرہ آپ لوگون سے زیادہ تفصیل کے ساتھ کرونگا۔ اسوقت صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ اگر میری زبان سے ایک لفظ بھی صداقت کا نکلا ہے تو اُسی ذات پاک کی فیضانِ صحبت کا اثر ہے۔

(ترجمہ از سوامی ویویکانند)

ہندو فنِ حکمت

(ماخوذ از "ہندو سوپیریارٹی" مصنفہ پنڈت ہربلاس سارڈا)

ہندو قوم نے دیگر علوم مثل ہیأت، ریاضی اور صرف و نحو کی طرح فنِ طبابت کو بھی درجۂ کمال تک پہنچا دیا تھا۔ اُن میں قوتِ مشاہدہ بہت زبردست تھی، استقلال، ریاضت شاقہ اور غور و خوض میں وہ بے عدیل تھے۔ اِن قابلیتوں نے ہندوستان جیسے مُلک میں جہاں انواع و اقسام کی جڑی بوٹیاں کثرت سے پیدا ہوتی ہیں اُنھیں علمِ حکمت کی تحقیق و تدقیق اور نشو و نما میں ایک خاص حیثیت دے رکھی تھی۔ مگر سنسکرت لٹریچر کے ایک بڑے حصہ کے تلف ہو جانے کے باعث ہندوؤں کے فنی کمال کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ فلسفہ اور ادب میں اب تک زمانہ قدیم کی تصانیف موجود ہیں۔ مگر فنِ حکمت چونکہ علمی سائنس ہے اور مختلف اسباب نے عرصہ دراز سے اسے گمنامی میں پڑا رہنے دیا اس لئے اس فن کی بے شمار تصانیف زائل ہو گئیں۔ تاہم جو چند کتب اب تک موجود ہیں وہ بھی اُس ترقی کا پتہ دیتی ہیں جس سے زمانۂ حال کی ترقیاں سبقت لے جانے کا دعویٰ نہیں کر سکتیں۔ انکے مطالعہ سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ دیگر علوم کی طرح یہ علم بھی ہندو کے دماغ سے پیدا ہوا۔ اور دنیا کی دیگر قومیں اس لحاظ سے بھی ہماری ممنونِ منت ہیں۔

لارڈ ایمپتھل نے جو چند سال گزرے صوبہ مدراس کے گورنر تھے اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا:-

اب ہم پر یہ حقیقت کھلنے لگی ہے کہ ہندو شاستروں میں بھی قوانینِ صحت موجود ہیں۔ جو زمانۂ حال کے قوانین کی طرح پختہ اصولوں پر مبنی ہیں اور ہندو قوم کا شیرازہ بندا مو احفظانِ صحت کے اصول و قواعد کا بہت بڑا عالم تھا۔

پروفیسر ولسن فرماتے ہیں۔

زمانہ قدیم کے ہندوؤں نے علم حکمت اور جراحی میں بہت دستگاہ حاصل کی تھی۔ اور یہ ایک قدرتی بات تھی۔ کیونکہ انکی طبعی فراست و ذکاوت اور صبر آمیز محویت نے ان کی قوت مشاہدہ کو بہت تیز کر دیا تھا۔ اور اُن کے ملک کی وسعت اور زرخیزی نے انکے مطالعہ اور تحقیقات کے لئے گوناگوں اسباب مہیا کر دیئے تھے۔ وہ تشخیص امراض اور علامات کی تمیز بہت صحت کے ساتھ کرتے تھے۔ اور ان کا طبی سلسلۂ علم بہت وسیع تھا۔

ہندوستان کا مشہور انگریز مورخ سر ولیم ہنٹر لکھتا ہے۔

ہنود نے فن حکمت کی پوری وسعت کا احاطہ کر لیا تھا۔ انکی قدیم تصانیف میں اجسام کی ترکیب اعضا، اعصاب، رگ و ریشے، اور شرائین کا تحقیق کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔

ہندو ادویات میں بیشمار اجزا شامل ہیں جو مو الید ثلاثہ کے ہر ایک رکن سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اور جنمیں سے اکثر ادویات اب یورپین اطبا بھی استعمال کرنے لگے ہیں۔ اُن تصانیف میں مرکبات تیار کرنے کے بہت جدت آمیز طریقے بتلائے گئے ہیں اور خوراک اور مقدار کے متعلق جامع ہدایتیں کی گئی ہیں۔

دھنونتری ہندوؤں کے فن طبابت کا آفتاب تھا۔ اُس نے اپنے شاگرد سشرت کو اس فن کی تعلیم دی۔ چرک کہتا ہے کہ مجھے اگنویس رشی نے یہ فن سکھایا۔ سشرت اور چرک یہ دونوں ہندو حکمت کی زندہ جاوید تصانیف ہیں جو اپنے مصنفین کے نام سے مشہور ہیں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں نے ممکن ہے فن ادویہ میں دسترس بہم پہنچایا ہو۔ مگر فنِ جراحی یورپین ڈاکٹروں کا حصہ ہے مگر ذیل کے اقتباسات سے واضح ہو جائے گا کہ جراحی اور تشریح بدنی میں بھی ہندوؤں نے وہ قدرت حاصل کی تھی جو موجودہ فنِ جراحی کے لئے حقارت نہیں بلکہ رشک کا باعث ہے۔

مسٹر ویبر رقمطراز ہیں۔

فنِ جراحی میں بھی ہندوؤں نے مہارت تامہ حاصل کر لی تھی۔ اس صیغہ میں یورپین جراح اور ڈاکٹر اس زمانہ میں بھی اُنسے کچھ استفادہ کر سکتے ہیں۔ اور فی الواقع انہوں نے ناک اور کان بنانے کا ڈھنگ ہندوؤں ہی سے سیکھا ہے۔

مشہور انگریزی مورخ الفنسٹن لکھتا ہے:۔

ہندوؤں کا فن جراحی اتنا ہی مکمل ہے جتنا کہ اُن کا فن طب۔

مسز میننگ جو سنسکرت لٹریچر سے کامل واقفیت رکھتی ہیں فرماتی ہیں "ہندوؤں کے آلات جراحی بہت تیز اور باریک ہوتے تھے۔ حتےٰ کہ وہ بال کو طولاً چیر سکتے تھے!"

ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر فرماتے ہیں:۔

ہندو فنِ جراحی میں حسن عمل اور جدت دونوں باتیں موجود تھیں۔ وہ بلا خون ضائع کئے ہوئے اعضا کی قطع برید کر سکتے تھے۔ معدہ اور نرم معدہ میں نشتر لگا سکتے تھے۔ بواسیر کو دور کر سکتے تھے۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑ سکتے تھے اور جسم سے خارجی مادّات کو نکالنے میں ہوشیار تھے۔ جراحی کا ایک خاص صیغہ ناک اور کان کے لئے وقف تھا۔ وہ بدنما جتنے کان اور ناک کی اصلاح کرتے تھے اور بسا اوقات نئی ناک اور نئے کان

بنا دیتے تھے جو یورپین جراحوں نے اب ان سے سیکھا ہے۔ خشیفہ کا علاج آجکل ابرو کے اوپر کی پانچویں رگ کو کاٹ کر کیا جاتا ہے۔ قدیم ہندوؤں نے بھی اس ترکیب کا ذکر کیا ہے۔ وہ جراحی کے آلات بنانے میں بہت صفائی سے کام لیتے تھے۔ اور طلبا کو جراحی کا عملی تجربہ کرانے کے لئے موم کو میز پر پھیلا کر یا نباتات کے ریشے یا مردہ جانوروں کے جسم سے کام لیا جاتا تھا۔ ہندو جراح فن دایہ گری کے اُستاد تھے۔ اور نہایت پیچیدہ اور نازک عملیات کو سرانجام دیتے تھے۔ جانوروں کے علاج میں انھوں نے بڑی ترقی حاصل کی تھی۔ ہاتھی گھوڑے وغیرہ جانوروں کے علاج کے متعلق ابتک تصانیف موجود ہیں

مارڈ ایبیتھل فرماتے ہیں۔

یہ شاید عام طور پر معلوم نہیں ہے کہ علم طبابت نے ہندوستان ہی میں جنم لیا۔ بیشک یہ فخر ہندوستان کو حاصل ہے۔ یہ علم اول یہاں سے عرب پہنچا۔ اور عرب سے یورپ میں داخل ہوا۔ سترھویں صدی کے آخر تک یورپین اطبا اس فن کو عرب کے طبی تصانیف سے حاصل کرتے تھے۔ مگر عرب کے حکمانے ہزاروں برس پہلے یہ فن ہندوستان کے مشہور حکما مثلاً دھنونتری، چرک اور سشرت کے تصانیف سے حاصل کیا تھا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ دنیا کی ترقی کا محور مشرق سے مغرب کی سمت چلا۔ اور ایسا غائب ہوا کہ مشرق میں اپنے وجود سابقہ کے نشانات تک نہ باقی رکھے۔

سر ولیم ہنٹر لکھتے ہیں۔

عربی فنِ علاج سنسکرت تصانیف کے تراجم پر قائم کیا گیا ہے جو خلفاء بغداد کے زمانہ میں کئے گئے۔ یورپ کے حکما سترھویں صدی کے آخر تک عربی حکمت کے دست نگر رہے۔ اور ابو سینا اور ابو سرابی کے تصانیف میں چرک کا نام بار بار واقع ہوتا ہے

ممکن ہے اشتباہ پیدا ہو کہ اہل عرب اپنے فن حکمت کے لئے ہندوؤں کے ممنون نہیں۔ ذیل کی تاریخی شہادتوں سے غالباً یہ شک رفع ہو جائے گا۔

خلیفہ المنصور نے ۷۵۴ء اور ۷۷۵ء کے درمیان دمشق کو چھوڑ کر بغداد کو اپنا مستقر بنایا۔ اُس نے سنسکرت کے طبی اور علمی تصانیف کے ترجمے کرائے۔ جن میں ایک نسخہ ترجمہ کے متعلق شرک (یعنی چرک) کا لکھا ہوا، اور ایک کتاب حکمت کی سسرود (یعنی سشرت) کی لکھی ہوئی موجود ہیں۔

مسٹر راتھل اپنی کتاب "ہندوؤں کا قدیم فن حکمت" میں لکھتے ہیں "ابو سرابی نے جو عرب کا مشہور حکیم تھا چرک کا ذکر کیا ہے۔ اور اُسے اس فن میں سند مانا ہے"۔

ابو رازی نے جو ابو سرابی سے فن حکمت میں سبقت لے گیا تھا، اور المنصور کے دربار کا ایک رُکن تھا دو موقعوں پر ہندو چرک کو اپنے بیانات کی تائید میں بطور سند کے پیش کیا ہے۔

شیخ الرئیس بو علی سینا حکما عرب کا سرتاج تھا جو کہنا کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے سشرت کی بتلائی ہوئی جڑی بوٹیوں کا اعادہ کیا ہے۔ حتےٰ کہ نام بھی وہی رکھ دیئے ہیں۔

بیکس مور صاحب لکھتے ہیں "فیروز شاہ نے نگرکوٹ

فتح کرنے کے بعد سنسکرت طبی تصانیف کو ابا زالدین خالد سے عربی میں ترجمہ کرایا۔"

خلیفہ ہارون الرشید کے عہد سلطنت میں اہل عرب ہندو ادویات کو صرف استعمال ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ہندو حکما بغداد میں مدعو کئے جاتے تھے اور دربار شاہی میں اعزاز کی جگہ پاتے تھے۔ ابوعصیبہ بیان کرتا ہے کہ منکا ایک ہندو تھا جو فنِ طب میں ماہر اور سنسکرت زبان کا عالم تھا۔ وہ ہندوستان سے عراق آیا۔ خلیفہ ہارون رشید کو ایک مرض سے نجات دی۔ "زہر کے متعلق چرک کی ایک کتاب کو فارسی میں ترجمہ کیا۔ اسی زمانہ میں اور کئی ہندو حکیموں کے بغداد میں رہنے کا ذکر کیا گیا ہے۔"

ہندو کیمسٹری کا عالم مورخ لکھتا ہے "رس رتن سمچے ہندو فنِ حکمت اور ادویات کی ایک جامع تصنیف ہے۔ اس کے مضامین کی عالمانہ ترتیب، اور حسن اسلوب پر کسی زمانۂ حال کی تصنیف کو بھی فخر ہو سکتا ہے۔"

ناگ ارجن بودھ زمانہ کا ایک بڑا مشہور علم کیمیا کا ماہر ہو گزرا ہے۔ اس صنعت میں اس نے ایک بیش قدر تصنیف اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک ایسا مرکب تیار کیا تھا جس کے استعمال سے انسان کئی صدیوں تک زندہ رہ سکتا تھا۔ عمر کا دل و دماغ اور جسم پر کچھ اثر ہو سکتا تھا۔ ڈاکٹر رائے فرماتے ہیں "ہم نے جو شہادتیں پیش کی ہیں ان سے اس امر کے متعلق کوئی شک نہیں باقی رہ سکتا کہ پارہ کو بطور دوا کے استعمال کرنے کی خصوصیت حاصل کرنے میں ہندو مقدم تھے۔ معدنیات کا اندرونی استعمال انہیں کی ذات سے عام ہوا۔ اور وہ اس لحاظ سے موجد کہلائے جائینگے

دعویٰ کر سکتے ہیں۔ چرک اور سشرت نے معدنیات کے فوائد خوب دل کھول کر بیان کئے ہیں"

یونان میں پلائنی کے زمانہ تک پارہ کا استعمال غیر معلوم تھا۔ پلائنی نے خود پارہ کو زہر بتلایا ہے۔ معدنیات میں معالجانہ خصوصیات کی تحقیق، اور ان کا استعمال ہندو کمالِ فن کی زبردست دلیل ہے۔

مورخ الفنسٹن لکھتا ہے "ہندو وہ پہلی قوم تھے جنہوں نے معدنیات کا اندرونی استعمال ایجاد کیا۔ وہ لوگ صرف پارہ ہی نہیں، بلکہ بعض حالتوں میں سنکھیا بھی تجویز کیا کرتے تھے۔ انکی کتابوں میں ۱۲۷ آلات جراحی کے نام دئے گئے ہیں۔"

مسز اینی بی سنٹ نے جنوری ۱۹۰۱ء میں بمقام کلکتہ اپنی ایک تقریر میں فرمایا۔

طبی اور کیمیائی علوم میں تم لوگوں نے اپنی ہندوؤں نے بہت ترقی کی تھی۔ علم شفا میں تم نے اور بھی زیادہ کامیابی حاصل کی۔ ہندوستانی ادویات، خواہ وہ یونانی ہوں یا مصرانی، مغرب کے فنِ حکمت پر فضیلت رکھتی ہیں۔

ہندو فن حکمت کی داد جس کشادہ دلی سے لارڈ ایمپتھل نے دی ہے اُس کا بیان اعادہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اسلامی فتوحات کے ساتھ علم حکمت کا بہت کچھ حصہ ہندوستان میں واپس آیا جو صدیوں پہلے اس ملک سے نکل چکا تھا۔ اب انگریز لوگ اس علم کا اور بھی زیادہ حصہ واپس لا رہے ہیں۔ جب ہم آب رسانی کی تجویزیں کرتے ہیں، جب ہم شفاخانے قائم کرتے ہیں، اور طبی مدارس کھولتے ہیں، جب ہم پلیگ کے انسداد کے لئے قوانین بناتے ہیں اور جب ہم صحت عامہ کی نگرانی رکھنے کے لئے حکام کو تاکید کرتے

ہیں تو ہم کوئی نئی گوئی انوکھی بات نہیں کہتے۔ ہم صرف وہی کرتے ہیں جو ہزاروں برس پہلے کیا جاتا تھا۔ اور جسے اب بجز مورخ، اور ماہرین آثار قدیمہ کے اور سب لوگ فراموش کر بیٹھے ہیں۔

چیچک کے ٹیکا لگانے کا رواج یورپ میں ڈاکٹر جنر نے ڈالا۔ وہ اس کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس کا کافی ثبوت موجود ہے کہ ٹیکا لگانے کا رواج ہندوستان میں ہزارہا برس پہلے معلوم تھا۔ ہندو حکمت کے خداوند دھنونتری نے صاف الفاظ میں لکھا ہے۔

گائے کے تھن پر کی پھنسیوں کا مواد ایک نشتر کی نوک پر لے لو۔ اور اس نشتر کو کندھے اور کہنی کے درمیان بازو میں چبھا دو۔ یہاں تک کہ خون نکل آئے۔ تب اس مواد کے خون میں ملنے سے چیچک کا بخار آجائے گا۔

یہ اگر چیچک کا ٹیکا نہیں تو اور کیا ہے۔ اسی طرح اور کتنی ہی علمی اور عملی حقیقتیں جنہیں اہل یورپ اپنا ایجاد سمجھے بیٹھے ہیں فی الواقع باز یافت ہیں۔

لارڈ ممدوح نے اپنی اسی تقریر میں آگے چلکر فرمایا۔

میں یہاں ایک تازہ تحقیقات کا تذکرہ کرنے سے باز نہیں رہ سکتا اور وہ یہ ہے کہ طاعون کے زمانہ میں مکان کو خالی کر دینا اور کیمیائی طریق سے اس کی صفائی کرانا ان ہدایتوں سے مطلق مختلف نہیں ہے جو ہندو شاستروں میں کی گئی ہیں۔

آئی۔ کے۔ گجرال

ہندوستان میں اُردو انصاف طلب ہے

اردو بولنے والوں نے جن کی تعداد اس زمانہ میں تقریباً ۳ کروڑ تھی کانگریس کے دو دھڑوں میں تقسیم ہونے کے بعد مسز گاندھی کے انتخاب پسندانہ وجود میں ایک نئی امید قائم کی تھی۔ "اردو کے ساتھ انصاف" کے مطالبہ پر کئی ہزار نفوس نے دستخط کیے تھے اور اس کو ۱۹۷۰ء کے بمبئی کے تاریخی اجلاس کے موقع پر ایک بڑی تعداد میں پیش کیا تھا۔ اس مطالبے کے ذریعہ مسز گاندھی کی توجہ کو اس زبان کی سقیم حالت کی جانب مبذول کرایا گیا تھا۔ اس موقع پر جو لفظ استعمال کیا گیا تھا وہ "بڑا المیہ" تھا۔

مسز گاندھی کا جواب تشفی بخش تھا۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس زبان کو مکمل طور پر نافذ کریں گی جس نے آزادی کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ بعد میں انھوں نے انتخابی منشور مرتب کرنے والی کمیٹی کو ہدایت کر دی کہ وہ اردو کی حیثیت کے بارے میں ایک پیراگراف کا اضافہ کرے۔ لیکن کمیٹی نے محتاط رہ کر صرف اتنا کہا کہ "اردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے گا۔" اردو بولنے والے جو بڑی تعداد میں انتخابی مہم میں مسز گاندھی کی حمایت کر رہے تھے، ردعمل کے طور پر بے دلی کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہوئے۔

لیکن مسز گاندھی اپنے وعدہ میں مخلص تھیں۔ ایک نجی گفتگو کے دوران انھوں نے مجھ سے کہا کہ ایسی کارروائیوں کو نکالنے کا ضابطہ جو وزارت اطلاعات میں اس معاہدہ کو ختم کرنے کے لیے اختیار کریں۔ میں نے اس بلیک لسٹ کو منسوخ کرنے کی ہدایات دیں جس کے تحت تقریباً تمام اردو اخباروں اور جریدوں پر پابندی لگا دی تھی جس کی وجہ سوائے تعصب اور اس زبان سے ان کی ناواقفیت

کے سوا اور کچھ نہ تھی لیکن مخالفت خفیف سی تھی۔ بعض دوررس تجاویز کو روشناس کرنے یا آغاز کرنے سے زیادہ پروفیسر نورالحسن نے جو اس وقت وزیر تعلیم تھے اور احتیاط اور سست روی کی بلکہ سفارش کی کہ اس کے لیے ایک بااختیار کمیشن مقرر کر دی جائے۔"

ابتداءً کمیٹی کو اپنی رپورٹ پیش کرنے کے لیے چھ ماہ کی مدت دی گئی تھی لیکن چونکہ اس کو مسئلے کے بہت سے پہلوؤں کی چھان بین کرنا تھی اس لیے کام اس سے زیادہ پھیلا ہوا ثابت ہوا جتنے کی توقع تھی۔ نتیجتاً ایک متفقہ رپورٹ مئی ۱۹۷۵ء میں پیش کی گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس ایثار ساری داستان کا پہلا مرحلہ اختتام کو پہنچا۔

اب یہ کوئی راز کی بات نہیں رہی ہے اور میرے لیے کلی طور پر یہ انکشاف کرنا جائز ہو گیا ہے کہ چند ماہ کی تاخیر کے بعد رپورٹ بالآخر کیبنٹ کو پیش کر دی گئی۔ اور یہ زمانہ ایمرجنسی کے شروع کے مہینوں کا تھا۔ مسز گاندھی خواہش مند تھیں کہ رپورٹ پوری کی پوری منظور کر لی جائے اور اس کا نفاذ ہو جائے۔ ان کی اس دلچسپی کا سبب کسی حد تک سیاسی تھا۔ ایمرجنسی کی زیادتیاں مسلمانوں اور ان کے وقار کے گروہ بند دانشوروں کو منحرف کر رہی تھیں۔

مسز گاندھی کو تعجب ہوا اور میری بہت کھلبلی کہ جگ جیون رام نے توقعات کے برخلاف اس کی پُرزور مخالفت کی۔ ان کو کسی مخصوص سفارش سے اختلاف نہیں تھا۔ وہ سرے سے رپورٹ ہی کو دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا "آپ لوگ چور دروازے سے اردو کو ہندی کے برابر لانا چاہتے ہیں" پروفیسر نورالحسن اور میں، یعنی ہم دونوں نے کہا کہ ہم پرانے تنازعہ کو پھر سے زندہ کرنے کی کسی طرح کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ اس کے برخلاف اراکین نے اپنے ذاتی رجحانات کے سبب جانبدار ہوشیاری سے کسی ایسے مسئلہ سے اجتناب برتا ہے جو فراموش شدہ تنازعات کو از سر نو زندہ کرے لیکن بابو جی متشددانہ انداز سے اور پوری قوت سے گویا ہوئے، "نہیں، نہیں!" جب کہ دوسروں نے اس موقع پر سکوت اختیار کیا۔

مسز گاندھی نے خاموشی سے اس منظر کو دیکھا۔ انھوں نے محسوس کر لیا کہ وہ حضرت مجھے پریشان کرنے کے لیے ایک بہانہ تلاش کر رہے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اس بات کو قرین مصلحت جانا کہ اس بحث کو ختم کر دیا جائے۔ پروفیسر نورالحسن ہاشمی سے کہنے لگیں "ہم اس معاملہ پر پھر غور کریں گے"۔

یہ ایک پریشان کن موڑ تھا۔ خاص طور پر اس لیے کہ میں نے مسز گاندھی سے پیشگی منظوری حاصل کر لی تھی اور رپورٹ پر دستخط ہونے سے پہلے دوسرے اراکین کو پہنچا دی تھی۔ مسز گاندھی نے مجھ سے میٹنگ کے بعد کہا "ہاں! لیکن تم نے بابو جی کا رویہ ملاحظہ کیا۔ تم نے ان کو واقف کرانے کی کوشش کیوں نہیں کی؟" یہ خطرناک قیاس تھا۔ انھوں نے بے جا طور پر میرے بارے میں شبہ کر لیا تھا کہ میں جگ جیون رام کا معتقد سے دبا ہوں۔ اس وقت میری کوئی بھی کوشش ان عناصر کو جو باہر تھے مجھے سیاسی طور پر مار دینے پر آمادہ کر سکتی تھی۔

تھوڑے عرصہ بعد مجھے ماسکو بھیج دیا گیا اور وہاں رپورٹ کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ ضابطہ پرست حاکموں نے یقین کر لیا تھا کہ تمام نقلیں واپس لے لی گئی ہیں۔ کمیٹی کے ارکان تک کے پاس بھی کوئی نقل نہیں چھوڑی گئی تھی لیکن پارلیمنٹ کے بعض بیدار مغز اراکین، بالخصوص سکندر علی وجد مرحوم عرف راجیہ سبھا میں، پروفیسر نورالحسن کو اکسا رہے ہیں کہ وہ واضح جواب حاصل کریں۔ "رپورٹ زیر غور ہے"۔

جب ۱۹۷۷ء کے انتخابات نے سیاسی حالات کو کلی طور پر بدل دیا تو جنتا کے دور میں بھی اردو کے ساتھ کسی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا گیا۔ نئے وزیر تعلیم ڈاکٹر پرتاپ چندر چندر نے اپنے پیشرو کے نقش قدم پر چلنے کو ترجیح دی اور رپورٹ کو سرد خانہ میں ڈال دیا۔ ایک دن قدرت کا کرشمہ یہ ہوا کہ اس وقت کی حکمران جماعت کے صدر مسٹر چندر شیکھر نے اپنی حکومت سے اس موضوع پر بحث کی اور رپورٹ کو اخباروں میں اشاعت کے لیے دے دیا۔

اس واقعہ نے سنسنی پھیلا دی۔ ایک حیران و پریشان وزیر کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اس کو پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرے لیکن نہ انھوں نے اسے چھپوایا اور نہ زیادہ مشتہر کیا۔ صرف چند سائیکلو اسٹائل کی ہوئی نقلیں تقسیم کرا دی گئیں۔ لیکن معاملہ کی کوئی پیروی نہیں کی گئی۔

اس کے بعد ۱۹۸۰ء کے انتخابات آ گئے۔ ابھی تک جتنا حکومت نے مسلمانوں اور ان کی پالیسیوں کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ مسلمانوں نے کانگریس کا ساتھ دینے اور اس کا قصور معاف کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ جو قصور کہ انھوں نے ایمرجنسی کی زیادتیوں کے سلسلہ میں کیا تھا۔ کانگریس نے ایک مرتبہ پھر اردو زبان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا وعدہ کر لیا۔ منشور میں گجرال کمیٹی کی شائع شدہ رپورٹ کا کوئی ذکر نہیں کیا لیکن اس طرح کے وعدے بہت بڑھ چڑھ کر کیے کہ اردو کو ہندی علاقہ میں دوسری زبان کا درجہ دیا جائے گا لیکن اس کے بعد کوئی قابل اعتماد قدم نہیں اٹھائے گئے۔

اسی دوران بہار کے پرجوش وزیر اعلیٰ مسٹر جگن ناتھ مشرا جو اپنی گدی کو غیر محفوظ سمجھ رہے تھے۔ حزب اختلاف اور داخلی جماعت کے مخالفین کی وجہ سے دہلی میں صاحب اختیار حلیف موجود تھے، دباؤ میں تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایک حکم ریاست کے بعض اضلاع میں اردو کو ثانوی زبان بنانے کا حکم جاری کر دیا۔

اس اعلان نے مسٹر مشرا کو سیاسی طور پر بچا دیا لیکن اس نے اردو والوں کے حلقوں کو دو لخت کر دیا۔ بعض نے اس کو سیاسی فتح قرار دیا جب کہ بعض نے سمجھا کہ اگر ایک طرف اس سے خفیف سا فائدہ ہوگا تو دوسری جانب اس سے دبی ہوئی عداوتیں اور نفرتیں تازہ ہو جائیں گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جب بہار کے بعض حصوں اور شہروں میں مخالف اردو ہنگامے شروع ہو گئے۔

اسی وقت کے اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ مسٹر وی پی سنگھ نے دیکھا کہ مسٹر مشرا نے دوڑ بغیر دوڑ جیت لی انھوں نے بھی انتخابات میں حامیان اردو کو خوش کرنے کے لیے ایک آرڈیننس جاری کر دیا کہ مغربی اتر پردیش میں اردو کو ثانوی زبان کی حیثیت حاصل ہوگی۔ لیکن نہ وہ خود اور نہ ان کے بعد میں آنے والے وزرائے اعلیٰ اس آرڈیننس کو قانون کی شکل دے سکے۔

خود کانگریس پارٹی اندرونی طور پر اس معاملہ میں بٹی ہوئی تھی۔ اور اس میں بعض نہایت بااختیار عناصر موجود تھے۔ اسی طرح پارٹی سے باہر بنیاد پرست پسند اردو کو ذلیل و پست رکھنے کی جانب مائل تھے۔ آرڈیننس جاری ہونے کے بعد سے اتر پردیش میں بھی اردو کے خلاف ہنگامے اور مظاہرے ہو چکے ہیں۔ اب بھی حالت نازک اور پریشان کن ہے۔

ابتداءً ان اقدامات لفظاً قابل ملامت جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لیے کمیٹی نے مصلحت اندیشی کو کام میں لا کر ثانوی زبان کے درجہ کے تنازعہ سے اجتناب برتا۔

رپورٹ میں کیا کہا گیا تھا؟ اس میں پہلے زبان کی تاریخ بیان کی گئی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اردو اور ہندی کے درمیان فصل پیدا کیا۔ اور جب کبھی موقع ملا رقابتوں اور دشمنیوں کو ابھارا۔

حقیقی طور پر لادینی معاشرے کا ڈھانچہ تیار کرنے کی جدوجہد دشوار ہے۔ اردو اور ہندی دونوں ایک متحدہ کلچر کی وارث ہیں اور اس لیے ضروری ہے کہ دونوں کی اس طرح پرداخت کی جائے کہ وہ اپنا اپنا مفوضہ رول ہماری قومی زندگی میں ادا کر سکیں یہ تھا خیال۔

ہندی کو مختلف النوع طبقوں کو متحد کرنے کے لیے بطور دفتری اور رابطہ کی زبان تسلیم کر دیا گیا اور صحیح تسلیم کیا گیا۔

آئین کا دفعہ ۳۵۰ اے اس چیز کو بااختیار حکم نامہ کی شکل دے دیتا ہے کہ بچوں کو ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جائے۔ اس کے بموجب کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کا پرائمری اسکول کسی ایسے گاؤں یا میونسپل وارڈ میں کھول

دیا جائے جہاں اردو بولنے والوں کا تناسب آبادی دس فیصد ہو۔ ہم لوگ سفارش کرنے کے خواہش مند تھے کہ اس طرح کی سہولت ملنا چاہیے لیکن کمیٹی جہاں تک ممکن تھا علیحدہ اسکول کھولنے کی مخالف تھی۔ ایسی جماعتوں اور اسکولوں کا اضافہ ان مقامات پر اچھا ہوتا جہاں دو زبانیں جاننے والے اساتذہ موجود ہوں۔ یہ ہو سکتا تھا کہ موجودہ افراد کو اردو رسم الخط سیکھنے کے لیے آمادہ کیا جائے۔ یہ بھی مفید ہوتا اگر درسی کتاب مشترک ہوتی، صرف رسم الخط کو الگ الگ رکھنے کی ضرورت تھی۔

کمیٹی اس بات کی آرزو مند تھی کہ سہ لسانی فارمولا ہندی بولنے والی ریاستوں میں قابل عمل بنایا جائے۔ اس کا مطلب ہوگا ہندی (ثانوی کی سطح پر سنسکرت کو ہندی کے ایک جز کی حیثیت سے شامل کیا جا سکتا تھا) اردو یا کوئی دوسری جدید ہندستانی زبان تاکہ اس علاقہ کی دوسری لسانی اقلیت کی ضرورت کو پورا کیا جا سکے اور انگریزی یا مغرب کی کوئی دوسری جدید زبان۔ غیر ہندی ریاستوں میں اگر اردو بولنے والوں کے لیے سہ لسانی فارمولا چار لسانی فارمولا بن جائے گا۔ جو برابر حجت کرتے رہے ہیں کہ ان کی خواہش ہے کہ ان کے بچے اردو سیکھیں ان کو ہندی، انگریزی اور علاقائی زبان سیکھنی پڑے گی۔ یہ ان کی شدید خواہش کا ایک خوش آئند اظہار تھا کہ انھوں نے قومی معیار شامل رکھا۔

کمیٹی سے کہا گیا کہ اتر پردیش اور بہار میں سہ لسانی فارمولا سے متعلق پارلیمنٹری ہدایت کو مسخ کر دیا گیا ہے جہاں اردو کو نظر انداز کیا جا رہا ہے اور ہندی، سنسکرت اور انگریزی زبانیں پڑھائی جا رہی ہیں۔ ہریانہ کے علاقہ میں میو قوم کی معقول آبادی ہے جو اردو بولتی ہے۔ وہاں تعلیمی پالیسی یہ ہے کہ ہندی، اردو اور تیلگو پڑھائی جائے۔

مسلمان والدین، بالخصوص متوسط طبقہ میں، جو اس بات کے خواہش مند ہیں کہ وہ ثقافتی ترکہ اردو کی شکل میں منتقل کریں، ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنے بچوں کو ان مدرسوں میں بھیجیں جن کا انتظام مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں ہے اور جہاں ان کو تقلید پسندی اور علیحدگی کی تربیت دی جائے۔ کمیٹی نے بڑی کسی قدر تشویش کے ساتھ سنی کہ تقسیم ملک کے بعد سے ان مدارس کی تعداد سیکڑوں گنا زیادہ ہو گئی ہے۔

اتر پردیش، بہار، راجستھان اور مدھیہ پردیش میں تعلیمی سہولتوں کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس سیاق میں آندھرا پردیش نے نظام کے ابتدائی دور کی روایت کو قائم رکھا ہے۔ یہ چیز مفید رہے گی کہ تحقیق اور ڈاکٹریٹ کی سطح کے لیے پوسٹ گریجویٹ کام کے لیے دو بڑے مراکز قائم کیے جائیں۔ کمیٹی نے سفارش کی کہ اس قسم کا ایک مرکز شمال میں، دوسرا جنوب میں، ترجیحاً حیدرآباد میں قائم کیا جائے۔

• امتیاز کو دور کرنے والا خاص علاقہ انتظامیہ کے دائرے میں ہے۔ ایک صحیح جمہوری حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے افراد قوم کے ساتھ ایک ایسی زبان میں رابطہ قائم کرے جس کو وہ سمجھتے ہوں۔ اس لیے کمیٹی نے یہ بات سمجھائی کہ مقامی افسران کی ہمت افزائی کی جائے کہ وہ اردو سیکھیں تاکہ اردو بولنے والوں سے ان ہی کی زبان میں معاملہ کیا جا سکے۔

اسی طرح یونین اور ریاستوں کی حکومتوں کے لیے یہ مفید رہے گا کہ وہ اپنے سرکاری خبرنامے، اردو اخبارات اور جریدوں کو اردو میں بھیجیں۔ ریڈیو اور ٹی وی کو اردو بولنے والوں کی ثقافتی ضروریات کا مناسب خیال رکھنا چاہیے اور اس کے مطابق وقت دینا چاہیے۔

رپورٹ بے حد جامع ہے اور اس کے دوسرے مختلف پہلوؤں کی جانب تحقیق کے مطابق دھیان دینا چاہیے جو اردو بولنے والی اقلیت کو قومی معیار کے ساتھ جوڑنے میں مدد معاون ہوں گے۔ پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے پھر بھی قیادت کو چاہیے کہ وہ یہ دیکھنے کے لیے مناسب قدم اٹھائے کہ مختلف زبانوں اور تہذیبوں کو مساوات اور عزت و وقار کی بنیاد پر متحد کیا جا سکے۔ اردو اسی کی توجہ کی مستحق ہے۔

••

قومی آواز ۲۰ جون ۸۲ء

وائی - ڈی - گنکووسکی

رُوس میں اردو زبان اور ادب کا مطالعہ

روس میں ہندوستانی زبانوں کا مطالعہ ۱۸ ویں صدی کے اختتام پر شروع ہوا - اس سلسلہ میں لیبدیف نے (۱۸۱۷ - ۱۷۴۹ء) سب سے پہلے ۱۸۰۱ء میں " دیہی و مخلوط ہندوستانی بولیوں کی قواعد " لکھی کہ یہ کتاب انگریزی زبان میں شائع کی گئی تھی اس میں اردو کے بارے میں چند حوالے اور اردو گرامر کے متعلق بیش بہا معلومات بہم کی گئیں ہیں -

۱۹ ویں صدی کے آخر میں شمالی ہندوستان کی بولیوں کے موضوع پر روس میں ۲۰ واں مقالہ شائع کیا گیا - اسے ماسکو یونیورسٹی کے مشہور مستشرق پروفیسر پتروف نے قلمبند کیا تھا - اس میں اردو زبان کے آغاز کے مسئلہ پر بحث کی گئی - اس کے قواعد میں اردو زبان و ادب پر غیر ملکی مصنفوں کی تصنیفات کا ایک جائزہ بھی شامل ہے اس جائزہ میں پتروف نے اردو ادب کی اہمیت کا پوری طرح احساس کیا - ۱۸۸۷ء میں روسی علم الہند اسکول کے بانی میناییف نے " سیلون اور ہندوستان کے مضامین " کے زیر عنوان ایک کتاب لکھی - اس میں میناییف نے اردو زبان و ادب کے متعلق بیش بہا سائنسی معلومات تحریر کی ہیں -

۲۰ ویں صدی کے آغاز میں روس میں اُردو زبان کی قواعد پر کئی کتابیں شائع ہوئیں - جیسے دگرینکو، گلیفزدنگ اور کیلو نے مرتب کیا تھا ۱۸۹۹ء میں گلفزدنگ نے حیدر بخش حیدری کی مشہور تصنیف " طوطا کہانی " اور دیگر نصابی کتب کو روسی زبان میں پیش کیا - روسی قارئین کی آسانی کے لئے " طوطا کہانی " کے ساتھ ایک مختصر و جامع لغت بھی منسلک تھا - جس میں اُردو کے مشکل الفاظ کو روسی زبان میں واضح کیا گیا تھا -

لیکن ۱۹۱۷ء سے پہلے اردو زبان و ادب کا روس میں مطالعہ ایک شوقیہ نوعیت کا تھا - اکتوبر انقلاب کے بعد اس کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا گیا اور پچھلے ۴۶ برسوں کے دوران میں ایشیائی زبانوں اور ادب سے سوویت یونین کی دلچسپی کافی حد تک بڑھی - ان زبانوں میں اردو بھی شامل ہے -

۱۹۲۰ء میں ماسکو اور پتروگراد (اب ماسکو) میں جدید شرقی زبانوں کا انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا - اور سوویت ماہرین علم الہند بہترین روایات کو فروغ دینے کی پوری کوشش کر رہے ہیں -

۱۹۲۲ء میں کلیاگن کی تصنیف "اردو قواعد" ماسکو سے شائع ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں غالب کی غزلوں کا پہلا روسی ترجمہ طبع کیا گیا۔ اکاڈمیشین برانیکوف جدید ہندوستانی زبانوں کے انتہائی متبحر عالم تھے، انہوں نے تقریباً دو سو کتابیں تصنیف کیں، جن میں کئی تصانیف اردو زبان و ادب کے متعلق ہیں۔ انھوں نے ۱۹۲۶ء میں لینن گراد سے ہندوستانی کی جامع قواعد (اردو) شائع کی اور ۱۹۳۰ء میں اردو زبان و ادب کا مختصر جائزہ پیش کیا۔ ۱۹۳۴ء میں پہلی ہندوستانی (اردو، ہندی) نصابی کتاب طبع ہوئی جو آج بھی ہندی اور اردو کے عالموں کی دلچسپی کا سبب ہے۔ اسی سال برانیکوف نے پریم چند کے شاہکار ناولوں کا ایک مطالعہ شائع کیا تھا۔ برانیکوف کے ساتھ ہی اردو مطالع کے میدان میں ممتاز ترین ماہرین زبان جیسے کلیاگینا، سوتنیکوف، بکروفی اور دیگر افراد تخلیقی کاموں میں معروف رہے ہیں۔

اس صدی کی تیسری دہائی میں برانیکوف کی ہدایت کے تحت بکروفی اور گراسنوویسکی نے اردو۔ روسی لغت کی ترتیب کا کام شروع کیا۔ جسے ۱۹۵۱ء میں شائع کر دیا گیا۔ ۱۹۵۹ء میں روسی، اردو لغت جاری کیا گیا۔ جس کی ترتیب و تیاری میں کئی اسکالروں نے حصہ لیا۔ اور دیمشٹس نے اس کے لئے قواعد پر ایک مضمون تحریک کر کے شامل کرایا تھا۔ برانیکوف کے رفیق بکروفی، شیر بنت، سوتنیکوف اور زوگراف نے اردو زبان و ادب کے مطالعہ میں قابل قدر اضافہ کیا۔ زوگراف کی تصانیف میں "۱۹ ویں صدی کی اردو نثر کی خصوصیات" (۱۹۵۶ء) "۱۸ ویں صدی کے آخر اور ۱۹ ویں صدی کے آغاز میں ہندوستانی" (۱۹۶۱ء) "اردو کی تشکیل کے مسائل" (۱۹۵۸ء) اور "ہندی اردو، ہندوستانی" مستند مطالعے ہیں۔ علاوہ ازیں زوگراف اردو ادب کے کلاسکی سرمائے کو روسی زبان میں ترجمہ کے کام میں بھی لگے رہے۔ انہوں نے میر امن کی لافانی تصنیف "باغ و بہار" کو۔ تبصرے اور ابتدائیہ کے ساتھ روسی زبان میں پیش کیا۔ اس ابتدائیہ میں ۱۸ ویں صدی کے آخر اور ۱۹ ویں صدی کے آغاز میں ہندوستانی ادب کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مرزا محمد ہادی رسوا کی تصنیف "امراؤ جان ادا" کو بھی اس اہتمام و اہمیت کے ساتھ روسی میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کے ابتدائیہ میں ۱۹ ویں صدی میں اردو نثر کے ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی۔ ان شاہکاروں کے علاوہ ۱۹۵۵ء میں "آج کل کی ہندوستانی میں پیچیدہ افعال" ۱۹۶۲ء میں "آج کل کی اردو میں سیاسی اصطلاحات" از سوتنیوا اور ایسی ہی کئی تصنیفیں تیار کی گئیں۔ ان کے علاوہ حال ہی میں نوجوان سوویت اسکالروں نے "پریم چند" اردو نثر کا ارتقاء بالخصوص نذیر احمد کی نثر کا جائزہ شائع ہوا ہے۔ پولا توا اور غفاروف نے مرزا غالب کی شاعری پر اور لیبوف نے نظیر اکبرآبادی پر مطالعہ پیش کیا۔ رنبیو وچ نے کرشن چندر، اپندر ناتھ اشک پر مقالے لکھے اور اسپا جانسن نے سعادت حسن منٹو کے افسانوں پر مضمون تحریر کیا۔

سوویت قارئین کو اردو ادب کے متعلق زیادہ گہری معلومات بہم پہنچانے کے لئے مشرقیاتی اشاعت گھر کی طرف سے ہندوستانی نقادوں کی تصانیف کا روسی ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ ان میں سید احتشام حسین کی "اردو ادب کی تاریخ" اور سجاد ظہیر کی "روشنائی" کا ذکر خصوصاً ہو سکتا ہے۔ "روشنائی" میں ہندوستانی انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل اور ابتدائی اقدامات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اردو زبان و ادب کے سائنسی مطالعہ کے ساتھ ہی اردو ادیبوں، شاعروں، نقادوں، اور صحافیوں کی تخلیقات کو روسی زبان میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اب تک سوویت زبانوں میں یہ تراجم کئے گئے ہیں۔ اس سرگرمی کا کسی حد تک اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۶۲ء کے درمیان اردو کی ۶۰ کتابوں کا ترجمہ کیا گیا اور ۳۳ لاکھ ۱۲ ہزار جلدیں مجموعی طور پر شائع کی گئیں۔ ان سے ۳۳ کتب کے روسی متراجم اور ۲۷ دیگر کتابیں سوویت یونین کے دوسری زبانوں میں ترجمہ و شائع کی گئیں۔ مرزا غالب، میرامن اور محمد اقبال کی تخلیقات کے متراجم کے ذریعے سوویت یونین کے پڑھنے والوں کو اردو کے کلاسکی ادب سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ پریم چند کی بیشتر کہانیوں اور ناولوں کو روسی اور دوسری سوویت زبانوں میں شائع کیا جا چکا ہے۔ مثلاً "گئودان" وغیرہ۔

کرشن چندر سوویت قارئین میں بہت مقبول ہیں۔ ان کے معاصر ادیبوں کے مقابلے میں ان کی تخلیقات کے متراجم زیادہ اور کئی زبانوں میں چھاپے گئے ہیں۔ چند کے نام یہ ہیں۔ "آگ اور پھول" (۱۹۵۲ء) "انتخاب" (۱۹۵۳ء) "پانی کا درخت" (۱۹۵۵ء) "چور" (۱۹۶۲ء) "جب کھیت جاگے" (۱۹۵۳ء) "آسمان روشن ہے" ۱۹۶۰ء "شکست" (۱۹۵۸ء) "ایک عورت ہزار دیوانے" (۱۹۶۲ء)۔ خواجہ احمد عباس کے ناول "بھارت کا لال" "گیہوں اور گلاب" "باپ بیٹے" کم مقبول نہیں۔

راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، منٹو، جلیس، ہاجرہ مستور، صدیقہ بیگم کی کہانیاں سوویت عوام میں ہردلعزیز ہیں۔

شعری ادب میں فیض احمد فیض، سردار جعفری، احسان دانش وغیرہ کی نظمیں اور غزلیں شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ بعض روسی شاہکار مطبوعات کو اردو میں طبع کرنے کا کام بھی ہو رہا ہے۔ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۶۲ء کے درمیان ۸۲ کتابیں اردو میں چھاپی گئیں۔ اس کے علاوہ "سوویت یونین" میگزین اردو میں شائع ہوتا ہے۔

(ماخوذ قومی زبان کراچی، ستمبر و اکتوبر ۱۹۶۳ء)

فرخ جلالی
پٹنہ، ۳ر مارچ ۱۹۹۳ء

فارسی ادب کی شخصیات ۔ ایک مطالعہ

آپ نے رات کو پڑھنے کے لیے جو دیا اس میں ایک تازہ کتاب "فارسی ادب کی شخصیات" بھی شامل تھی مصنف ہمارے دوست ولی الحق انصاری فرنگی محلی لکھنوی کے شاگرد ہیں اور شاید لکھنؤ جن ہے گمان ہے کہ یونیورسٹی میں لکچرر ہوں گے۔ ان کے استاد گرامی جب عرفی پر تحقیق کر رہے تھے تب وہ علی گڑھ آتے اور بندہ بے عرفی کے عالم میں بھی ان کی خدمت کرتا۔ بندہ کے کتاب خانہ کے نہایت جامع دیوان عرفی قلمی اور قصاید عرفی (قلمی) سے ان کا استفادہ جاری رہتا۔

کتاب کھولتے ہی ایک نسب نامہ پر نظر پڑی معلوم ہوا کہ مصنف یک جدی نکلے۔ حضرت علی کے والد کا نام ابوطالب حسب معمول دیا ہے یہ ابو کسی عرب کا نام نہیں ہو سکتا ان کا نام مغیرہ بتایا گیا ہے۔ حضرت زید شہید کے تین بیٹے تھے چھوٹے بیٹے موسیٰ موتم الاشبال کی اولاد میں سادات بلگرام سہارنپور وکواتھ رہا اور سادات بارہہ میں حضرت زید کے بڑے بیٹے حسین ذی الدمعہ ہیں جو میرے اور مصنف کے جد ہیں ہندستان میں ان کی اولاد کہیں کہیں ہے تیموری مغلوں کے دفتر میں ہم سادات رسولدار کہلاتے ہیں۔ سید حسین ذی الدمعہ کو افغانستان کے افغان بعد مرگ افغانستان لے آئے اور وہیں دفن کیا قبر مع کتبہ کے موجود ہے یہ پٹھانوں کی پرانی عادت ہے سادات کے ساتھ۔ یہ سید کا لفظ بعد میں اضافہ کیا ہوگا۔ ورنہ بنی فاطمہ کو عرب میں شریف کہتے ہیں۔ شجرہ میں نام کافی غلط ہیں خیر!

پہلا مضمون امان اللہ حسینی پر ہے ان کی کتابیں آپ کے یہاں ہیں یہ مہابت خاں کے بیٹے تھے مہابت خاں کا باپ غیور بیگ اندجان (جہاں بابر کا وطن تھا) کا رہنے والا تھا۔ شیراز کا نہیں۔

جب خسرو نے باپ جہانگیر کے خلاف بغاوت کی تو مہابت خان کا بھائی خسرو کا شریک تھا۔
مہابت خان نے جہانگیر کو خوش کرنے کے لیے بھائی کی گردن اتاری یہ اس کے ترک (مغل) ہونے کی پہچان تھی
مصنف نے اپنے طرز تحقیق میں امان اللہ کی ولادت کی بحث اس وقت سے شروع کی ہے جب اس کا
دادا جنوربیگ طفل ناداں ہوگا۔ ہماری قوم (تحقیق کرنے والے) ایسے ہی حرف آشنا افراد کی وجہ سے انگشت...

مضمون کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ولی انصاری صاحب کے پاس ایک دیوان امانی ہے ویسے امانی کا
دیوان لندن میں بھی ہے۔

غلام علی آزاد کی تاریخ گوئی پر ایک مضمون ہے جس میں مرزا امید قزلباش کا تعارف موجود ہے' وفات
انکی ۱۱۵۹ھ کی بتائی ہے اور یہ بھی لکھا ہے' کہ "بہادر شاہ ظفر کے عہد میں ہندستان آئے"۔

دیکھیے ان کی عادت ہے کہ لکڑ پوتے کو لکڑ دادا سے پہلے پیدا کرتے ہیں۔ میں یا آپ کیا کر سکتے ہیں۔
ہائے نواب ناظم رامپوری کی غزل جس کی ردیف ہی "غلط" ہے اور قافیہ کس قدر غلط ہے اس غلطی کی وجہ
ہوتی ہے جہاں سوجھتا نہیں۔ اورنگ زیب کا زمانہ شاہ زادگی میں نام مثل دارا شکوہ کے اورنگ زیب بہادر تھا
(بہادر چنگیز خانی فوج کے ایک عہدہ کا نام تھا) عالمگیر اورنگ زیب بہادر کے بڑے بیٹے قطب الدین جب
تخت نشیں ہوئے تو ان کا نام قطب الدین بہادر شاہ عالم مشہور ہوا۔ مرزا امید قزلباش انہی بہادر شاہ عالم
کے زمانہ کے ہیں ایک دوار دو شعر کے بھی مالک ہیں ویسے فارسی کے شاعر ہیں اب ان کی امید کا حال یہ ہوا کہ
۱۹۹۲ء میں وہ بہادر شاہ ظفر کے عہد کے ہوگئے۔

سید برکت اللہ عشقی بلگرامی مارہروی پر ایک نوٹ اسی مضمون میں ہے انکو اکبرآباد آگرہ میں مصنف
نے دفن کر دیا۔

سید برکت اللہ عشقی پیمی کا فارسی دیوان شاہ میاں احسن مارہروی نے نوے برس پہلے شائع
کر دیا ہندی کلام بھی چھپ چکا ہے۔ حضرت صاحب عالم ان کے پڑوتے تھے۔ مارہرہ میں ہر سال ان کا
عُرس ہوتا ہے۔

حضرت صاحب عالم کی تحریر غالب بھی نہ پڑھ پاتے تھے۔ لہٰذا میں نے ان کا نام لے دیا
یہ کتاب تو "اب تاریخ ولی الحق" ہے۔

۱۴۱۲ھ۔

ڈاکٹر رحمت علی خاں

سالار جنگ میوزیم
حیدرآباد-۲
۲۷-۴-۹۴

خدانجش لائبریری کے ایک استفسار کے جواب میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ، رضا لائبریری اور سالار جنگ میوزیم کو بھیجا گیا۔
کہ کسی فرمان میں کہیں 'ز' کے بجائے 'غازی' کو 'ذ' سے لکھا دیکھا گیا ہے؟
کم سے کم ایک جواب تو آیا جو درج ذیل ہے۔ (ادارہ)

لفظ غازی / غاذی کے بارے میں

ویسے تو سالار جنگ میوزیم میں بابر کے سکے اور مخطوطات وغیرہ نہیں ہیں لیکن میری تحقیق کے مطابق لفظ غاذی مندرجہ ذیل تواریخ اور دستاویزات پر دستیاب ہے:

۱۔ بابر نامہ تحت واقعات ۹۳۴ھ، ۲۔ نفائس المآثر از علاالدولہ ۳۔ مرحوم پروفیسر شیروانی حیدرآباد کے پاس بابر کے ایک وصیت نامے کی کاپی ہے جس پر بابر کی مہر لگی ہوئی ہے اور غاذی کندہ ہے۔ ۴۔ نیشنل میوزیم، دہلی میں جو مغلیہ سکے ہیں، ان پر بھی غاذی کندہ ہے۔ اکثر غازی "ذ" سے لکھا گیا ہے۔ امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

••

ڈاکٹر
ریاض الرحمٰن قدوائی
لکھنؤ

ایک روزنامچہ کے بارے میں

میرے پاس ایک ڈائری ہے اس کے مؤلف جناب پنڈت دھرم نرائن بکر (ابکسر) تھے جو کہ اندور میں ریزیڈنٹ جنرل کے میر منشی تھے۔ یہ انگریز حاکم کے ساتھ قریب قریب ہر سال پورے مدھیہ پردیش کا دورہ کرتے تھے۔ اسطرح سے ہر مقام پر مقام کی تفصیں لکھتے تھے۔ ایک اور دورے میں وہ ریزیڈنٹ کے ساتھ دہلی گئے وہاں دربار ہوئے تھے ان کا تفصیلی حال درج ہے۔ پھر حاکمان مدھیہ پردیش کے خطاب اور سلامی وغیرہ کی تفصیلات ہیں۔ اس کی صرف دو جلدیں ہیں ایک تو یکم نومبر ۱۸۷۶ سے لیکر ۹ فروری ۱۸۸۰ تک ہے۔ دوسری جلدیں فروری ۱۸۸۱ سے لیکر اکتوبر ۸۵ تک ہے۔

مخطوطہ میں کئی جگہ سے عبارت ذرا ذرا ناقص ہیں۔

ایک نادر روزنامچہ

فہرستِ موضوعات / عنوانات

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے ہماری گذارش پر مولوی سید مظہر علی سندیلوی (م ۱۹۱۱ء) کے ۲۵ ضخیم جلدوں والے روزنامچے کا ایک ملخّص تیار کیا تھا جو ۱۹۹۰ء میں لائبریری نے شایع کیا تھا۔

ہاشمی صاحب نے اب بہ کمالِ مہربانی اس روزنامچہ کا ایک تفصیلی انڈکس تیار کر دیا ہے۔ ہم اس کے لیے ان کا شکر گزار ہیں۔ (ط ب)

از
ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

فہرست عنوانات ایک نادر روزنامچہ

باب اوّل ۔ واقعات ہند:

باب دوم :

باب سوم:

باب چہارم:

باب پنجم:

مشاہیر کے احوال کیلئے اہم مآخذ

صوفیہ

- تذکرۃ الاولیا ——— فرید الدین عطار
- سیر الاولیا ——— میر خورد کرمانی
- اخبار الاخیار ——— عبدالحق محدث دہلوی
- تاریخ سلسلہ فردوسیہ ——— معین الدین دردائی

فهرست اسامی های بزرگان کتاب تذکرة الاولیاء

۸	درذکر جعفر صادق رض	۲۱۱	درذکر ابوسلیمان دارائی رح	۳۶۶	درذکر عثمان الحیری رح	۴۵۰	درذکر ابوبکر واسطی رح
۱۳	درذکر اویس قرنی رض	۲۱۸	درذکر محمد سماک رح	۳۷۳	درذکر ابوعبدالله جلاء رح	۴۵۵	درذکر ابوعمرو نجید رح
۲۰	درذکر حسن بصری رح	۲۲۰	درذکر محمد ابن اسلم طوسی رح	۳۷۴	درذکر ابومحمد رویم رح	۴۶۰	درذکر جعفر خلدی رح
۳۴	درذکر مالک دینار رح	۲۲۲	درذکر احمد حرب رح	۳۷۷	درذکر ابن عطا رح	۴۶۹	درذکر ابوالخیر اقطع رح
۴۰	درذکر محمد واسع رح	۲۲۵	درذکر حاتم اصم رح	۳۸۳	درذکر ابراهیم داود رقی رح	۴۷۰	درذکر ابوعبدالله رح
۴۲	درذکر حبیب عجمی رح	۲۳۲	درذکر سهل بن عبدالله تستری رح	۳۸۷	درذکر یوسف اسباط رح	۵	درذکر ابی اسحق ابراهیم رح
۴۷	درذکر ابوحازم مکی رح	۲۴۸	درذکر معروف کرخی رح	۳۸۰	درذکر ابویعقوب رح	۴۸۳	درذکر ابوالحسن خرقانی رح
۴۹	درذکر عتبة بن الغلام رح	۲۵۳	درذکر سری سقطی رح	۳۹۰	درذکر سمنون محب رح	۵۳۴	درذکر ابوبکر شبلی رح
۵۰	درذکر رابعه العدویه رح	۲۶۲	درذکر فتح موصلی رح	۳۹۳	درذکر ابومحمد مرتعش رح	۵۴۱	درذکر ابونصر سراج رح
۶۵	درذکر فضیل عیاض رح	۲۶۴	درذکر احمد حواری رح	۳۹۵	درذکر ابوعبدالله بن محمد فضل رح	۵۴۳	درذکر ابوالعباس رح
۷۵	درذکر ابراهیم ادهم رح	۲۶۶	درذکر احمد خضرویه رح	۳۹۷	درذکر ابوالحسن بوشنجی رح	۵۴۶	درذکر ابواسحق رح
۹۵	درذکر بشر حافی رح	۲۸۳	درذکر ابوتراب نخشبی رح	۳۹۸	درذکر محمد علی حکیم الترمذی رح	۵۵۳	درذکر ممشاد الدینوری
۱۰۲	درذکر ذوالنون مصری رح	۲۸۶	درذکر یحیی معاذ رح	۴۰۲	درذکر ابوبکر وراق رح	۵۵۶	درذکر ابواسحق ابراهیم رح
۱۲۱	درذکر ابایزید بسطامی رح	۲۸۹	درذکر شاه کرمانی رح	۴۱۰	درذکر عبدالله منازل رح	۵۵۸	درذکر ابوبکر صیدلانی رح
۱۵۶	معراج بایزید بسطامی رح	۲۹۳	درذکر یوسف بن الحسین رح	۴۱۳	درذکر علی سهل اصفهانی رح	۵۶۰	درذکر ابوحمزه رح
۱۶۱	مناجات بایزید بسطامی رح	۲۹۹	درذکر ابوحفص حداد رح	۴۱۴	درذکر شیخ خیر نساج رح	۵۶۱	درذکر ابوعلی الدقاق رح
۱۶۴	درذکر عبدالله بن مبارک رح	۳۰۷	درذکر حمدون قصار رح	۴۱۶	درذکر ابوحمزه خراسانی رح	۵۶۱	درذکر ابوعلی محمد رح
۱۷۳	درذکر سفیان ثوری رح	۳۱۰	درذکر منصور عمار رح	۴۱۸	درذکر احمد مسروق رح	۵۶۳	درذکر ابوعلی احمد رح
۱۸۰	درذکر شقیق بلخی رح	۳۱۴	درذکر احمد بن عاصم رح	۴۱۹	درذکر احمد مغربی رح	۵۶۵	درذکر ابوالحسن علی خضری رح
۱۸۶	درذکر امام اعظم رح	۳۱۶	درذکر عبدالله خبیق رح	۴۲۱	درذکر ابوعلی الجوزجانی رح	۵۶۷	درذکر ابوعثمن سعید رح
۱۹۲	درذکر امام شافعی رح	۳۲۰	درذکر جنید بغدادی رح	۴۲۳	درذکر ابوبکر کتانی رح	۵۶۳	درذکر ابوالعباس نهاوندی رح
۱۹۷	درذکر امام احمد حنبل رح	۳۴۱	درذکر عثمان مکی رح	۴۲۷	درذکر عبدالله خفیف رح	۵۶۸	درذکر ابوعمرو ابراهیم رح
۲۰۲	درذکر داود طائی رح	۳۵۱	درذکر ابوسعید خراز رح	۴۳۴	درذکر ابومحمد جریری رح	۵۶۵	درذکر ابوالحسن صائغ رح
۲۰۸	درذکر حارث محاسبی رح	۳۵۰	درذکر ابوالحسین النوری رح	۴۴۷	درذکر حسین منصور رح	۵۷۰	درذکر ابوالقسم نصرآبادی رح

درذکر ابوالفضل حسن سرخسی رح ۵۹۵
۵۹۲

سیر الاولیا (مشائخ چشت)

میر خورد (کرمانی)

فہرست مطالب

فہرست نقول و حکایات اخبار الاخیار فی اسرار الابرار

تاریخ سلسلۂ فردوسیہ

معین الدین دردائی

فہرست مضامین

جہان آزاد

سرسید — اور پٹنہ کے رشتے

بنام مولوی امجد علی

(علی گڑھ میگزین ، جلد ۳۲ ، نمبر ۱ ، ص ۲۱۸)

مولوی امجد علی ایم۔اے ، مولانا یحییٰ علی خاں ساکن صادق پور (پٹنہ) کے فرزند تھے ۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں نمایاں حصہ لینے کے جرم میں مولانا یحییٰ خاں کو انگریز کی عدالت نے عبور دریائے شور کی سزا دی ۔ چنانچہ مولانا کا انتقال اسی قید فرنگ میں بمقام پورٹ بلیر ۱۸۶۸ء میں ہوگیا ۔ اُن کے دو بیٹے محمد عیسیٰ اور عبد القدیر تھے ۔ محمد عیسیٰ نے اس خیال سے کہ مبادا پھر کوئی آفت آ جائے اور یحییٰ علی کا بیٹا سمجھ کر مجھے پھانسی دے دی جائے ، اپنا نام بدل کر امجد علی رکھ لیا ، اور ایم ۔ اے کرنے کے بعد بنارس ، علی گڑھ اور الہ آباد میں پروفیسر رہے ۔ اپنے وقت میں آپ کا شمار عربی زبان کے بڑے فاضلوں میں ہوتا تھا ۔ ۱۹۲۱ء آپ کا سالِ وفات ہے ۔ مگر جب تک زندہ رہے غریب الوطنی میں فاضل باپ کی لاچاری کی موت سے نہایت درجہ غمگین اور دل گیر رہے ۔

(۱)

جناب مولانا مولوی سید امجد علی صاحب ایم ۔ اے !

آپ کا عنایت نامہ اگرچہ دل خراش تھا ۔ جو کچھ مصائب و ترددات و پریشانی فرماویں بجا ہے ۔ بہرحال ''از تن برضائے قضا دادن چارہ نیست ۔'' قبل آنے عنایت نامے آپ کے تاریخ . . . [1] مقرر ہو چکی ہے . . . [1] ۲۱ جولائی

۱- ان دونوں جگہوں سے کاغذ کو کیڑے نے کھا لیا تھا اس لیے الفاظ نہیں پڑھے جا سکے ۔

روز یکشنبہ ۔ معلوم نہیں آپ کی حالت کے مناسب ہے یا نہیں ؟ بہرحال یہ تاریخ مقرر ہوگئی ہے ۔ کاغذاتِ معمولی چھپ گئے ہیں ۔ دو تین روز میں روانہ ہوں گے ۔ والسلام

علی گڑھ ، ۸ جون ۱۸۹۵ع خاکسار ، سید احمد

محمد موسیٰ کا حال معلوم نہیں کس طرح ہے اور آپ کے پاس ہیں یا نہیں ۔

(۲)

مخدومی و مکرمی مولوی سید محمد امجد علی صاحب !

۲۱ جولائی کو . . .[۲] کا اجلاس ہوگا ۔ اُمید کہ آپ اس میں شریک ہوں گے ۔ مگر اب تک آپ نے اطلاع نہیں دی کہ کس وقت اور کس تاریخ آپ تشریف فرما ہوں گے ۔ اگرچہ وقتِ اجلاس گیارہ بجے لکھا گیا ہے مگر ہم ساڑھے بارہ بجے تک انتظار کریں گے تاکہ دہلی سے جو لوگ آنے والے ہیں وہ بھی آ جاویں ۔ والسلام

علی گڑھ ، ۱۷ جولائی ۱۸۹۵ع خاکسار ، سید احمد

(۳)

مخدومی و مکرمی مولوی سید امجد علی ایم ۔ اے !

میری چٹھی پہنچنے کے بعد مسٹر تھیوبار پرنسپل کالج نے کیا کہا ؟ میری رائے جو اُردو میں چھپی ہوئی ہے اُس کو کسی سے سنا اور مطالعہ فرمایا یا یونہی ڈال دی ؟ اگر آپ از راہِ مہربانی سو روپے اپنی بخشش کے اسی مہینے میں بھیج دیں گے تو میں آپ کا نہایت ممنون ہوں گا ۔ والسلام

علی گڑھ ، ۴ ۔ اکتوبر ۱۸۹۶ع خاکسار ، سید احمد

۲۔ اس جگہ کی عبارت بھی کیڑے نے کھا لی ہے ۔

ARTICLES NOT YET COLLECTED IN ANY BOOK

* KNOWLEDGE & SELF-KNOWLEDGE : Presidential address at the Bihar students conference, Patna, Sep. 21, 1930. 13 p.

—Reprint from Calcutta Review

* SOME PAGES FROM DIARY OF AN INDIAN STUDENT; Modern Review, Aug. 1909, pp 135-141

—On Indian Muslims.

* SAIFUDDIN BAKHARZI : ZDMG, 1905: pp. 345-354

—Ruba'iyat of Bakharzi, (with a brief introduction), from a Ms preserved in Khuda Bakhsh Library.

* THE ORGANISM OF THE MUSLIM STATE UNDER THE CALIPHATE: Annals of Bhandarkar Oritental Research Institute, 1920-21, pp. 129-141

* MOMIN HUSAIN OF YAZD: ZDMG, 1907. pp. 129-41

* A STUDY OF ISLAMIC UNITY :Visva Bharat i quarterly, 1926-27, pp. 370-80.

* ARABIAN POETRY : Visva Bharti quarterly 1923-24, pp. 296-302.

* MOHAMMEDAN VIEW OF ISLAM & CHRISTIANITY; Muslim World, 1920, pp. 365-77

• • • •

LXXIX.

Savant — Theology — The schools of Jurisprudence — The Qadi — Philology — Literature — Geography — Religion — Manners and Morals — The Standard of Living — Municipal organization — The Festivals — Land products — Industry — Trade — Inland Navigation — Communication by road — Marine Navigation.

"My brother, Salahuddin, began his last work on Islamic studies — a tranlation of Professor A. Mez, "*Die renaissance des Islams*" from German into English on the 16th of July, 1927. He completed twenty three and a half out of the twenty-nine chapters by July, 1931, when unfortunately he was taken ill and died on the 9th of August, 1931 The translation of the last five and a half chapters, which he left unfinished, was very kindly done by Dr. Margoliouth, Professor of Arabic in the University of Oxford, who had taught my brother Arabic when the latter was a student at oxford in the late nineties. The first seventeen chapters of the book as well as chapters 23 to 29 were published in the magzine "Islamic Culture" at Hyderabad between the years 1928 and 1933. After my retirement from the Indian police service in August, 1934 I went to England. There, my sister-in-law, Mrs. Evelyn Khuda Bakhsh, told me that she had carefully preserved the unpublished translation of the Renaissance of Islam by her husband, and that she desired to have the entire work published in the form of a book . . .

(From 'foreword', by Shahabuddin Khuda Bakhsh)

Of the total 517 pages, Salahuddin translated 439 pages and rest of the (439 – 517 =) 79 pages were done by Margoliouth.

Adam Mez, the author, was born in 1862 & died in 1917.

THE ORIENT UNDER CALIPHS. Calcutta University Press, 1920 470 p.

"In 1920 the University of Calcutta published my English translation of the first volume of Von Kremer's *Culturgeschichte des Orients*"

(From : 'Foroword' to *Studies : Indian & Islamic*)

(The book is not available in the Library, or elsewhere.)

SIUDIES: INDIAN & ISLAMIC, (first edition 1927) ; Reprinted, Delhi, Idarah-i-Adabiyat 1978. 275 p.

Contents; Foreword—Mohamed: The Prophet of God—Arabian poetry — The new world of Islam — Islamic Regeneration — The Arab Kingdom & its fall — The Book trade under the Caliphate — Islamica — A defence of Islam — The tales of Nasr-ed-din Khoja — The Shahnamah of Firdausi — The tragedy of Kerbala — My critics — Marriage & Family life among the Arabs — Social & political conditions under the Caliphate — Literary & Scientific activites under the Caliphate — The Caliphate: Its decline & fall — Just Human — Withered leaves — Impressions of Simla — Impressions of Darjeeling — Mahatma Gandhi — Sir Asutosh Mookerjee — C.R Das — Baba Frawn — Hindu-Muslim pact.

CONTRIBUTIONS TO THE HISTORY OF ISLAMIC CIVILIZATION Vol. 2 University of Calcutta, 1930. 303 p.

Contents: The origin and character of Islamic civilization — Islam as a problem — The Muslim world of today — Education: Its scope and aims — Islam and the modern world — Persian poetry — The Awakening of Islam — Harun ar - Rashid — The Arab Academies and their Professors — The Kharijites under the first Omayyads — Ibn Khaldun and his history of Islamic civilization — The educatonal system of the Muslims in the Middle Ages.

THE RENAISSANCE OF ISLAM translated from the German of Adam Mez) Patna Jubilee printing & publishing house, 1937. 517 p.

Contents: The Empire — The Caliphs — The Princes of the Empire — Christians & Jews — Shi'ah — The Administration — The Wazir — Finances — The Court — The Nobility — The Slaves — The

LXXVII.

MAXIMS & REFLECTIONS. London J.M. Dentt & Sons, 1916. 86p.
— Translated from the Persian

" It was the merest accident two years ago which took me, one fine January morning, to an old bookstall. Among the stock for sale I found a neglected heap, dusty and battered by the shocks of time. I cut the string, and lighted upon an exquisitely written Persian manuscript. It was not very old. In fact it looked quite modern. It was a collection of sayings — prose, poems were perhaps a more appropriate description. It promised to be very interesting, and that promise it amply fulfilled. It bore no name, and the provokingly brief autobiography which preceded the text threw but scant and insufficient light upon its authorship."

(From 'foreword')

LOVE OFFERINGS, Calcutta, Art Press, 1923 66 p.

" In this little book I have collected the 'prose Poems', or the 'Love offerings', which were published from time to time in the Calcutta Review' 'If I may say so they are memories of a dead past. In revising the proofs lying before me, I have experienced a pleasure not unmingled with pain. Every one, or almost every one, of these little pieces has a story of its own . . . Like *Maxims and reflections*, these too are a blend of East and West'. They are meant for those who, with advancing years and maturing experience, realize that human society is compacted of tragedies."

(From 'foreword')

POLITICS IN ISLAM; Calcutta, Baptist Mission Press, 1920;
(4; 145 to 243=) 103 p
— Reprint from the Sir Asutosh Mookerjee Silver Jubilee Volume.

"It would be inaccurate to describe the pages lying before us as a mere translation of the *Staadsidee des Islams*. in von Kremer's *Gechichte der herschenden Ideen des Islams*, for I have incorporated into it the researches of Wellhausen, Goldziher and other English and continental scholars. It is Von Kremer enlarged, amplified"

(— foreword)

THE WORKS OF S. KHUDA BAKHSH

BIBLIOGRAPHY of the Books & articles of S. Khuda Bakhsh (Salahuddin Khuda Bakhsh) M. A., B. C. L. (Oxon), Bar - at - Law; Fellow of the Calcutta University; Lecturer in History of Islam; Professor of the University Law College, Calcutta. (born 1875, died Aug. 9, 1931).

CONTRIBUTIONS TO THE HISTORY OF ISLAMIC CIVILIZATION Vol I: (containing a translation of Von Kremer's *Culturegschichtliche Streifzucu auf dem Gebiete de Islams), 1905, 297 + xxv p.*

Contents : Translator's Introduction (41 p.)

Von Kremer's translation (pp. 43–118).

Salahuddin's addition : (pp. 119–297+35) :- The Arabs before Islam -The Medieval conception of Islam — The Seljuke before the crusades — The Omayyads and the Eastern Empire — A Christian Missionary — The Wizarat and Governorship under the Caliphate — A Historical sketch of Muslim learning — Extracts from Ibn - Hazm's Jamharatu-n-Nasab: Khuda Bakhsh Library MS. — Appendices.

ESSAYS INDIAN & ISLAMIC. (First published, 1912). Reprinted, Delhi, Idarah-i Adabiyat, 1977. 295p.

Contents : The Spirit of Islam – The Islamic conception of Sovereignty — The Shu'ubiyyah Movement in Islam its origin, its growth, and its results—Ghalib : an appreciation – My father : his life, and reminiscences — Hindustani Literature — Thoughts on the present situation.

A HISTORY OF THE ISLAMIC PEOPLES : Translated from the German of Dr Well's *Geschichteder Islamiscchen Volker* ; University of Calcutta, 1914. 170+ viip.

Contents · Introduction (by Translator) — Mohamed & the Qur'an — The Qur'an — The Elective Caliphate in Medina — The Omayyads in Damascus.

LXXV.

This writer, but the mouthpiece of the Indian Muslim bourgeoisie, is with them wherever they go, he and his scholarship. Even in his temporary lapse with them into radicalism, he never got ahead of them.

— *Wilfred Cantwell Smith*

III

Mr. Salahuddin Khuda Bakhsh, who had studied at the University of Oxford, in his busy life as barrister and Professor at the University of Calcutta, found time to produce numerous original works connected with Islam and its history, and to give English dress to important German treatises dealing with these subjects, enriching them with his own observation — thus Von Kremer's brochure *Culturgeschichtliche Streifzuge*, in the second edition of the translation, is swollen into two stout volumes (Islamic civilization, Calcutta 1905, 1930). Since his Oxford days he had maintained regular correspondence with the present writer, and when he undertook to translate the *Renaissance* for Hyderabad Magazine Islamic Culture, asked me to peruse and make observations on the typescript before sending it to press, which I was very willing to do The last batch of typescript was returned to me by post, marked "Addressee Dead", a great shock and grief to me, thus learning that I had lost a valued friend of long standing, while the world had lost a man peculiarly well qualified to interpret East to West and West to East, owing to the variety of his attainments and the width of his sympathies. How wide they were was apparent to anyone who visited his overflowing library, bequeathed, I understand, to that which bears the name of his family at Bankipore (Patna).

— *D. S. Margoliouth*
Oxford, July 1937

"... a wonderful phenomenon – undreamed of, unimagined, unhoped by the wildest hopes of man ... May the Muslim solidarity—for purposes Indian—be merged into the higher, nobler, Indian solidarity—mightily single, splendidly whole ". The whole article The New World of Islam (inspired by Lothrop Stoddard's book of that name), shows a vigorous and optimistic zeal for the renascence of Islam and Islamic society. The article Mahatma Gandhi is an idolization of that man and his programme, and an unrestrained admiration for "the spirit of justice, honour, righteousness" that he has infused.

All these political attitudes have their counterpart in his cultural interests. Previously his ambition had been hardly more than for Muslims to become English gentlemen; now he can say : "Orientals we are, and Orientals we must remain ; and European culture can never be for the majority of us more than an incidental and subsidiary acquisition", The appearance of the new German orientalist review Islamica, which he cannot but praise, gives occasion for an impassioned plea for Easterners to undertake Eastern scholarship, not to remain for ever subservient to the West ; and in Islamic Regeneration he pleads for the revival of Arabic, Persian and Hindustani education. This last item is of course the cultural aspect of Hindu-Muslim concurrence in the Non-co-operation movement.

But meanwhile the years were passing ; the nationalist revolt collapsed for the nonce, and the Muslim bourgeoisie was betaking itself to isolation and a defensive alliance with the British. The Professor can then describe the Hindu-Muslim Pact as a sublime folly, denounce the Congress as a wanderer in rapturous dreams of unreality, and in his reaction despair of Islam and its culture in an independent India. "It is idle ... to look to Swaraj for the cure of our present ills, and equally idle ... to look to it for a reign of ... righteousness ... It will divide Indian humanity into two great unequal halves — Heaven for one and Hell for the other".

LXXIII.

In fine, he is not a creative thinker. There was but one contribution that he could make ; and this he did make, assiduously, in spite of the bitter opposition that he met in his determination to spread modern ideas about Islam. This contribntion was to those of his fellows (and they were not few) who wanted to be good bourgeois capitalists, but might have some doubts about its being hardly the right, the Muslim, thing to do. He would happily remove all their misgivings.

Such is Khuda Bakhsh. We cannot leave him without pointing out the hearty reception which his thinking received in the West. One after another of the Western writers on modern Islam (and not least the missionaries) have welcomed him as the last word in Muslim modernisation, and have praised his liberalism to the skies. Therein they but betray to what class they themselves belong.

In 1927 he published a new collection of essays written during the preceding decade or so and showing how that decade had affected a Muslim of his standing. On going through the book, one notices at once that the author has advanced far from the position that he held before the war. His spirit is still not especially religious (one finds no prominent note of either reverence or moral fervour in his writings), but from the placid scholar content with the broad outlines of his environment, he has become actively aware of the problems that have become painfully critical in the new decade. Exclamation marks now abound. His previous aloof disdain of politics has given way to an energetic and partisan discussion of contemporary affairs. The developing crisis within that Indian capitalism which was encouraged during the war and was by now in conflict with the parent British imperislism, is mirrored in the professor's ardent nationalism. He who in 1912 was wholeheartedly loyal to the Empire and called for governmental repression of Indian 'sedition', is now enthusiastically an Indian. "The Europeans' claim to superiority is now a myth, ... a relic of bygone days". "Let us stand on our own strength, fight our own battle. He speaks sympathetically of "political combinations, strikes, non-co-operation"; uses phrases like "... the way to bring the bureaucracy to its knees "; and sees the programme of the New Muslim world as including ' the eviction of Western capital". It is the days of the Hindu Muslim Pact and he expresses the enthusiasm for Indian unity:

attempt to discriminate between good and bad in the new culture. When once he comes near to doing so, it is to complain that Indians have copied Western ways of spending money, but not of earning it. "We have developed expensive habits ; we are imitating luxurious modes of living, but we have not succeeded in learning that supremest of practical lessons—viz., the lesson of making money". Politically, his support of the British conquest is equally wholehearted: "... the Empire to which we have the honour to belong ..."

Thus while he advocates progress over against those behind the time who oppose the new society, he wants no further social change. Although he is in one respect consciously innovating, from feudal to bourgeois order, he is in another respect the rigid conservative : he is half-conscious that a still newer society is adumbrated, and he is against it. He, whose appointed task was to cry out against that religious conservatism which tended to preserve one form of society against progress to the next, now would have religion assist in keeping the present society from being superseded. In true conservative style, he regards religion as a social check, one 'far more effective than ... the Indian Penal Code", without which society would crumble.

This inner contradiction leads him to many positions where he must vacillate, and to inconsistencies. In berating the toadying and office-grabbing of the new condition, he is forced into lauding "the old system" which "with all its faults, had many redeeming virtues"; and frequently he must appear for all the world like numberless early-bourgeois fathers lecturing their children on the dissoluteness of the modern day. Fresh from demolishing the Islamic reverence for tradition, he warns that there must be respect for law and order, for one's betters, even respect for age. He protests against the present neglect of Arabic". And so on. But the most important evidence of this vacillating position is the general indecisiveness of all his writing. He can analyse the faults of the past, and sweep them away; but of the present he can do so to only the slightest extent; and he has nothing really positive and new to offer as a constructive suggestion for the future. In so far as he is able to see the problems in the present new culture, rather than solving them in tormorrow's way he is driven back in fear to the past which he has otherwise rejected.

The new Islām that he envisages is indeed simple. He readily says that it is indistinguishable from all true religions, and especially Christianity, which he frequently praises. It consists in little more than the spirit of charity — of course on the part of the more fortunate members of society. It is clear throughout that he is writing with this class in mind; the very fact that he writes in English shows this, but also he repeatedly refers to situations in which only the middle classes ever find themselves (for instance, when he urges young Muslims to choose their careers in trade rather than government service). There is practically nothing in his morality that would have any application to the life of the dispossessed.

He is, then, a bourgeois, and he has thoroughly absorbed the bourgeois ideology. There is, of course, philosophic idealism: "We believe ... that opinion, and nothing but opinion, can effect great permanent changes"—hence, we must combat social evils not by political action but by education. By freedom, he means freedom of thought. There is the well-known bourgeois statement that religion should keep out of politics; and the well-known bourgeois meaning of the statement that it should support the status quo. "I have ... kept aloof from ... Indian politics"—actually he had been staunchly pro-British—; two pages later, "We must actively support the Government in destroying sedition and anarchy"; immediately afterwards, but this time referring to social reform, "We must, for the present, banish politics from the programme of our activity". Furthermore, there is gradualism: "Let us proceed, but with slow, cautious steps". But most telling is his list of virtues, without change those of early capitalism: thrift, hard work, temperance, education and the like. Of "the most glaring and the most obvious" vices from which Muslim society is suffering, idleness is ranked first and the neglect of trade and commerce second. He writes against polygamy and the seclusion of women; we must be modern.

His acceptance of Western civilization is complete; he sees nothing immoral, nothing un-Islamic, in industrial capitalism. "There is nothing in its" (i.e. Islam's) "teachings which conflicts with or militates against modern civilization". He makes no criticisms of slums, exploitation (or interest), wars; not to mention the more subtle bourgeois faults, acquisitiveness, frustration, and the like. He makes no

reflects faithfully the thinking of his class; and secondly, because he has attracted very much attention in the West. We shall study him again later, for the former reason : whatever were the new developments in Indian middle-class Islam, his attitude changed to meet them. Meanwhile we shall analyse his early position, as seen in two essays. *The Spirit of Islam* and *Thoughts on the Present Situation*, published in 1912. Such an analysis will repay us with an insight into the culmination of the religion of the group that he represents.

His was not a deeply religious spirit. Nevertheless, he was deeply interested in his religion; as a factor in the society to which he belonged, and he wanted to see it reformed, Like the others of this school, he saw the customs and superstitions of the old Islam as not intrinsic, but the expression of the decadent socity to which they belonged. Using the results of Western scholarship he would analyse them out of Islam He did not, however, adopt the theory that he was but restoring Islam to its pristine purity, rather he innovated consciously, striving for a modern religion "It would be the merest affectation to contend that religious and social systems, bequeathed to us thirteen hundred years ago, should now be adopted in their entirety without the slightest change or alteration", and he explicitly rejects even from the Qur'an the lega matter and social customs : "The Qur'an, rightly understood .. is a spiritual guide ... putting forward ideals to be followed ... rather than a *corpus juris civilis* to be accepted for all time". On examination the reform that he advocated appears to be like Sir Sayyid's but more explicitty, mostly negative. He wanted Islam to get rid of all those aspects which hinder a full acceptance of modren bourgeois culture : "is Islam hostile to progress ? I will emphatically answer this question in the negative. Islam, stripped of its theology, is a perfectly simple religion. Its cardinal principle is belief in one God and belief in Mohamed as his apostle. The rest is mere accretion, superfluity. The requirements of Islam are at once easy and simple, and leave scope to Muslims to take part in their duties as subjects or citizens, to attend to their religious obligation without sacrificing their worldly prosperity, and to adopt whatever is good in any community or civilization without any interference on the part of their

argument is sound Admitting that the Mohammedans came to India as foreign conquerors, as utterly different to the Hindus as the British are different to us both, we cannot forget that for many centuries they have lived side by side, freely mixing with the people of the land, mutually influencing each other, taking Indian women as their wives, adopting local customs and local usages; in fine, permeated and pervaded through and through by local characteristics and local peculiarities. The most infallible proof of this we find in the marriage ceremonies, which are entirely Hindu ceremonies in the customs of the women-folk such as the use of the vermilion mark, the symbol and token of wedded life, the restrictions imposed upon the dress and diet of widows, the disapproval, nay, condemnation, of widow marriages—and, indeed, in a thousand little practices behind the *zenana*. All this indicates somewhat more than mere superficial connexion between the two communities which mainly divide the Indian population. A yet clearer proof is the unity of language, and the similarity of dress. Moreover, say what we will, a large number, in fact the largest portion of the Mohammedan population, are Hindu converts to Islam. It rests upon no unwarranted assumption, but upon well ascertained facts, that Hinduism and Mohammedanism have acted and reacted upon each other: influencing social institutions, colouring religious thoughts with their mutual typical, and religious hues;" these, being "conspicuous illustrations of the union of the two streams of Hinduism and Islam which, since the Muslim conquest, have flowed side by side in India." So thought and wrote Salah-ud-din. India badly needs many more of her sons to represent the type which he did, both in the spheres of religion and politics.

— *Sachchidananda Sinha*

II

The class content of the new religious position comes to its fullest expression in the writings of Professor Salah-ud-din Khuda Bakhsh, of Calcutta. He was not unusually influential (though he did a good deal to introduce the scholarship of Western Orientalism into Indian Islam). But he is important for two reasons : first, because he

and distinct. Such was the case at Rome, and such has been the case at Makka."

"All respect and honour is due to the law laid down by Mohamed, but the very fact that Muslim jurisprudence grew into a stupendous fabric within an incredibly short time, partly by interpretation and partly by adoption of foreign rules, unmistakably proves that the legislation of the Prophet of Arabia made no claim to finality. It shows beyond doubt or cavil, that the law of the Prophet was neither wide, nor comprehensive enough to cover the newly-arisen conditions of life in which Muslims (Arabs) found themselves after their brillant and extensive conquests".

These few extracts from Salah-ud-din's writings and passages declaring similar sentiments could easily be multiplied, picked out, from his collections of essays, mentioned above — clearly establish that he was a liberal interpreter of Islam, and a rationalistic (as opposed to a dogmastic) expositor of his religion. As such, he was much in advance of his time, in this country.

Salah-ud-din deserves high appreciation for his work in seeking to widen our mental horizon especially in a dogma-ridden land like India. In his essays dealing with Islamic subjects, Salah-ud-din takes the right rationalistic attitude, and just the point of view now needed for the progress of Indian Muslims. He adopts that outlook with a sort of tender pride in the past, coupled with a bitter revulsion from priest-craft and the accretions of ritual and dogma, which are now-a-days the bane of India, equally for the Muslims and the Hindus. As such, I maintain that Salah-ud-din rendered great and valuable services to the religious and social advancement of Indian Muslims.

Lastly, Salah-ud-din was not only liberal and progressive in the interpretation of religion, but also in the sphere of politics, as would be evidenced by the views he expressed on this subject. 'We are constantly told that Mohammedans are a distinct people, as unlike the Hindus as the Semite is unlike the Aryan: that there are differences penetrating to the very root of life, differences of habit, temperament, social customs, racial type; that these differences are so vital and so enormous that the fusion between the two is a hopeless impossibility, an impracticable dream. Now I am not at all sure that this

was hereditary, for the son of the founder of the world-renowned Oriental Library could not be expected to be without that particular trait in him. By his premature death, in 1931, at the age of fifty six, the cultural life of India in general, and Bihar in particular, suffered a very serious loss. A man of erudition and culture, he possessed, in an extraordinary measure, what Matthew Arnold called "sweetness and light."

Of the principal works, in English, standing to the credit of Salah-ud-din, by far the larger number are translations of standard German histories of Arabian civilization and culture—the well-known works of Von Kremer, Wustenfeld, Becker, Weil, Brunow Wellhausen, Adam Mez, and Joseph Hell. Thus, only three original works can be placed to his credit, and these are the two collections of essays both published in, London in 1912, and 1927, and designated respectively: *Essays — Indian and Islamic*, and *Studies — Indian and Islamic*; and also the second volume (published by the University of Calcutta, in 1930) of his *Contributions to the History of Islamic Civilization*, the first volume of which contained a translation of Von Kremer's *History*. The second volume contains both translation and also a few original essays by Salah-ud-din. It is mainly on these three books that his reputation as a critic, expositor, and thinker, stands.

O

"It was never the intention of the Prophet—and no enlightened Muslim believes that it ever was — to lay down immutable rules, or to set up a system of law which was to be binding upon humanity apart from considerations of time and place, and the growing necessities arising from changed conditions. True, for the purposes of order and security and the preservation and maintenance of the new society created by Islam, he laid down rules regulating marriage, inheritance, and so forth, but these rules were mostly of a very elementary character and were intended to meet the existing conditions of things. The position of Mohamed, indeed, was that of a spiritual teacher, a prophet, and not that of a legislator. In the infancy of human society there is but a faint line of demarcation between law and religion, the two being inseparably connected with each other. With advancing civilization, the line becomes clearer and sharper, and religion and law become separate

LXVI.

ABOUT
SALAHUDDIN KHUDA BAKHSH

I

Salah-ud-din, who was born at Patna in 1875, and was the eldest son of Khuda Bakhsh, the Indian Bodley, was a distinguished scholar, of the modern type, and a great intellectual force amongst the Muslims in India. His was a vivacious and interesting personality, and a striking figure, for about a quarter of a century, in the intellectual world of Upper India. He was a scholar not only of English, but also of German, Arabic, Iranian, and Hindustani. His life was one sustained devotion to the great ideals of advancement of learning, which he had imbibed at Oxford and which he made his own by his assiduous studies in Islamic literature. But though of Oxford, there was nothing Oxfordy about him. He was undoubtedly one of the ablest and most erudite Muslim scholars and writers of modern India. His fame was not confined to India alone, but had crossed the seas, and he was acknowledged even in Western Europe, as a pre-eminently liberal expositor of Islamic literature, and Muslim history — the latter mainly non-Indian. He was also an educationist of no mean repute, and his connexion with the Calcutta University, as a Senator as well as a teacher, was an asset to it.

Salah-ud-din was the author of some useful and informative books, and also a translator (from German) of a number of standard historical works on Arabian civilization, which were appreciatively acknowledged in cultured circles. Above all, he was a genial friend, equally popular with all, by reason of his freedom from communal or racial bias. He married a talented English woman, and his married life was quite happy. His witty remarks and recitations of Iranian and Hindustani verses were always appreciated by his hearers. In addition to his professional and social pursuits, he found time to write articles in various journals, which were always eagerly looked for by his admirers. He was, so to say, by inherited temperament, a great lover of books, and his library (consisting of several thousand volumes, and some hundreds of manuscripts) was a valuable collection. The instinct

About S. Khuda Bakhsh

by

I. Dr.Sachchidananda Sinha
II. Wilfred Contwell Smith
III. D.S.Margoliouth
IV. A.R.B.

Judge not by appearances, for only too often they blind us to realities."

* * *

From the moorings of the past thou must loose—nay, sometimes sever thyself; from thy lethargy thou must needs shake thyself; to thy sense of responsibility thou must fully awaken; to useful labour thou must steadfastly set thy hand—these thou must do, O East, if thou art ever to enter upon thy heritage of yore and have again what once was thine: leadership in sphere intellectual; sovereignty in sphere Divine.

THE TEMPLE PRESS LETCHWORTH ENGLAND

of departed sires; there the loving heart feels the invisible but none the less caressing touch of vanished hands.

* * *

Wealth and Poverty—they try the character and reveal the breed of man.

* * *

I saw a little child fondling and caressing a doll—fondling and caressing it with all the ardent glow of unselfish love; with all the warmth of intense passionate joy. In that simple act of the child I saw the glories of womanhood shine in radiant splendour—its unselfish love, its unfailing devotion; its noble self-surrender, its unshrinking self-sacrifice.

* * *

"Who art thou, thou that never leavest me—cruel, unwelcome companion? Who art thou?" "Fate. I am Fate—no escape hast thou from me. I lead humanity by the nose. My rule none can question; my decrees none can avert; my will none can thwart and all must obey. I am heedless of human suffering and indifferent to human tears. 'My will must be done'—that is the inscription my shield beareth, and that is what every human being only too well knoweth."

* * *

"Here in this garden where I have built my nest," said the nightingale, "and which to the casual visitor is but a vision of loveliness; here, for me, the very perfume of the flowers is laden with sadness; for do I not daily see the flowers bloom and fade? Here, my very own nest, built oft and built anew, stands for an emblem of our vain and fruitless strivings; here what they call my SONG is naught but lamentations over the uncertainty and instability of all things earthly. Wrongly, wrongly do men call me happy, for I, too, am sore and sick at heart; I, too, long for release from my captivity as anxiously as does the most weary man on earth.

right opportunities, as in appreciating our powers and understanding our limitations.

* * *

Without freedom, truth, like honour, is in bondage. Both bear the shackles of servitude, for both exist to serve other than their own legitimate ends.

* * *

We resent a false accusation, but we love false praise. We condemn falsehood, but we act the lie from sunrise to sundown. Does not life offer strange contrasts ?

* * *

The Prophet of God has said that love of children is the surest sign of a heart overflowing with mercy, tenderness, and compassion.

* * *

Popular opinion is rarely right, for it is more often factitious than genuine.

* * *

With man it is the reason, with woman it is the instinct that rules—both err in their judgment, but woman less frequently than man.

* * *

" The fool's judgment thou wilt hear "—thou that incessantly toilest ; thou that sheddest thy blood ; thou that bringest light and wisdom ; thou that softenest the burden of man—thou, each and all—" the fool's judgment thou wilt hear."

* * *

The insolence of power is trying enough, but the insolence of wealth is beyond endurance.

* * *

It has been said that a home represents the rule of the dead, and, indeed, it verily does so if it is a home in any true sense of the word, for everything there—the merest trifle—evokes some memory, calls to mind some dear tradition, or summons up some delightful vision of the past. There the present and the past stand indissolubly linked together ; there the discerning eye sees the impalpable but none the less effective influence

grave? What boots it if monuments are erected to my memory? What does anything matter to the dead, flowers or prayers or tears, censures, reproaches, or tirades? Nothing then cheers or saddens; nothing then affects or hurts—enfolded in the bosom of Earth, we sleep the eternal sleep of death. Healer and Comforter; Annihilator of cares and woes to some; Respecter of none; greatest and truest of Levellers; master of all—Death!—irresistible is thy power; wondrous thy ways.

* * *

Painful to the eyes that have witnessed the luxuriant bloom of the Spring is the desolation of Autumn—its barren trees, its russet leaves, its prevailing gloom. How much more painful must it be to watch the ruin of a great mind; the end of a fondly-cherished dream; the final severance of life-long ties! What flotsam and jetsam strew the tide of human life!

* * *

Weep no more! Let tears dry; for one relief we shall surely have—that which is obtained at the hand of Death.

* * *

Reality is Dreamland's inveterate foe, and Despair is Hope's inheritor by right divine.

* * *

The Bore, I suppose, hath existed in every age. How insufferable he is! Never hath he aught to say: yet doth he ever insist on saying it.

* * *

Adversity affects different people differently. Some it shatters; some it embitters; some it softens; but upon all it leaves its ineffaceable imprint.

* * *

A mother's love! A brother's hate! One as deep as the sea; the other as fierce as the flames of hell.

* * *

The secret of success lies, not so much in using the

wrong whereby he measures humanity and judges the world.

* * *

Vice carries its own punishment. Is there anything more appallingly terrible than the rebukes of conscience or the agony of remorse ?

* * *

The royal seal of Persia bore an inscription than which it is impossible to imagine aught more charming—"Love and humility." This is all we need in life, for love illumines human nature and humility sanctifies human virtues.

* * *

The most fleeting of all earthly things is popular applause. It is as unstable as water ; as variable as the wind.

* * *

Unbidden flow the tears when memory takes wing and flies into the dim regions of the past. Truly hath the poet sung : "A sorrow's crown of sorrow is remembering happier things."

* * *

Is that Faith worth a dirham which shrinks from the touchstone of trial ; which fears the fire of temptation ; which falters beneath the weight of suffering ?

* * *

What heavy penalties do our vanity and pride exact ! And yet we would rather pay those penalties than let our vanity or our pride abate.

* * *

. Does civilisation really make us free, or does it forge for us a thousand fetters as galling as any servitude under the sun ? "Which is it, O Heaven ?" cried the weary man of the world.

* * *

"It is not the shackle on the wrist that constitutes a slave—but the loss of self-respect." Words of profoundest wisdom ; food for deepest thought !

* * *

What care I if roses and myrtles are strewn on my

from the consciousness of wrong. It conjures up a thousand unpleasant phantoms which worry the mind and ruffle the soul.

* * *

Hidden, unseen, ah! what grim tragedies are oft enacted from hour to hour in the awful silence of the heart—tragedies too terrible for expression in words; too stunning for relief in tears. What torments and tortures have the gods devised for man; and all in that brief span which we call "life"!

* * *

In my long experience of the world nothing has struck me as more curious than man's inability to understand his fellow-man; nay, his remarkable ability to misunderstand him.

* * *

One assurance, however oft repeated, is ever fresh and ever new—the assurance of love.

* * *

Old age would have Youth made vicariously wise; but Youth, proud, heedless ever, flings such wisdom aside.

* * *

Possession destroys illusion. It puts a period to romance.

* * *

Be not envious of others; for many, as a matter of fact, are envious of thee.

* * *

Our most fondly cherished hope faileth. We grieve for the moment, and then, in the engrossing occupations of the day, we forget it. Years after we realise that what happened was really for the best. Can mortal vision pierce the veil of futurity; can human wisdom successfully direct the course of events?

* * *

Man is an egoist *par excellence*. He parades his virtues, palliates his faults, magnifies his misfortunes, and sets up his own arbitrary standard of right and

LVIII.

Crown of thorns for the wise, crown of glory for the fool—such has been the popular award since the world began.

* * *

In the temple of my faith, love is the presiding priest; charity the ministering angel; humble thanksgiving the only recognised form of worship.

* * *

With mankind the fear of God has never been so great a deterrent as the fear of scandal and exposure; for God is full of mercy, but man is pitiless and full of scorn.

* * *

Some strive for power; some fret for fame; some seek riches; and some invent new and ever new methods of strife and of courting peril: none seems wholly at ease; for none is really blessed with peace.

* * *

It is success which dazzles the world—no matter how that success has been attained.

* * *

When the Prophet of God declared the *equality* of all Muslims, he manifestly misinterpreted the instincts of the human race which point to *inequality* as the universal law of life. And the result was, as might have been foreseen, that this precept of *equality* soon became a painful unreality, a hateful fiction—the prolific parent of fierce civic strife.

* * *

Whether borne on the flood-tide of prosperity or prostrate at the feet of despair—be what it may—it is soon, very soon, over.

* * *

Nothing amuses me more than the spectacle of power in the hand of a *parvenu*, or of wealth in the possession of one "lowly born"; for both betray themselves—one by his insufferable pride, the other by his ostentatious display.

* * *

The acutest infliction is always that which arises

LVII.

Everything has its price—goodness, wisdom, even the Paradise of the Faithful. For some things we pay in coin of the realm, for others with agony of our soul.

* * *

The most intense yearning of the human heart is the yearning for immortality. Hence the magical sway of religion, since it assures us, at least, of the immortality of soul, if it assures us of nothing else. Yet must we *have* a soul before even religion can assure us regarding it.

* * *

The Earth is reclad and rejuvenated! Spring—what a vision of splendour and loveliness dost thou unfold to weary eyes! Fill full the cup, O Saqi, and bid the sorrowing heart rejoice while it may. For alas! not even thy bewitching blandishments and sparkling cup will induce Time to slacken his hurrying steps.

* * *

What imagination can picture the struggle, the sweat, the shedding of life-blood which existence means to the greater portion of humanity! I have no faith in the goodness of man; and as to the wisdom of Providence, it exceeds my understanding.

* * *

Life is an unresting march to an ever-receding goal.

* * *

It is not the law but the spirit in which the law is administered that matters. Absence of law may be tolerated and endured, but abuse of law, never.

* * *

The rich are the hardest, the poor the easiest to please. A nod, a smile, a kindly word, a warm hand-shake, anything which smacks of sympathy or savours of love, the poor receive with grateful joy. Not so the rich, who receive all that life can give, or love can bestow, either as their inalienable birth-right or as a becoming tribute to their importance.

* * *

always, always accurately draw the line which divides Poesy from Truth?

* * *

God has created woman to humble the pride of man.

* * *

It was past midnight. I sat in the silence of my study musing over life and its vicissitudes. I felt as though a figure, a sheeted spectre, stood before me. "And who mayest thou be?" said I. "A former occupant of this very room which thou callest thine to-night," was the clear, deep-toned answer. And it continued: "Like thee, I, too, called many things mine which really were not mine at all. Like thee, I, too, foolishly sought solution of the mysteries of life and death. Like thee, I, too, fought with shadows and fretted over airy nothings. Like thee, I, too, was a dupe of life, and a victim of many sorrows, mostly of my own making. Like thee, I, too, was a slave of ambition; and like thee, I, too, was chained to a thousand earthly ties. Ah! but death has dissolved the dreams and destroyed the illusions. And here I am free as the air, and as happy as the nightingale." This pretty little speech was concluded by loud, mocking laughter which aroused me from my trance.

* * *

Every one who has read much, thought much, felt much, and has seen the seamy side of life, oft seeks solace and shelter in that loving and confiding companionship which, founded in harmony of taste and identity of pursuit, softens the sorrows and heightens the joys of life a thousand-fold. But like all the good things of this world, it is more often dreamed of than realised.

* * *

Flattery is as varied in form as human nature is rich in types. But the form of flattery that is swiftest and surest of result is the flattery which, assuming our magnanimity, appeals to our compassion.

* * *

witnessed love's exulting joy. And I have also seen, alas, love's glowing fire slowly die. Sweet is the love which fancy fashions—sweeter still the love which cares for no return.

* * *

"What ails thee, dearest? What makes thee shed such bitter tears? Dost thou distrust my love, or in the midst of our joys is there aught thou dreadest?" "I neither doubt thy love nor cherish any fears," said the lover. "But the rapid flight of time—it is this that afflicts and grieves my heart."

* * *

On the tablet of my heart I have inscribed my father's loving counsel: Scoff not at, and treat not with thoughtless unconcern, the advice of thine elders: for, seated on life's exalted dais, they see far—much beyond *thy* limited ken. Spare pain, at least, if thou desirest not to bring happiness to thy fellow creatures. Ever set high ideals before thee, and ever pursue noble aims. Seek not the aid of man, but His alone who neither dieth nor sleepeth, nor faileth those who repose their faith in Him.

* * *

The savage still lurks beneath Civilisation's specious garb, and Barbarism still shows its cloven foot amidst our vaunted order, law, and decorum. Can the muse of history tell us where Barbarism ends and Civilisation begins?

* * *

The Gods of yesterday are but the forlorn and forsaken Idols of to-day.

* * *

True generosity consists in remembering the claims of those that are absent or far away; for every tree sheds its blossom or showers its fruit upon those who seek the shelter of its boughs.

* * *

Seen through the mist of years, do not many, many episodes in life appear like beautiful dreams? And who knows whether they were really dreams? For can we

LIV.

Upon the gate of the pleasure garden of the Sassanides of Persia I found this beautifully pathetic inscription, engraved in letters of gold:

Restore, O God, the dreams of youth, and fulfil a tithe of them!

* * *

Some have described life as the merest illusion; others as the veriest puppet-show. But to me it seems not unlike a Fancy-Fête, where every one tries to disguise himself as best he can.

* * *

Only too often, indeed, is repentance the starting point of fresh sins.

* * *

Nothing grieves me more than the frittering away of time in uncongenial occupations and useless pursuits. I mourn the death of days and lament over the futility of my existence.

* * *

Mankind has always knelt in trembling adoration before Power, and it will continue to do so ever.

* * *

The most opportune moment to attack an enemy is when he is in the wrong; for he can always successfully defend himself when he is in the right.

* * *

What troubles my little tongue has brought upon me! What woeful troubles! And yet it will not learn wisdom and cease to wag.

* * *

I have found envy in the congratulations of friends, want of charity in the judgment of men, treason and betrayal at the shrine of love.

* * *

It is so easy to make friends. It is so difficult to keep up friendship.

* * *

I have heard love's passionate pleadings; I have

enjoyed the blessings of wealth and endured the stress of poverty.

* * *

To husbands women give their hand; to lovers their heart.

* * *

"Father," said a ten-year-old child, in a pleading voice; "father, wilt thou not take me to the annual fair to which all our townsfolk look forward with such eager, expectant delight?" "No, no, child of mine! custom bars thy way, and society fetters thy movements." The child heaved a sigh and said: "Am I, then, for ever bereft of my freedom? Am I, then, for ever doomed to barren, cheerless days? Never more am I to see the sky and the sunlight except through barred windows; never more am I to tread the smiling fields and sweetly-perfumed gardens except as a life-long captive? Never am I to see the world and its wondrous beauty except through veiled eyes? Is this the cruel doom which I must now share with womankind? Is this a divine decree, or the selfish verdict of man?"

* * *

To wear out life in efforts to attain a perchance useless goal, and in the end to perish in a fierce, futile struggle—is not this the lame and impotent conclusion of many a promising manhood?

* * *

I do not know how others feel but I do know this, that at times, for reasons which I am wholly unable to account for, I feel unutterably, supremely sad. Is it the memory of some unrequited love or some demolished hope? Is it the presentiment of some impending sorrow? Or is it the occasional up-surge of the *Weltschmerz* which engulfs man and the world alike in its stupendous, irresistible swell? What is it which, at intervals, so agitates and so agonises the soul? Man, the greatest mystery of creation, is a mystery not only to others but even to himself.

* * *

and wrong?

* * *

"Repent," said the priest, to the dying poet; "repent, for thine hour has struck!" "Begone," said the poet: "begone! I have yet to see whether my sins are great or His Mercy greater!"

* * *

Religion deals with man in relation to God and humanity—laws only with man in relation to humanity. One merely touches the fringe of life; the other rules it from cradle to grave—and beyond!

* * *

With tearful eyes and mournful voice the Saqi (cup-bearer) sang: "Trust not thy secrets and expose not thy grief to others, for nothing endures here; nothing, neither love, nor faith, nor friendship. The autumn follows only too closely on the heels of spring, and lo, in a trice, the bloom and the blossom change into the sear and yellow leaf. And so with all things earthly: A joyous season of love and laughter, and then gloom and darkness for evermore."

* * *

One loss we never fail to feel; one loss we never cease to mourn. 'Tis the loss of youth, that golden period of life when the world lies stretched for conquest at our feet, when hopes are without end and possibilities beyond calculation.

* * *

Hope! It is the one gift for which we can never be too thankful. It is the one gift for which nothing on earth or in heaven can ever be a substitute or an equivalent. It is the last refuge; the only sheet-anchor of sorrowing humanity.

* * *

We never know life until we have borne its trials and hardships. We never know our power until we are tried and tested. We never know humanity—until we have

consummation when Good will be the final goal of Ill ?

* * *

Seldom do we realise how rare are happy days in life.

* * *

Imru-ul-Qais has sung of the joys which a rainy day brings unto lovers ; but is there anything to compare with the glories of a moonlight night ? It inspires sweet melancholy in the old, ardent passion in the young. And who has not, once at least in life, felt its peerless beauty, its intoxicating rapture ? With the Queen of thy Heart by thy side, amidst enchanted nature, basking in the tender effulgence of the moon ; with the dark velvety sky overhead, spangled with stars, like so many fairy lamps, apparently, to celebrate Love's Carnival ; with no thoughts, other than those of love, to mar Love's banquet ; with no sound other than the music of *her* voice, to disturb Love's Litany—there, in that garden of Bliss, Fancy weaves her choicest chaplets, and Love dreams his fondest dreams. But soon, too soon, alas, comes the end ! The night advances, the stars become dim, the moon grows pale and sickly and retires to rest and there comes the bitter, cruel parting—the sweet, sad farewell ! Could that scene, those hours—be renewed ? Could that joy again be ours ? Never : once and once only the curtain lifts, and once and once only we obtain a fugitive glimpse of the Paradise which awaits the Faithful after death !

* * *

I have long, long ceased to pray, for why need we pray to Him who knoweth our wants, forgiveth our imperfections, standeth above our flattery ?

* * *

Truth, application, rectitude of conduct—these are the paths which lead to the sunlit heights of fame.

* * *

What is the history of humanity but the constant adjustment and re-adjustment of the standard of right

sovereign.

* * *

Sobered, saddened, covered with the dust of life, the Shaikh proclaimed : "Wealth has many friends, poverty none."

* * *

With a sweet, passionate caress the lover said : "Thy very own shadow, Beloved, even thy very own shadow arouseth love's unreasoning fears and exciteth love's unsleeping jealousy. For doth not love a thousand misgivings incite ?"

* * *

Dost thou go to Mekka to seek thy God, to atone for thy sins ? Fool ! Dost thou travel so far to seek Him who is nearer to thee than thy shadow ? Dost thou undertake so long a journey for that which lieth within thyself ? Would'st thou find God ? Search thine own heart. For either He or *Shaitan* dwelleth there.

* * *

Veiled in Piety's deceptive mask, the hypocrite defileth the very sanctuary of faith and yet retaineth public esteem ; but I the shaft of public scorn endure since I adore the Liquid Ruby.

* * *

"O Prophet of God !" said an inquiring woman, "hast thou not taught that God loveth human beings more than a woman loveth her new-born babe ? Then, pray, explain : How can He condemn human beings to the everlasting torture of *Gehenna* ?" The messenger of God sat speechless, tears trickled down his cheeks, no answer left his lips. And we—we, with our boasted knowledge and light—what explanation can we offer of those hideous exhibitions of lust, rapine, and destruction which daily and hourly disgrace and desecrate the fairest realms of Civilisation, and convert this beautiful Earth of ours into the veriest Hell ? Should we say with the philosopher : Whatever is, is right ? Or, with the poet, should we look eagerly forward to that glowing

fruitless all—Fate laughs at our supplications and Death at our despair.

* * *

What is our educational system but a gigantic farce—a body without a soul, a show without substance! We load the mind with exploded learning, or crush it beneath the weight of new but useless lore. We turn out neither useful citizens nor sound scholars. Political trimmers and intellectual flirts—these are the products of our thrice-blessed educational system. Training of character and thoroughness of study—it is these that we want; but it is just these that we never find. Let us have less sham, and more real worth.

* * *

The West believes in the freedom, the East in the seclusion of woman; but, curiously enough, both the East and the West doubt and distrust her. The East openly avows its distrust, the West seeks to conceal it in furtive whispers.

* * *

Ah! the irony of a social order which receives the erring brother with open arms, but condemns the fallen sister to an everlasting infamy.

* * *

What man can even vie with—much less outdo—a woman in cruelty, heartlessness, cunning, and vindictiveness? She can reduce cruelty to a fine art; she can act a lie with perfect self-composure, she can betray with the sweetest of smiles, a burning kiss, an enchanting caress. "Venus! lovely Venus! thou art but a she-devil." Sweetest of Israelites, Heinrich Heine, thou didst not exaggerate when thou penned'st those immortal words.

* * *

The West maintains the majesty of law, the East the majesty of the ruler. In the West the sovereign is the creature of law, in the East law is the creature of the

I consider all religions equally good, for they all teach the very same truth, and point to the very same goal—the spiritual regeneration of man. The method of worship is the least important part of a religion. It is the spirit that I value. It is the spiritual force of a religion which counts; its power to uplift the soul, to transform the man.

* * *

How glorious is life, how charming are its accompaniments! but, alas, how soon do they all end! Death is ever knocking at the door with his imperious, inexorable, irresistible summons.

* * *

In the mosque I witnessed the futile wrangles of high-turbaned divines; in the tavern I listened to the ceaseless chatter of merry wine-bibbers; in the streets I met surging streams of humanity astir with hopes and fears. Storm, stress, strife, these I encountered wherever I went in the land of the living. But how different was the hope of the dead, with its perfect peace and unbroken repose! There, there the once trudging pilgrims, released from the fears of the morrow, immune from the weariness of life, rest "unmoved unblest by worldly change." Nothing disturbs their solemn silence, unless it be the tender whispers of the breeze, the adorable confidences of the birds, the grief-stricken voices of the mourners, or the melancholy benediction of the priest. A few more years and the earth will be our vesture too at the last!

* * *

There is a great deal in life crueller and uglier than hell.

* * *

We should neither set too great a trust in friendship nor make too great a demand upon life; for everything falls far, far below our expectations.

* * *

What is writ is writ. Nothing avails against Fate; nothing—neither prayers, nor gifts, nor tears. They are

only is ours. The past is wholly beyond recall, and the future absolutely out of control.

* * *

True wisdom consists in setting a limit to our hopes, and in fearlessly accepting the realities of life.

* * *

Here, on this Earth, there is very little worth a sigh; certainly there is nothing worth a tear.

* * *

There is nothing in life more beautiful, more sacred, more sublime than a woman's love. No sacrifice is too great for it; no ordeal too heavy; no trial too terrible. Torture and torment and agony and death—it tramples them all underfoot and laughs them all to scorn.

* * *

The greatest fault of bureaucracy is its over-weening self-confidence and its want of confidence in the people.

* * *

We hear of towns captured and countries conquered, but we forget that conquest of countries does not necessarily mean the conquest of heart and soul. And yet what conquest is worth two dirhams which only holds the conquered at bay either at the point of the sword or by fear of the gallows? True conquest is the conquest of the heart—the fruit and flower of which are love and loyalty; love and loyalty which will shrink not and fail not at the imperious call of duty. But, of a verity, that true conquest is never secured by the roar of cannon, nor by the use of high explosives. It is the outcome of mutual forbearance and mutual sympathy mellowing and ripening, year by year, into that perfect oneness of purpose between the rulers and the ruled which all governments devoutly aspire to, but only a few attain. The sword perishes, but love endures.

* * *

Amiel's Journal—it is the cry of a soul, smitten with despair, at the utter hopelessness of ever realising the cherished ideals of life.

* * *

This truth was forcibly borne in upon me the other day when I witnessed a religious procession, which I was wont to do with a friend now no more. With what fond love we used to look forward to the day! What joy was ours! What dear delights! What exuberant, overflowing enthusiasm! Was it the procession or the loving companionship which called forth those emotions? Not the procession, to be sure, for the procession was as gorgeous and as spectacular as ever. The sun shone as splendidly this time as it had ever shone of yore. The crowd was as gay and jubilant as ever, and the show not a whit inferior in its glorious display to what it had always been in the past; but alas! to me it was not the same, by a long, long way. The seething mass around me were full of joy, warmth, and sprightliness, but my heart froze within me. The past rose before my vision. The dear figure of my departed friend floated before my mind's eye—a thousand little incidents came crowding into my memory. I felt a mist rising over my eyes. Tears fell one by one—those sacred tears which well from a despairing heart, and which are the only true comfort and consolation of our frail humanity. And there, what I saw through the lens of tears was not the actual, stirring scene around me, but the dim, faded portrait of the past. I felt then as I feel now—the heart-ache which that loss has caused, and the sense of forlornness which that loss has meant. Beloved memory—how I greet thee and kiss thee—for thou, and thou alone, canst repair the loss which life and death daily inflic upon us, and thou alone canst bring up before ou vision the days that are no more!

* * *

Flowers fade and mind decays; beauty dies and love grows dim, and we feel, as we grow older and older, the tyrannous stamp of mortality. Ah! even the meridian splendour of the sun sets—and all too soon!

* * *

Unspeakable folly it is to wear out life with past regrets or future cares. The present, the living present

there, but in her age-long traditions, in her own light and leading.

* * *

The rose and the tulip give us but an earnest of the priceless treasures secreted in the earth below. Whose dust and ashes are these that have blossomed forth into a sweet-scented rose, or a crimson-clad tulip? Perchance a king's, or a queen's, or a prophet's, or those of some unhappy lover of yore who bled and died and was born again, no longer to shed tears or to endure agonies, but to mock at earthly glory and human splendour, and to whisper in the silence of the garden to the moon and the stars its tragedy of love. Yes, whose dust and ashes are these that have been fashioned thus with fairy hands, and have been touched thus with divine breath? Whose? Who can say?

* * *

Every human life, however humble, is a study, an intensely fascinating study, revealing the strange ways in which life shapes itself and destiny works out its end.

* * *

It has been said "revenge is sweet"; but we believe no more in the gospel of retaliation. Its reign has ended, and in its place a more just, a more humane, a more generous gospel has been enthroned, which inculcates the return of good for evil and which emphasises the necessity for kindness, forgiveness, and charity. And, forsooth, what punishment is heavier or bitterer than that which leads the evil-doer to remorse and repentance? Repay, therefore, an evil-doer with kindness, and shame his wrong with a generous magnanimity.

* * *

No one is necessary in this world—no, not one. The world goes its accustomed ways and men pursue their usual vocations—death notwithstanding. And yet what man has walked the Earth who has not felt at least one loss as a loss that has marred for him the charms of existence; that has caused a gap never to be filled up; that has bruised or broken the heart beyond repair?

Men rarely forgive, women never. To forgive requires the conquest of passion, self-control, and a spirit of charity which are seldom found united in any mortal compact of common clay. And it is precisely because it is so hard to be completely generous in forgiveness that mankind have looked upon "forgiveness" as the distinctive attribute, nay, the very essence of Divinity.

* * *

Women fight and subdue us with tears; those welling, gleaming, streaming but at times false tears which are so pitiful, and are yet so powerful in their effect.

* * *

A cloudy day is a day most suited to my melancholy temperament. The sunshine never or rarely cheers me. In fact, it tends to depress me to an extraordinary degree, since I regard it as an emblem of the transitoriness of all things terrestrial. But the rain and the clouds—oh, how I love them. They are symbolic of life. The one represents the gloom and the misery and the darkness of the world; while the other stands for the sob and the wail and the tears of humanity.

* * *

Man is a hypocrite of the most consummate type. Even his sympathy is not always free from alloy. Sometimes it is even a poisoned arrow, wherewith he attacks all the more effectively him whom he cannot, or perhaps will not, openly assail. Nay, ofttimes his sympathy with one is but criticism of another.

* * *

In the wave of materialism which, in recent times, has swept over the East, the East has lost everything that was distinctive in her. She has lost her lofty ideals, her spiritual calling, her intellectual ardour. She has become, in fine, a moral bankrupt, with her sun of glory set, and the garnered hopes of ages gone. Can she thrive and win back her lost heritage? Yea, verily; but not by sedulously playing ape to the West. No, not in that direction does her path of glory lie; not

the mind which passively accepts things on trust and which shrinks from sifting and testing them in the light of reason. Was it not an ancient sage who said, "An unexamined life is not worth living"?

* * *

A relic, a memento, a friend seen after years of absence, a beloved spot revisited, any one of these might set aflame the smouldering ashes of memory. What conflicting emotions of joy and sorrow they evoke! With what suddenness and swiftness the past flits across the mind! In a moment we traverse years, and, in a flash, as it were, a thousand scenes from the closed chapter of life unroll themselves; "rapid, vivid, dumb like a dream." Who can unlock the secrets of the human heart, or explain the mystery of the human mind?

* * *

Time takes the flavour out of everything. Nothing remains the same in life. The pleasures of yesterday fall flat to-day, and all the beauteous things once so dearly loved suffer, and suffer grievously, from the process of decline and decay.

* * *

What fascinates and finally conquers mankind is the unshaken strength of purpose and calm unflinching courage which, rejecting compromises, secures the triumph of their cause.

* * *

To me the 'Id is a day of intense grief. It is on that day, more than any other day in the year, that I feel and realise with bitter regret the ravages wrought by Time, the havoc played by Death, that "great spoiler of life's feast," the difference between hopes cherished and hopes fulfilled. The day of the 'Id to me is a day of stock-taking, and therefore a day of deep dissatisfaction, intense mental pain, and sorrowful recollections.

* * *

In practical life we are standing witnesses to the falsity and hollowness of our faith and profession.

* * *

Its soil is more congenial to the birth of prophets and reformers than is that of the West. Hence it is that all founders of religions have come from the East. The West fashions political theories, busies itself with the art of government, strives to perfect material resources, and cheerfully looks forward to the future; religion is but a distraction to vary the monotony of its daily or weekly routine. The East concentrates its attention mainly upon the life to come. It looks upon this life as a vanity, a mere moment in annihilation's waste, a thing too transitory and contemptible to think or worry about. It cares not for law, or constitution, or material progress, all of which it regards as wearisome necessities.

Should we find fault with the splendid simplicity of faith which seeks to propitiate the Deity through the intervention of departed saints? Should we condemn the custodians of temples and the guardians of tombs who unblushingly trade upon the credulity of the masses? Should we hold up to scorn and derision those quaintest of superstitions and those oddest of crudities which flourish here with such tropical luxuriance? No, we should not lay our hands on beliefs and practices and traditions consecrated by time. Let everything continue, but let the claims of the present be acknowledged and its dues paid. The prizes of this world are as much worth striving for, and indeed are as much worth winning, as are the prizes of the world to come. Let us have prayers and fasts and vigils and banquets in honour of the dead. Yes, let us have them, by all means, but let us have along with them that true worship, the worship of God, which finds expression in the discharge of our duties, in the fulfilment of our trust to this generation and the generations to come, in lightening the burdens of sorrowing humanity, in alleviating the miseries of life, in charity, good-will, and love unto mankind.

* * *

Nothing is more contemptible than that attitude of

XLI.

Freedom is an exacting goddess, with sword in one hand and the scales of justice in the other. She reddens her path with streams of blood and records her triumphs in letters of fire. She enlarges the legitimate sphere of the liberty of man, and restrains his wild, selfish impulses. She never can subsist without the spirit of obedience and forbearance—the two highest spiritual lessons which only centuries of careful training and severe discipline inculcate and enforce. The highest state of freedom will mean the completest restraint upon the savage, brutal instincts of man.

* * *

The greatest pleasure is always the pleasure derived from half-satisfied or unattained delights. The greatest joy is always the joy which the anticipation of the joy brings. The brightest hope is always the hope which never is, but ever *is to be* fulfilled. Satisfaction, realisation, fulfilment, these always reduce the ideal to the level of the commonplace. Reality never has any charm. It is in the world of imagination that the paradise of milk and honey lies. " A book of verse, a jug of wine, and thou ! " I doubt if even these things would long continue to afford relief against the weariness, ennui, and unloveliness of this world.

* * *

We are more charitable to the dead than to the living. The dead will not tread on our corns, the living may.

* * *

I love the East, the sunny land of implicit faith and charming credulity, the land where conventionality has not yet acquired the force which it wields in the West, and where, therefore, the most diverse and contradictory types of humanity live and thrive, side by side, undisturbed and undismayed. No, we shall never have here the conventional uniformity of the West. The East is unconventional, and therein lies its greatest charm. It is disdainful of the present. It thinks little of this but much of the other world, the world beyond the grave.

yet what man who has read thee aright has failed to read in thee the eternal note of sadness, "sadness at the doubtful doom of human-kind," and has not been stirred to fiercest wrath against the wearisome wrangles which religion, stripped of its beneficent influences, invariably provokes? Thy piercing and critical eye detected and exposed false traditions and impossible loyalties. To thee 'twas given to feel and to express, in bold and fiery language, the salutary spirit of revolt which, together with the spirit of obedience and reverence for constituted authority and time-honoured institutions, forms the life of humanity, and the constant clash of which marks its various stages of growth and development. The conflict between these two opposite forces can never cease until the end of time. And thou, O Omar! Thou wilt for ever live enthroned in the hearts of humanity as the warrior and knight who fought, and fought successfully, against the forces of darkness and the demon of ignorance.

* * *

As we grow older and older our faith in the goodness of man is shaken more and more. We discover pride among the preachers of humility; vice in the sanctuaries of faith; fraud and deception in the ostensible homes of truth and piety; and alas, malice and ill-will where naught but love, virtue, and purity should have reigned.

* * *

Ideas which enrich and broaden and illumine the mind are, in the nature of things, slow to grow, and slower still to mature. They are, so to speak, the torch by which the Almighty guides the groping steps of humanity. But what a toll they exact; what sacrifices they involve, before they become living, moving, palpable realities!

* * *

Only too often, alas, the measure of our love is the extent of our self-interest.

* * *

most of our fond schemes and plans and calculations—apparently so well founded, yet founded on sand!

* * *

"Call no man happy until he is dead." How pregnant with truth is this saying! At no period of life are we really, positively happy: in childhood tears; in manhood soul-destroying cares and inexpressible anguish; in old age infirmity and settled regret!

* * *

Seldom are we ready to admit our faults, or to acknowledge our mistakes; especially so, if they are incurable or beyond redemption. Admission would be but a confession of our guilt, or at least of our folly, and such an admission is never really acceptable.

* * *

We sat face to face. We talked of days gone by. We embraced with a sigh. We parted with tears. To share a common joy is delightful. To share a pleasant memory is more delightful still. And yet one is full of laughter, while the other may be full of tears!

* * *

Thou prince of poets! Shall I say of philosophers too? O, Omar of Nishapur, to thee I bring my humble tribute, and my own little offerings. Thou hast wrested a laurel crown and adoring admiration from the two hemispheres. Wherein lie thy unfading glory, thy unfailing source of strength? What is the secret of thy conquest? Is it the grace or elegance of thy language, or the sweetness of thy thought, or some ineffable aroma which hangs over thy Quatrains? No! Sweeter melodies, deeper thoughts, more soul-stirring songs the world has known. But to thee 'twas given, as to few others, to look beneath the surface of things and to appraise them at their true worth. Thy Rubā'iyāt sparkle with wit and humour, and sting, at times, with the sharp bitterness of truth. They breathe an air of ease and gaiety, and seemingly suggest contempt for and disregard of the vexing problems of life and death. And

thy worshippers stilled; for thine is the altar which is most sought after. Thy sway on Earth is unquestioned. What will humanity not do for thee? For thee it barters away its soul; for thee it surrenders its body to infamous thraldom; for thee it uproots and effaces life's deepest, holiest ties. Thee it worships, for with thy aid it unlocks the iron-barred gates of life which lead to the terrestrial paradise and the land of perpetual sunshine. O Dispenser of Pleasure, what is the nature of thy power? Is it divine, or diabolic? Tell us, O tell us, the secret of thy power!

* * *

Why need we fear death? Is it not a happy release from the bondage of life; from the weariness of the flesh? It is surely the end of one, and the beginning of another, career—a career possibly brighter, more spiritual, less tainted by sin, or less disfigured by sorrow. And if that be not so, it is unquestionably an eternal sleep; free from dreams, and beyond the possibility of a rude awakening. We should rather welcome than dread death; for at least it sets a limit to our unhappiness if it does not open for us the prospect of endless joy.

* * *

The world has no charm and life has no joy for me. I am weary and footsore, and long for rest; but rest I do not find. The sun shines, but only to scorch my wounds. The moon sheds its soft and gentle gleams, but only to emphasise my wretchedness. The stars, in their resplendent repose, do but smile at my fretful, feverish, ineffectual struggles. Out of tune I feel, with man and nature alike.

* * *

I planted some precious cuttings. I looked forward to their bloom. They rapidly grew, but when they had almost reached flowering-time, I had to transplant them. Their petals dropped one by one. They lost their emerald cloak. They became bare and bald. The long-looked-for bloom never blew. And so it is with

XXXVII.

I often wonder what purpose I was meant to serve, what destiny I was intended to fulfil. Why was I brought into this world? Why? Since I have sown nothing but furrow after furrow of sin, I have reaped nothing but a harvest of woe. I have contributed to the happiness of none, though I have inflicted pain upon many. A wholly useless existence has been mine—an existence without aim and without purpose. Fate plays with human life as children play with toys.

* * *

Broken health and more than an ordinary mortal's share of suffering—that is all the dower that heaven has been pleased to bestow upon me.

* * *

Unmoved by tears, heedless of prayer, severe and pitiless, the years go by, leaving behind a hecatomb of hopes blighted, friendships betrayed, love unrequited, hearts broken.

* * *

We discuss, we ponder over matters of trifling concern; but almost invariably we are thoughtless and reckless when confronted with the momentous issues of life. Hence so much misery, so much sorrow. And O, how quick we are to fasten upon Heaven the consequences of our own sin and folly!

* * *

We forgive, nay, sometimes admire, the faults of the rich, but we condemn the very virtues of the poor; for "indigence is the death of the soul." What atoning power does wealth not possess? What force, what magnetism, what permeating influence? It invests its owner with a robe of shining glory. It makes him an object of grovelling devotion and stridently vocal laudation. Thrice-blessed Mammon! What mysterious fascination, what esoteric attraction is thine! Before thee humanity unceasingly bows down; at thy shrine it offers its whole-hearted devotion. Ever-ascending is the incense there burnt; never are the whispers of

is our permanent possession, and their memory our joy for ever?

* * *

Not very long ago I visited a Muslim Library. What mournful reflections it evoked! It brought before me a vision of the past in all its radiant splendour. There, so to speak, the history of Islam unrolled itself before my dazzled eyes. There I saw its culture, its civilisation; beautiful, brilliant, and many-sided. There I realised the strength and the weakness of the Muslim empire; and there I saw, as nowhere else, the wrecks left by the tides of time. As I gazed upon the treasures spread out before me, I reflected upon the varied vicissitudes that must have been theirs. How many hands had they passed through? What wondrous tales could they not tell if only they had tongues? Where were the emperors, the rulers, the dignified courtiers who at one time owned them, and gloried in them? Where the palaces which frowned majestically upon the passer-by? Where *now* their pomp and politics? What availed *now* their lordly halls, their crowded ante-chambers, their buzzing corridors, and all their apparatus of rank and riches? Their power is laid in the dust, and their glory has sunk in deep decay! And what has survived? Naught save the intellectual achievements of the Muslims. Those who confronted the blows of destiny; those who fought against poverty and distress; those who suffered sorrow and neglect; it is they and their work that now command our allegiance and receive our loyalty; allegiance and loyalty the like of which never fell to the lot of their patrons or the scoffers of their day. Those dead and sceptred sovereigns of the mind—it is to them we offer our homage at a Library.

* * *

The secret of the best friendship, as of the most enduring attachment, lies in that sweetness of disposition which, avoiding conflict and collision, gives way at the right moment to the wishes of others.

* * *

of Alexander Severus are the truest commentary on life.

* * *

Discontent—I regard discontent as a healthy, hopeful sign of national progress. Absolute acquiescence in or unquestioning acceptance of existing circumstances means not only the death of hope but it also means the death of national life. Discontent indicates impatience with the existing order of things and points to a desire to approximate to a higher and yet higher ideal. Was it not an English philosopher who said: "A pig dissatisfied is better than a man satisfied"?

* * *

Envy is the poison of the Soul.

* * *

The greatest benefactors of humanity have been the most daring rebels against the enslaving conventions and inherited social and religious laws of the day. Acquiescence is the lot of the majority; defiance ever the glory of the chosen few. Was it not this very spirit of intense, passionate revolt which broke out at Mount Sinai; which shone at Calvary; which set Kaba ablaze? Never will this light be extinguished, never will this spirit die, while Time endures.

* * *

Truth is eternal. It never loses its freshness. It will bear iteration and reiteration.

* * *

How difficult it is to shake off an idea, however unreasonable, when once it becomes fixed in the mind.

* * *

It is the sense of righteousness, and righteousness alone, which freshens the weary path of life.

* * *

What other gift than tears, bitter, passionate, burning tears, visible tokens of grief, wrung from the heart; what other gift than tears can we make to those who have passed beyond the gates of Time, but whose love

tragedy; heroic self-sacrifice and incredible pettiness.

* * *

Human foresight has never changed the course of destiny.

* * *

"What is hell, O Shaikh?" I asked. "It is what we make it," said he. "It is the storm, stress, and strife of life with their usual concomitants: disillusionment, disappointment, despair. And Heaven," he added, "none other than sweet, joyous contentment with our lot."

* * *

I have witnessed the sunrise and sunset of hope. I have known the agonies of a soul in the grip of despair. I have tossed through sleepless nights and struggled through cheerless days. I have known, in fact, suffering in all its various hues. And I am all the wiser and better for them. Life is an education, a period of probation, a preparation for a higher and nobler existence; and through the portals of suffering must we needs pass, ere we reach the goal for which we are destined.

* * *

"More light!" These are the words, the last solemn words, of a great Western sage. Yes, more light! More light for evermore! We can never have enough of light; and what is the progress of humanity but the breaking of fresh light, full light, and yet fuller light, on the doubts, difficulties, perplexities, and obscurities of yesterday and the day before?

* * *

Would you have proof of the falseness and fickleness of Fate? Look, then, at the royal palace, and count on your fingers its various occupants and their varying tenures. Tenancy-at-will—a mere tenancy-at-will—liable to be determined at any moment; that is all our life is worth, and nothing more!

* * *

"*Omnia fui, nihil expedit.*" These melancholy words

to the interests of a larger whole—these necessarily imply an immunity from a two-fold yoke which the East has never wholly escaped: sacerdotal tyranny and royal despotism. The accepted political doctrines of the West have never been aught but treason in the East; the searching, questioning spirit of the West has never been aught but audacious impiety in the East. Kings claim our body, and gods our soul.

* * *

We all possess a reserve of strength and fortitude of which we are rarely conscious. It comes into play in the enduring of a sudden reverse of fortune, or in fighting a long, lingering illness. We are always better for experiences of that nature. We rise from the one as from the other—exalted, chastened, purified. Our sympathies are enlarged; our sense of other people's sufferings is quickened; our own littleness is emphasised and our small social circle is tried and tested.

* * *

To expect is to court disappointment. Expect not, and you will not grieve. Take things as they come, and pursue the path of life with steady, unfaltering steps. Transient are Spring and Autumn alike. In one the flowers bloom and fade; in the other the leaves wither and fall.

* * *

Down, down the vale of years we descend, with sighs and regrets and tears over time wasted, opportunities lost, work undone, and ideals shattered!

* * *

The mightiest passion subsides and dies when it has to contend against continued or prolonged absence, neglect, or indifference.

* * *

We grow older and older year by year, but our hearts never lose their buoyant hope or their youthful freshness.

* * *

Every human life—carefully scrutinised—will reveal a marvellous compound of lofty romance and despicable

of prejudice, it is *her* triumph, that proclaims at every step.

* * *

Women are more obstinate than men, because they are less amenable to reason, and more inclined to folly.

* * *

Assess the worth of a man and treat him accordingly.

* * *

Does not life teach us the short-sightedness of our vision and the worthlessness of our wisdom?

* * *

Full speed ahead in season fair, dead stop in weather foul—sport of destiny—what pranks she plays with the tiny barque of my life! She shortens the days of joy. She lengthens the hour of woe.

* * *

Life without love is as a day without sunshine.

* * *

Though I only too often assume the mask of happiness, I am never truly happy except when I am absolutely oblivious of my existence; that is, when I am either absorbed in a book, steeped in an idea, or lost in a dream!

* * *

There are certain confessions which can never be made; there are certain secrets which can never be revealed. Prudence sets her seal upon them, and we can only break it at our peril.

* * *

People accustomed to freedom will find nothing more striking in the East than the utter absence in the Oriental of that burning love for country and its true interests which is the distinctive greatness of the West. I doubt if, in the East, the idea of a common purpose has ever progressed beyond a very rudimentary stage. Never, perhaps, apart from religion. The love of country—pure and simple; the love of freedom for freedom's sake; the voluntary surrender of individual interests

right '—in these words the entire philosophy of honest-living and right-thinking is truly, pithily, forcibly summed up."

* * *

How shadowy and illusive is our quest for happiness! We never find it by mere seeking—seek as assiduously as we will. It comes without our invitation, and goes against our will. It gilds the cottage, and fills the palace with its sunshine. But oh, how provokingly brief and transient is that ineffable light!

* * *

The older I grow the more clearly do I realise the two central facts of life: the futility of our efforts, and the tender and loving watchfulness of Providence.

* * *

Years ago when the weight of sin did not press upon me as heavily as it does now, I visited a great Shaikh celebrated alike for piety and learning. I went to him with a two-fold purpose, to obtain his blessing, and to receive his guidance along the thorny path of life. And the advice that he gave me was this: Take the joys and sorrows of life with an imperturbable calm. Let not prosperity turn your head nor adversity crush your spirit.

* * *

Love—'tis the efflorescence of our best passions. 'Tis a vision divine, seen once and once only in life.

* * *

Nowhere have I found greater comfort and truer consolation against the ills that chequer existence than in the company of books. They put my sorrows to sleep, they detach me from my sordid surroundings, and lift me out of myself. I would love to be buried under the shadow of a great library.

* * *

Prejudice—what a tremendous force it is in life! How it shapes and alters and deflects our judgment! How contemptuous of reason and common sense is the ordinary man when prejudice enters into competition with reason and common sense! It is the triumph

perience, and knowledge of humankind. They . . dently ignored the varying temperament of man and the shifting ideals of the successive phases of life. They have made their own standard the standard for all times and for all peoples. Ah, the short-sightedness of the prophetic vision; the folly of our would-be architects!

* * *

Baqr 'Id! What a carnival of blood! What a revelry of sacrificial rites! Surely, surely, the great God—the loving and merciful God—cares not now, if He ever did in ages past, for those streams of blood, or the inexpressible sufferings of those groaning victims! Atonement! No longer need we atone for our sins by sacrifices; for God and man alike have changed with the changing wheels of time. No atonement, in sooth, can be of any worth which involves pain or suffering to the least of sentient beings. The only real atonement is one that takes place in *one's own* heart—a change in *our attitude towards life*. The religion of the future will discard crude and cruel methods of atonement. It will look with pitying contempt upon the days when sacrifice was always the sacrifice of something, of some one, *other than one's self!* It will inculcate atonement by repentance of the heart and mind; for does not true repentance cleanse the body, purify the mind, and carry the penitent nearer and nearer to that supreme goal to which humanity is painfully but surely moving—the spiritual perfection of man?

* * *

"Teach me, O Shaikh, that philosophy which will banish fear and cure the ills of life." "It is our mental attitude," rejoined the sage, "which makes us masters or slaves; lords or serfs of existence. Passion, covetousness, lust of power—these degrade and dishonour us. Subdue and conquer them, and you will have no fears to make you weep; no qualms of conscience to disturb your inward peace; no dark forebodings to combat; no ghastly visions to dread. 'Follow light and do the

a faithful transcript of nature. In Eastern literature man appears either at the shrine of love or at the altar of divinity. Mist and darkness beyond. The greatest debt which the East owes to the West is the awakening of the critical spirit in the Eastern mind. It has brought with it, indeed, unrest and discontent, but it has opened up boundless prospects and unlimited hopes for the future. O dawning Spirit of Enquiry and Criticism, I salute thee and welcome thee! It is thou that leadest humanity on and on in the paths of progress, freedom, and enlightenment. What is the civilisation of Europe but thy very own flower and fruit? What is the stagnation of the East but thy neglect and indifference?

* * *

I sat in the garden, surrounded by smiling flowers and dancing leaves. Not a voice was there to jar upon the ear; not a footstep to disturb the stillness of that solemn eventide. I sat in solitude, thoughtlessly watching the birds that soared overhead, the clouds that rested along the horizon; enjoying the soft, rapturous caresses of the evening breeze, until darkness deepened and deepened into the blackness of night. To be out in the country and away from the strife of the world; to be at a spot where innocence dwells, and where vice stands rebuked; to be in the embrace of nature, and at a distance from the haunts of men consumed by mean ambitions and fevered with the lust of power—Ah, what heavenly peace, what vision-feast, what spiritual experience, and what joy divine!

* * *

I have a horror of paradise, a genuine horror indeed. And who would feel otherwise for a place peopled by sexless *huris*, disfigured divines, emaciated hermits, and howling dervishes? Allah be praised! It would be more like a madhouse or a menagerie than a haven of rest or an abode of everlasting bliss. The makers of paradise were lamentably lacking in imagination, ex-

the spirit of compromise, and that supremest of all lessons—the spirit of resistance to all demands inconsistent with the dignity of man.

* * *

Why does goodness suffer and wickedness thrive if there really is the rule of right? Goodness is merely tried and tested and purified by suffering in order that it may shine with all the greater brilliance and proclaim with all the greater force its fadeless, ageless, deathless glory. But wickedness bears not the light of day. Its reign is shortlived. Its day of reckoning is ever close at hand. It is merely a moment's flash, and then darkness utter and absolute. Goodness, on the other hand, is not unlike sunlight, gilding the heaven and brightening the earth with its genial, joyous warmth and light.

* * *

Ah, the bitterness of vain regret, and the restlessness of hopeless longing!

* * *

I never can understand the pride and insolence of man; for what is man but a handful of dust and ashes? What are his powers but a derision to heaven? What is his greatness but an illusion and mockery? Let us be kind and forgiving, for the world is full of gall and bitterness.

* * *

Ever in thrall to soul-cramping traditions, the Eastern mind has never developed critical power to any serious extent. Of this fact its literature offers a striking illustration. There, you have wealth of imagination, splendour of word-painting, gorgeous flow of language, glory of sustained eloquence, delicacy and subtlety of thought; but never by any chance have you that mature vintage of experience—the criticism of life and its thousand and one ramifications, never have you anything approaching that critical literature which is the pride and possession of the West alone. Never have you the full-length portrait of man, or anything like

the learned but the never-ending pursuit of an ever-receding goal? Humanity never will be satisfied; never, give or take away what you will.

* * *

We are always the wiser and the richer for our experience; for every experience is a fresh lesson learnt in the school of life, either exposing some falsehood or correcting some error of judgment.

* * *

We are ever longing for a change, even though it be for the worse. Such is the perversity of human nature!

* * *

A woman's life—it is generally made up of toilet, gossip, fault-finding, or love-making.

* * *

Pride, Jealousy, Covetousness—these not only mar the happiness of life, but also arrest the spiritual growth of man.

* * *

Wherein lies the superiority of the West over the East? Surely in its strength of moral purpose, in its unflinching sense of duty, in its recognition of the claims of country and humanity, in its altruistic conceptions. Life in the East is too self-centred, too narrowly circumscribed. Self and the family absorb and exhaust Eastern sympathy. Beyond self and the family there is no duty to discharge, no obligation to incur.

The East has never known disinterested sympathy and broad-based toleration. She has never nourished high-souled patriots, or divinely-inspired martyrs for a political ideal. She has never conceived, nor could she ever conceive (as things have stood with her), the parliament of man, the federation of the world. She has always, always raised up social walls, splitting humanity into fragments. The East has much to teach, but she has also much to learn, and much more to unlearn. As a return for her spiritual gifts and religious teachings she may learn from the West the art of living,

the Earth and bringest unto them rest, sleep, peace of mind, tranquillity serene,—thou, sweet Comforter, what hast thou brought unto me? Any cure for my pain; any consolation for my sorrow; any hope to my deathless gloom? No, thou hast ever brought unto me food for melancholy thoughts, and with it bitter tears to shed. These and these only have been thy bounteous gifts unto me.

***

In the throes of a crisis; during the struggle against adversity; in the hour of peril, or in the moment of despair —what fervent prayers, what pious vows, what stern resolutions, in short, what good intentions are ours! But no sooner does the cloud roll away and the sunshine return than we revert to the old familiar ways, the apparently unforgettable ways—the ways of sin and folly.

***

Life is full of perplexing riddles. Some we solve, some we only half solve, and some we carry unsolved to our grave.

***

A great passion consumes everything, even itself.

***

At times a sense of impatience with existence, a longing for the end, comes over us. Then, indeed, our hopes centre no longer on anything that life can promise, and our thoughts are irrevocably fixed upon death—the only solution of life's insoluble problems.

***

Jealousy is the cruellest weapon forged by the devil for the destruction of the human soul.

***

I envy the ignorant; I envy their confidence, their faith, their simplicity, even their very ignorance. I envy the poor; I envy their limited wants, their capacity for endurance, their touching resignation. What have the rich but gilded chains and golden sorrows? What have

apprenticeship is the lesson :

Vanitas Vanitatum, nil nisi Vanitas.

* * *

Social inequalities always weigh heaviest, because they assail us at every step of life. Political disabilities may be overlooked and even at times justified, but social inequalities, never.

* * *

There is no such thing as absolute despotism. The greatest despot can only go up to a certain point. Beyond that, resistance, rebellion, anarchy stare him in the face.

* * *

It is astonishing how easily we accommodate ourselves to circumstances and become reconciled to our fate. How quickly, for example, do tears dry up, and wounds caused by bereavements heal? Nothingness and Oblivion—the two words which contain world-wisdom—should be written in letters of gold.

* * *

The evening of life is almost invariably a satire on the eager, brilliant hopes of dawning manhood.

* * *

Those dwellers in the quiet valleys of existence—peace be on them !—what sweet reasonableness, genuine affection, unpretentious piety, what a spirit of self-sacrifice have I found among them ! What a strange and striking contrast do the mansions of the rich offer ! We behold in the one the strength of religion ; in the other we see the temptations of wealth, and the fall consequent upon those temptations.

* * *

In my Utopia only those will administer Justice who have no interest to serve ; no prospects to mar ; no account to render, except at the bar of conscience ; no homage to pay, except at the altar of righteousness.

* * *

Thou, the healer of aching hearts, the confidant of lovers' inexhaustible secrets ; thou, O Night, who in thy caressing embrace enfoldest the weary pilgrims of

how to get ahead of each other? Competition and rivalry—these are the two articles of modern faith.

* * *

In childhood's innocent days I frequently heard that Justice was blind, and that she was no respecter of persons. In the Palace of Justice I found her cured of blindness, nay, possessed of a remarkably keen vision—specially so as regards the dignity of the *Muhtasib* [1] and the prestige of the *Shah*. I even saw the thrice-blessed Goddess of the Mint near her exalted throne, with her wonted witchery and caresses. In short, I found Justice, as administered, very different from Justice as conceived and described in legends and fairy-tales.

* * *

We condemn in others what we ourselves do every day of our lives. Such is the splendid hypocrisy of man—patent, unabashed, unblushing!

* * *

The goodness that I value is the goodness of the heart—not the counterfeit goodness which flutters on the lips.

* * *

Alone and aloof from the excitements of the world, I stand sorrowing, watching things profane and things divine. I seek to read some meaning into life, but my quest is wholly vain. Life seems to be a cruel chaos, a blundering chance. Laughter is but the precursor of tears, and joy a harbinger of sorrow. Everything appears to be misplaced or out of place. Learning never, or if ever, then only rarely, is conjoined in amity with wealth, power with sympathy, and principle with practice. Fools adorn the courts of princes, rogues those of the *Kādi*, and eunuchs feast on the charms of the *Harem*. It is a huge tragi-comedy this life of ours.

* * *

I betook myself to the sages, both ancient and modern, and at their feet I amassed learning and gathered wisdom, and the net result of many years of laborious study and

[1] Police.

waywardness to scorn.

* * *

Our ideals soon vanish when they come into contact with clay and mortality.

* * *

Self-satisfaction is the surest sign of degeneration. It is the restless and dissatisfied spirit which moves onward on the path of progress as a pioneer in the realm of thought and in the sphere of action.

* * *

The greatest conquest is the conquest of self.

* * *

The majority of mankind pass through life without thinking. For them life is a mere routine, a daily round of business which they get through mechanically, or of pleasure in which they riot. Thinking is too painful an operation for them. They shrink from it, and passionately cling to the traditions, beliefs, and faiths of their forefathers. To strike out a new path is the privilege and prerogative of the few, and they are the heralds and pioneers who hold aloft the torch for the benefit and guidance of their fellow-men. All honour and glory to them, for they fertilise the earth with their blood and sanctify it with their sufferings.

* * *

The Middle Ages believed in the Wager of Battle as one of the approved methods of establishing innocence at a criminal trial. The modern world has rejected that belief. It has found that the mediæval faith in a merciful Providence, who would never see anything but truth triumph and falsehood laid low, was an untested and unverified piece of optimism, contradicted and wholly demolished by its own riper experiences, which point to the conclusion that it is not might that is right, but that might should ever maintain the right.

* * *

The glowing vision of universal peace is too brilliant ever to be realised on this Earth, where the most vital question always is, with nations as well as individuals,

imparting confidence.

* * *

Be not eager for anything in life, for there is nothing certain here except death.

* * *

Trust in God is the one true support against the evils and afflictions of life. It is the one belief which makes life bearable and possible.

* * *

The majority ever lend a willing ear to ugly rumours. Not so with good reports. There is a secret and malicious delight in hearing of the misfortunes of others. An unmistakable proof that goodness is not a natural but an acquired virtue.

* * *

No wrong ever goes unavenged. Punishment may be slow in coming but it is ever on its way.

* * *

Nothing is more chilling than a weary succession of days cheerless and barren of hope.

* * *

Life's deepest lesson is vanity. Life's most precious gift is the memory of a great joy.

* * *

Nothing wears out life more than the anticipation of trouble.

* * *

Life is but a series of irremediable blunders. Success hides them, failure reveals them.

* * *

We are so optimistic by nature that even when sunk in the deepest slough of despond, we never, or at least rarely, lose hope. We anxiously await a turn in the wheel of fortune, but how often in vain!

* * *

Naught but a true religious spirit can give us that inward joy and sweet content which laughs the world's

the past and heedless of the future. The man of imagination has three-fold sufferings to face and endure: the sufferings of the present, of the past, and of the future. But the worst fears, like the best hopes, never or rarely come to pass. They flit across our path terrorising and perchance paralysing us.

* * *

Freedom of thought is the starting-point of human progress. Once thought is free, human progress is assured.

* * *

Expectation—there is a curious intermingling of hope, doubt, and despair in it.

* * *

We rarely get, at the right moment, what we fondly wish for. In many cases it never comes at all; and, even if it does, 'tis at a time when much of our joy therein has vanished.

* * *

It is the unexpected which always happens. It is chance, rather than design, which shapes and guides our lives.

* * *

Life seems to be a perpetual round of anxieties. How destructive are they of intellectual work; and yet ease and comfort seem to be equally so. Poverty and the struggle for existence may sometimes quench intellectual ardour, but wealth invariably does so. The most suitable condition for a scholarly life is one above want—not exactly affluence, but immunity from the petty worries of life, security against the uncertainty of the morrow.

* * *

There are certain periods in life when everything goes wrong; when all efforts are unavailing; when nothing succeeds, and when our best-calculated hopes deceive us. They come at appointed intervals.

* * *

Be slow in making friends, and still more slow in

Superstition is too deeply ingrained in human nature to be altogether eradicable by culture or illumination.

* * *

How lovingly we hug and how painfully we part with a day which grants us respite from worry and weariness —the ordinary condition of mortal life!

* * *

Nothing is softer and sweeter than the unspoken words which lovers read in each other's eyes.

* * *

Even a life-time would seem but a day to youthful, ardent love.

* * *

There are moments when the stoutest heart melts and seeks relief in tears. There are sorrows which are a trifle too much even for the sternness of stoical breeding.

* * *

Farewell! What an agonising torture to utter that word! The heart well-nigh breaks at the thought that the haunts of childhood and the familiar scenes of growing manhood may never more be seen. Nature, indifferent to the sorrows and afflictions of the Children of Men, inexorably observes her immutable, eternal laws. The sun still shines; the sky still wears its spotless cloak of sapphire-like brilliance; the leaves of the trees still whisper to each other their unknown secrets; the breeze still blows, diffusing freshness and fragrance over the weary Earth; but nevertheless, there is one heart which is out of tune with all this wealth of joy; one heart which, despite the encircling warmth and sunshine and cheerfulness, beats sad and sorrowing. It is mine. To feel is to suffer. How terrible it is to compare the ugliness of the reality with the splendour of the ideal! Dissension, division, disappointment, disenchantment—what a hideous tragedy is life! The ordinary man is essentially unimaginative. He receives and endures the buffets of life, staggers for a moment, then composes himself and goes his way, oblivious of

XIX.

Who would care or dare to speak the whole truth about himself?

* * *

Success in life is rarely due to merit or intrinsic worth. It is generally the outcome of some felicitous conjunction of favourable circumstances coupled with daring and impudence.

* * *

Know a man's weak point, and you have him in the hollow of your hand.

* * *

How persistently does the mind revert to vanished days! How it invests them with a halo of romance! They were probably not better or happier than the present, but we love them and cherish them simply because they are no more.

* * *

Our nearest relatives are always the most envious of our good fortune. Our success intensifies their misfortune, our good luck accentuates their reverses.

* * *

Women never forgive their detractors. Both in love and hatred they go to extremes.

* * *

We are always most generous where our interests are not affected.

* * *

Friendship, to be lasting, must be pure and disinterested. The worldly-wise rarely make true friends. Childhood and youth are the seasons when we form friendships and forge attachments. They are the seed-time of life's choicest fruits.

* * *

Prayers and tears are the usual accompaniments of old age. Why? Because then the shadows of death begin to thicken, and the fear of the unknown to press with an uncomfortable insistence.

* * *

XVIII.

Contempt for death is often due to one of three causes: a great grief; a grievous disappointment; a deep religious conviction.

* * *

There is a touch of sadness in everything connected with us. It lurks beneath the festive board. It nestles round our dearest joys. It casts a shadow over our proudest successes. But it is only in the evening of life that this truth is borne in upon us, because it is then that we are freest of illusions and fullest of experience.

* * *

Childhood! Who does not envy its irrepressible laughter, its unalloyed joys, its absolute freedom from care; even its not unfrequent tears—brilliant as diamonds, and fleeting as the morning dews?

* * *

At times nothing seems to bring relief to an afflicted heart. Even the beauty and harmony of nature—its vastness, its majesty, its tranquil repose—fail to communicate their ineffable charms. To be sure, it is the inward peace which casts the glamour of beauty on physical conditions. It is our own mental attitude which creates both Heaven and Hell.

* * *

Hope defies reason. It lives longer.

* * *

Happiness is the gift which Heaven confers upon the ignorant. Sorrow is the heritage of the wise.

* * *

Youth is over-confident. Old age distrustful.

* * *

Truth, Justice, Love—cardinal principles of life—loudly proclaimed in theory, lightly violated in practice.

* * *

Whenever carefully examined, we shall detect in every human action, however disinterested in outer seeming, vanity or self-interest as its direct cause.

* * *

the tiger and the ape will be at once let loose in him.

* * *

The worst calamity in life is to be torn between two contending passions.

* * *

Life is too fragile and too uncertain for us to be constantly worrying. I never can understand that calculating attitude of the mind which persistently looks ahead with a view to controlling the course of events, or strives to erect safeguards against possible mishaps. To me that is the summit of human folly. Foresight and forethought are both unavailing against Fate. I love to float on the tide of Destiny, leaving my little barque entirely in her custody, to be wrecked or saved as it pleases her capricious mood.

* * *

Some natures are more sensitive to unkindness than others; but the unkindness which stabs deeper than a thorn is that which comes from a friendly quarter. It leaves a smart which never wholly subsides.

* * *

What embitters and poisons the springs of life is ofttimes the viperous sting of memory.

* * *

There are moments when a mere look, a mere act, or a lightly-spoken word—any one of these—is enough to wreck a life-long friendship, or to crush the fragrance out of a most endearing relationship.

* * *

The daily experiences of life ofttimes not only break one's heart, but turn it to stone.

* * *

We fear death, not only because of the darkness and the uncertainty which lie beyond the grave, but also—and perchance the more—because of the wrench that it involves from the attachments of this life.

* * *

MAXIMS AND REFLECTIONS

LIFE—it is a series of disenchantments.

* * *

Toleration—how rare in life! Every one tries to play the tyrant in his own small sphere.

* * *

The great names of to-day—I wonder how many will be thought of five years hence by heedless humanity!

* * *

I loathe a large gathering! To me it is an exhibition of all that is petty and repulsive in life. I see there the arrogance of power; the insolence of wealth; the crawling, furtive meanness of the masses. Only here and there, like lonely wild-flowers in a meadow, are the worthy.

* * *

The difference between a saint and a sinner consists merely in their power of resistance. One has more than the other.

* * *

A sycophant is always after something. His flattery begins and ends with expectation.

* * *

The price we pay for the company of the worldly-great is, indeed, tremendous. It is nothing less than the entire surrender of our individuality, and the absolute sacrifice of our private judgment.

* * *

What a passion the ordinary man has for display: display of power, display of wealth, display even of his eccentricities!

* * *

With the generality of mankind religion is more a form than a reality; a habit rather than a sustaining, fertilising principle of life.

* * *

Strike at the real or imaginary interests of a man, and

of my translation ; to Mr. H. B. Hannah, of the Calcutta Bar, for his kindness and courtesy in not merely revising but offering most useful suggestions which have considerably improved the translation ; and lastly to Professor Margoliouth for revising the final proofs.

S. K. B.

KHUDA BUKHSH'S LIBRARY,
BANKIPORE, 1916.

ness, of a childlike purity, have been raised ere now by anguish upon anguish, woe after woe, to a height of holiness which we may believe they could have reached by no other road. Why should it not be so? Since there is no limit to the soul's possible elevation, why should her purifying trials have any assignable bound? She is of a metal which can grow for ever brighter in the fiercening flame."

These sayings breathe of sorrow and sadness, of a sense of hollowness and unreality of life, of a feeling of lofty contempt for the world and its coveted prizes, and lovingly dwell upon the certainty of death. Does the author not say, "Be not eager for anything in life, for there is nothing certain here except death"? The mysteries of life and death will never cease to interest mankind. Each individual approaches them from his own standpoint and each individual solves them in his own way. But whatever may be the divergencies in detail, the broad features are always the same. Love, friendship, hatred, jealousy, hope, aspiration, ambition, and disappointment have ruled and coloured human life, and will continue to do so to the end of time. They will never grow stale or out of date. And it is precisely for this reason that books dealing with life, or maxims illustrating the ordinary incidents of mortality, never lose their charm or freshness for man. Age does not affect them; for the questions that they deal with are questions which will never and can never be shelved or cast aside. They add to our joy. They bring relief to our sorrow, for do they not teach that sorrow is but a necessary step towards the ascent of man?

In these sayings we have our own moods reflected; our own thoughts expressed, our own sorrow made articulate, and our vain strivings held up to scorn and derision.

It is my pleasant duty now to offer my most grateful thanks to Mr. H. J. Philby, I.C.S., for revising a part

mism. They unite the temper of the visionary with that of the man of the world. They are redolent not only of the cloister, but also of the market-place. They represent life in its manifold phases—its brilliant sunshine, its weeping gloom. The author himself says that he has seen the various phases of life; and that he must have done; for none, without worldly experience, acquired first-hand, could have penned the truths that lie scattered in this book;—truths that penetrate to the very core of the heart. There are sayings here which nothing but the sadness of despair could have evoked. They are bitter and piercing in their truth and poignancy. These sayings are only too full of the disenchantments and disappointments which life brings in its train. And who has not felt the heavy hand of Fate or has not suffered from its cruel ravages? But, as the writer has very truly said, these sayings are the records of an unhappy life. But in spite of the atmosphere of gloom which hangs over them they are most delightful reading. They may be out of place, perhaps, at a festive board, or at a carousing banquet, but life is neither one nor the other.

"Happiness[1] with honour was the ideal of Solon; is it also ours? To us, perhaps, in estimating the fortune of any one whom we hold dear, it may seem more needful to inquire, not whether he has had enough of joy, but whether he has experienced a sufficiency of sorrow; whether the blows of circumstances have wholly shaped his character from the rock; whether the soul has taken lustre and purity in the refiner's fire. Nor is it only (as some might say) for violent and faulty natures that sorrow is the best. It is true that by sorrow only can the headstrong and presumptuous spirit be shamed into gentleness and solemnized into humility. But sorrow is also used by the power above us in cases where we men would have shrunk in horror from so rough a touch. Natures that were already of a heroic unselfish-

[1] *Wordsworth*, by F. W. Myers, pp. 72–73.

flower and fruit of many years of silent study and quiet meditation. I have not attempted to put them in order or cast them into shape. I have left them just as they were written. I would not destroy whatever charm attaches to their spontaneity. Moreover, many of them are associated with events and incidents which I hold dear; and to me, therefore, they represent not merely general truths, but closed chapters of my life. Here is no system of philosophy; no code of morals; no coherent, consistent view of life—no, there is no such thing here. It is merely the cry of the heart, uttered and expressed in the language of truth, and nothing but the truth.

"Farewell, my book of 'Maxims and Reflections'! Farewell, my loving companion, my trusty confidant of years! May the fates be kind and the world just to thee!"

این نسخهٔ بی ربط که دیوان فقیر است • مجموعهٔ احوال پریشان فقیر است
از سوز و گدازی که شناسد دل روشن • هر مصرع آن شمع شبستان فقیر است
هرچند که صد رنگ غم و درد در آن هست • کفران نکنم نعمت الوان فقیر است
گر هست پریشان سخنم عذر پذیرند • زلفی عجبی سلسله جنبان فقیر است
یعقوبم و این غمکده کنعان محبت • هر بیت در آن کلبهٔ احزان فقیر است
زنهار که شیرازهٔ آن نگسلی از هم • در وی تو چندی رگ جان فقیر است

III

This autobiographical sketch does not offer more information than do the "Maxims and Reflections" themselves. No one reading the MS. can fail to notice that the author was fairly well acquainted with European literature. We hear in some of these sayings distant echoes of Goethe and Schiller, La Rochefoucauld and La Bruyère. We find in them actual quotations from Tennyson and Swinburne, Pushkin and Gissing. But what will probably prove their most attractive feature is the blend therein of Orient and Occident. They combine Eastern melancholy with Western opti-

sought in no other spirit than that of mean trade and sordid gain. It was regarded as a mere commodity, with a market value attached to it. Everywhere, wheresoever I turned my attention, I was confronted with sham and counterfeit, fraud and imposture. In religion, I found a set of forms, a congeries of traditions, a mere shadow of a shade. In social life I either found wicked lies in fullest bloom, or hideous anachronisms supported by all the strength of enthusiastic ignorance.

"I was sick of everything around me. Nor were my experiences in other spheres calculated to inspire in me either love for the world or admiration for mankind. I saw very little fair play in life. It was nepotism and jobbery everywhere. I reposed trust only to be betrayed. I fought for truth, only to feel that truth's right to victory is rarely acknowledged. I was frank and outspoken, only to find that duplicity and hypocrisy win the day. I found that it was not love but self-interest that was the motive power in this world; that it was not virtue or wisdom but wealth which ruled mankind; that it was not personal merit but the gentle art of flattery which made or unmade the individual fortune.

"Experiences such as these do not make for cheerfulness, and hence this little book of mine breathes of sadness, and palpitates with grief. Let not those who have never known sorrow or suffering, or those who have never tossed through restless nights or passed through cheerless days, or those, again, who have never bled under the lashes of disappointment—let none of them look at these pages, dreary and dismal and steeped as they are in deep, unrelieved melancholy. These maxims do not and cannot lay any claim to originality, for such a claim would be an idle one. Is there aught original under the sun but truth? That can never grow stale or insipid. It always has, it always will have, virginal freshness. It will bear iteration and reiteration. These 'Maxims and Reflections' are the records of ineradicable thoughts. They are the

love of his country, and teaches him the meaning of life. It brings home to him the dignity of man and the boundless possibilities of his advancement in the scale of civilisation, and it makes him feel, not without a tinge of shame and sorrow, how far, far behind is his own country in all things that make life honourable; nay, in many things that make life worth living.

"I was away from home for seven years—years full of hope, of laborious studies, of novel experiences. Oh, that Allah would give back to me even though it were but one of those swift-fleeting years spent in Europe! But no, that were a vain longing, a futile prayer, a never-to-be-fulfilled hope. When we bid adieu to the university, we generally, with that, sigh forth a last farewell to all the fairest dreams of life; for then we are launched on our respective careers, no longer to indulge in dreams, but to fight the realities of life.

"And realities—how undeceiving they are! I had to select a career for myself, and as all other avenues of advancement are either closed against us, or offer but meagre prospects, or are even held in disfavour, I, like the majority of my countrymen, took to the study and eventually to the practice of Law. To the observant Law is a profession which reflects more of life and reveals more of human nature than does any other profession. It shows the reverse side of the medal—the baseness, the ugliness, the horror of actual life; nay more, it brings home to one the ignoble uses whereto is not seldom put that divinest of all human institutions—the Administration of Justice—and it forces upon one the melancholy reflection that in actual life things are not generally what they pretend to be.

"I secured first-hand experience not only of law but also of the educational institutions of my country, and I must confess that there too I found things very different from what appeared on the surface. What struck me most forcibly was the painful lack of zest and zeal shown everywhere in the pursuit of learning. Learning was

its walls, and the nobler ones that lie buried there. City of Peace, Culture, and Refinement—my dearly beloved Nishapur—never shall I think of thee—wherever I may chance to be—except with fondest love and deepest affection. It is not my intention to inflict an autobiography upon the reader; for what interest has the world in the prosaic, unstirring, uneventful life of one to whose credit stands neither a dazzling deed nor a great literary achievement? I shall therefore say as little as I can—avoiding all details—and that little only to enable the reader to form some idea of the training and the surroundings of the author of these 'Maxims and Reflections'—the child of fancy, fed on tears, and nourished by the author's very life-blood. Belonging, as I do, to a family of book-lovers—my native town possesses a noble monument of my parent's piety and love of learning—I was brought up, so to speak, in the purest atmosphe[illegible] of learning. Since my earliest youth books were my delight, my one absorbing passion. With a passion for books I developed a love of solitude. But this was not without its drawbacks, which I perceived and from which I suffered in after-life. It entirely unfitted me for the rough-and-ready ways of the world. It gave me a visionary rather than a practical turn of mind. It inspired in me a distrust of my own powers, a shyness as regards society, a longing for peace and quiet. My father, not satisfied with the education which my native town could give, decided to send me to an Occidental seat of learning, and thus before I was fifteen years of age I was sent away from Nishapur to Europe, to learn the languages and to study the thought of the western world. What a contrast Europe offers to the East! What deep, abiding impressions it makes upon the youthful oriental mind! The merest visit to Europe—not to speak of residence at a university—is an education, and an education of an enlightening kind. It broadens one's mind, it widens his outlook; it inspires in him

FOREWORD

"There is nothing worth thinking but it has been thought before; we must only try to think it again."—GOETHE.

I

It was the merest accident two years ago which took me, one fine January morning, to an old bookstall. I am a frequenter of bookshops—a virtue or a vice which has run for three generations in our family. Among the stock for sale I found a neglected heap, dusty and battered by the shocks of time. I have a weakness for old books, and this forlorn-looking parcel at once attracted and riveted my attention. I cut the string, and lighted upon an exquisitely written Persian manuscript. It was not very old. In fact it looked quite modern. It was a collection of sayings—prose-poems were perhaps a more appropriate description. It promised to be very interesting, and that promise it amply fulfilled. It bore no name, and the provokingly brief autobiography which preceded the text threw but scant and insufficient light upon its authorship. That autobiography, brief though it is, will not be without interest to the reader.

II

It begins thus: "I was born at Nishapur, that famous city which has become still more famous by the recent favours conferred upon it by our beloved Shah. May his shadow never grow less, and may my beloved city never lose its lustre! May it never yield in rank and importance to any other City of Fars! Such is my fervent wish, my whole-hearted prayer. I thrill with pride when I think of the noble souls that reside within

To

THE BELOVED MEMORY OF THE LATE

BABU DHANNU LAL AGARWALLA,

FRIEND AND BENEFACTOR, WHOSE PREMATURE DEATH I SHALL NEVER CEASE TO MOURN AND WHOSE MEMORY I SHALL NEVER CEASE TO CHERISH, I DEDICATE THE FOLLOWING PAGES

That virtue of originality that men so strain after is not newness, as they vainly think (there is nothing new) it is only genuineness. John Ruskin

MAXIMS AND REFLECTIONS

Men know neither from God, nor from Nature, nor from their fellows, how to receive with gratitude what is valuable beyond attainment. Goethe (apud Morley's Diderot p. 8 Vol I).

* All they see & meet with in actual experience so contradicts the high vision they once had, that with the increase of their experience, they are often tempted to despair. Shairp's Aspects of Poetry p. 463. One thing only can save them from this temptation — the entrance into their hearts of the Consoling light that comes from above. p. 464.

V.

Canon Liddon has somewhere asked, How is a man likely to look upon his existence? Is existence a happiness or a misery, a blessing or a curse? And he replies, 'This question will, probably, be answered in accordance with deep-rooted tendencies of individual temperament; but these tendencies, when prolonged & emphasised, become systems of doctrine — as we call them philosophies. And so it is that there are two main ways of looking at human life & its surrounding possibilities, wh are called optimism & pessimism.' There is a whole order of minds & these sometimes the most thoughtful & deep, on whom the sad side of things & the dark enigmas of existence press so heavily, that the brighter side seems as though it were not. Those especially who enter on life with a high ideal whether a merely aesthetic, or a moral & spiritual ideal, get it sorely tried by their intercourse with the world. ∴

• در ازل می رفت چون تخمیر ما •
• جمع کردند از پی تعمیر ما •

• آب اشکِ بلبلِ دیوانهٔ •
• آتش دودی زخود بیگانهٔ •

• خاک از خاکسترِ پروانهٔ •
• باد آهِ قمری مستانهٔ •

• این عناصر را بهم آمیختند •
• تا چو من دیوانه را انگیختند •

III.

MAXIMS AND REFLECTIONS

(TRANSLATED FROM THE PERSIAN)

BY

S. KHUDA BUKHSH, M.A., B.C.L. (Oxon.)

Barrister-at-Law; Fellow of the Calcutta University; Lecturer in History of Islam; Professor at the University Law College, Calcutta; Author of "Islamic Civilisation"; of "The History of Islamic Peoples"; of "Orient under the Caliphs"; and of "Essays: Indian and Islamic"

LONDON, PARIS AND TORONTO

J. M. DENT & SONS LIMITED

1916

Maxims
&
Reflections

by

S. Khudabakhsh

may be completely right in thinking that I acted wrongly. Only I would say this, that Maulana Sahib thinks too much in individual terms, sometimes, and could have made a difference but sometimes individuals are only symbols of forces at work."[4]

Now Azad speaks.

---

1. Michael Brecher, *Nehru, A Political Biography* (New York: Oxford University Press, 1959).
2. Pyarelal, *Mahatma Gandhi: The Last Phase* (Ahmedabad, India: Navajivan Publishing House), II, 78.
3. Ibid., p. 153
4. Official transcript, Prime Minister Nehru's Press Conference, pp. 7-9.

facts were the situation itself and the bitterness and conflicts that were growing in the communal field and the feeling that even if some arrangement could be arrived at to prevent partition, those conflicts and inner disruptions would continue, and might come in the way of any marked progress of the economy of the country later. Because, we were anxious naturally to make good, after Independence, in the political and the economic spheres and other—planning and all that—and we felt that if there was some kind of a compulsory union carried on, it would prevent progress—all our energies would be spent in these inner tugs of war. Whether that was a right analysis or a wrong analysis, I cannot say. I am only saying that it had a powerful effect on our thinking. And even in the course of the Interim Government, we had proposed the appointment of a Planning Commission. It had been opposed by the Muslim League representatives: So that, in every such matter where economic considerations and planning came in, we were likely to come up against inner pulls in different directions. That was. I think—this overwhelming sensation that any kind of a union, if it came about, would first of all not put an end to these inner pulls, secondly, it would leave the Federal Government so weak—with the transfer of power to its various constituent units—the Central Federation would be so weak, that it would not be able to act properly or adopt any effective economic measures. These were the real reasons which ultimately induced us to agree. It was a very, very difficult choice—you can well imagine—and it is frightfully difficult to say now what one could do if one had the same choice. It is very difficult to say; it is very difficult because of what happened subsequently—the terrible things that happened—because when we decided on partition, I do not think any of us ever thought that there would be this terror of mutual killing after the partition. It was in a sense to avoid that, that we decided on partition. So we paid a double price for it, first, you might say, politically, ideologically, second, the actual thing happened that we tried to avoid.

"So, how can I judge how far I was responsible? Mine was certainly part of the responsibility, and Maulana Sabib

fetched three to four times the published price. Everybody, of course, eagerly awaited Nehru's reaction to Azad's statements and inevitably the matter was brought up at the Prime Minister's press conference. Nehru manifested his customary magnificent magnanimity. He had read the book in manuscript with great care and even made a few minor corrections, one regarding the place where Chiang Kai-shek had stayed in India. Otherwise he insisted on the book's appearing without change, just as it had come from Azad's hand. (The title is Nehru's own formulation.)

An Indian journalist then asked: "Do you think that partition could have been avoided if the proposals brought by Lord Mountbatten could have been brought by some other viceroy? We want to know the exact personal influence which he exercised over your mind."

The Prime Minister replied: "First of all, Maulana Azad has referred to what I said at a press conference. Now, I am sorry to confess that I have no very clear ideas of the day-to-day occurrences in those days; it was a great burden on all of us—a burden of decision, a burden of occurrences, events, happenings, all over, and the tremendous strain under which we were functioning in that Interim Government as it was called, inside the Government, I mean, apart from occurrences outside, because the Muslim League Party were out, as they openly said, to prevent us from functioning satisfactorily. During the period of the Interim Government, I think in the first few weeks, I was constantly going to Lord Wavell and telling him that I had had enough of it. I must have done so—I do not know—four or five times in the course of the next two or three months, that is, verbally resigning not actually writing, but saying that I wanted to get out. He said, 'wait and see' or something like that. So that it is a little difficult to reply on one's memory of a thing that happened 12 years ago when one was under great strain, in difficulty—not I alone, but all of us. And it is quite conceivable for people to have different recollections as to who influenced whom or what. The real fact is, I think, that personal influences count. How am I to say how I was influenced? I cannot judge. But I think the real

Thereafter, on each of my visits to India, he would offer a spread of western food for the spoiled palate of the American and, with none present except Humayun Kabir, his friend and political associate, himself a thoughtful author (now Minister for Cultural Affairs in Nehru's Government), and K. R. Kripalani or another secretary, the luncheon conversation—never a sentence of small talk—would proceed meaningfully for two or three hours. If the question required an indiscreet reply about a Cabinet colleague or a government policy, he would indicate agreement by smiling and saying, "You know my views". On one occasion he asked me, "What is India's moral standing abroad?" Nothing more was needed to indicate his displeasure with either the programme or, more likely, its spokesman at foreign forums. Usually it was he who cross-examined me—on Soviet diplomacy and conditions, Germany, Indonesia, United States policy towards China, yes, even about India. I last broke bread with him a few weeks before his death, when illness had painfully bent his body but left untouched the keen edge of his mind. As ever, he cared for humanity in his own country and in the world. But it was not a cold concern for "masses" or classes. He had warmth, a heart for friendship and an eye for the personal side of politics. His bond with Nehru, his reverence of Gandhi, suffuse the pages of his autobiography. He paints little word pictures of Sir Stafford Cripps, Mountbatten and other British leaders. How does the heat of India's dry plains affect talks on the fate of nations? How did the British arrest respected Indian leaders? What did Azad and Nehru do together in jail? How does it feel to be in prison when your wife dies and not to attend the funeral, yet to go from prison to the Viceroy's palace for negotiations about independence? Threaded between resolutions and texts are delightful human sketches revealing the man and his fellow men. The fight for freedom, under moral leadership, breeds giants. The task of governing, through compromise, cuts them down to normal size.

When Maulana Azad's book appeared in India it was a political sensation and immediately became a best seller. Indeed it sold so fast that between printings it occasionally

ccuntenance internecine slaughter on a grand scale. Every fibre of his being rebelled against bloodshed. He advanced the slogan, "Peace before Pakistan". But Mountbatten had persuaded Nehru and Patel that there could be no peace without Pakistan. 'I felt," Patel explained later, "that if we did not accept partition India would be split into many bits and would be completely ruined."[3]

The fact is that Congress no longer supported Gandhi on the integrity of India. "Mr. Gandhi," Lord Mountbatten said to the Mahatma in one of their six talks, "today Congress is with me"

"But India," Gandhi replied, "is with me today."

He was wrong. India was about to burst into flames which would burn hundreds of thousands of all races and religions to death. Then a young Hindu shot Gandhi for being pro-Muslim, and India, torn in twain—torn in three really, for there are two Pakistans, one in the east and a second in the west—entered the Nehru era. It has been a difficult, sometimes desperate, period in which the cost of partition multiplied the cost of the country must pay for five centuries of stagnation.

What happened was many times worse than that which Nehru and Patel thought they could prevent by bowing to Jinnah—partition. In New York on October 16, 1949, Prime Minister Nehru declared that he would have fought to the end against the establishment of Pakistan had he foreseen the dire consequences that flowed from it. Azad foresaw and warned and yet remained by Nehru's side, a trusted friend during the ten troubled years between independence-plus-partition and his death on February 22, 1958.

Azad was noble and brilliant. His integrity, a stern master, did not prevent him from being generous and gracious. I first met him in Gandhi's ashram in June 1942. Azad understood English perfectly and could have spoken it, but to avoid misunderstandings he availed himself of an interpreter. On that first occasion Nehru translated. I asked the Maulana about partition. He said he did not believe in "divorce before marriage". Indians must begin by living in wedlock. If it did not work, they could get a divorce.

Minister[1]. The biography is laudatory, at times worshipful ("Nehru," Brecher says, "is a giant both as a man and statesman") but never starry-eyed. Commenting on Nehru's approval of partition, he declares, "For those who have been in opposition most of their political lives, the prize of power is tempting. The Congress leaders had already tasted its fruits (in the Interim Government) and were naturally reluctant to part with it at the moment of triumph"—at the moment when the British announced their readiness to free India. "This," Brecher continues, "applies to Nehru as well." But he sought power primarily to translate his ideals into reality.

Azad had his own views on why Nehru accepted partition and they will give no comfort to the doctrinaire and indoctrinated who believe that men—and women—do not make history. Nehru, Azad says, "is also impulsive and amenable to personal influence". The details fascinate.

There was another factor. Nehru and Krishna Menon told me in India in 1946 that the British were not leaving the country. I found in Indonesia that the nationalist leaders had the same kind of doubts about Holland's final—1949—decision to quit the Indies. It is extremely difficult for minds conditioned by the prolonged domination of their native land by a powerful imperialism to accept its imminent departure as a reality. When Mountbatten made it clear that, given partition, Britain would indeed leave, Nehru and others eagerly seized the offer lest (who knows?) it be withdrawn.

Azad would have been patient and taken nothing less than an India united as a confederation. Mahatma Gandhi hoped to achieve this by a simple formula. "Hand over power to Mr. Jinnah," he advised Mountbatten in effect at their first meeting.[2] Since the British could not allow the Muslim minority to rule India, however, they would have to stay until Congress accepted power. But the British had decided not to stay. Therefore they would have to yield to the Congress party's condition: no Pakistan

Mountbatten escaped from this logical pincer by convincing Nehru and Patel that civil war impended and partition was the only way to avoid it. Nor could Gandhi himself

Prime Minister Attlee now sent Lord Mountbatten to "sell" partition to the Indian leaders. After the task had been accomplished he told the Royal Empire Society in London on October 6, 1948, how he did it. "Personally," Mountbatten stated on that occasion, "I was convinced that the right solution for then and still would be to keep a United India" under the Cabinet Mission's plan. But "Mr. Jinnah made it abundantly clear from the first moment that so long as he lived he would never accept a United India. He demanded partition, he insisted on Pakistan." The Congress party, on the other hand, preferred India whole. Its leaders would, however, accept partition to avoid civil war Mountbatten "was convinced that the Muslim League would have fought".

But the Congress party refused to let large non-Muslim areas go to Pakistan. "This automatically meant," Mountbatten explained at the Royal Empire Society, "a partition of the great provinces of the Punjab and Bengal," which had millions of Hindu and Sikh inhabitants, and more millions of Muslims. "When I told Mr. Jinnah that I had their (the Congress party leaders) provisional agreement to partition he was overjoyed. When I said it logically followed that this would involve partition of the Punjab and Bengal he was horrified. He produced the strongest arguments why these provinces should not be partitioned. He said that they had national characteristics and that partition would be disastrous. I agreed, but I said how much more must I now feel that the same consideration applied to the partitioning of the whole of India. He did not like that, and started explaining why India had to be partitioned, and so we went round and round the mulberry bush until he finally realised that either he could have a United India with an unpartitioned Punjab and Bengal or a divided India with a partitioned Punjab and Bengal and he finally accepted the latter solution."

It is not startling that Jinnah agreed to partition. He wanted his Pakistan. But how did Mountbatten win over Nehru and Patel and Gandhi—never Azad? "The crucial role in the great decision" to partition India was Nehru's, writes Michael Brecher, professor at Canada's McGill University, in the latest and best biography of the Indian Prime

between them, each with its own constitution—which the British Cabinet Mission proposed on May 16, 1946, and which Maulana Azad favoured from that date to his dying day.

Nehru, according to Azad, sank the plan in an historic press conference. The Cabinet Mission had considered the advisability of partition and rejected it. The creation of Pakistan would require the splitting of two giant provinces, the Punjab and Bengal, "contrary to the wishes of a very large percentage of the inhabitants.... Finally there is the geographical fact that the two halves of the proposed Pakistan state are separated by some 700 miles" of Indian territory. "We are therefore unable to advise the British Government," the Mission announced, "that the power which at present resides in British hands should be handed over to two entirely separate sovereign states." Lord Wavell, the British Viceroy, took the same position.

Thwarted, seeing no alternative, Jinnah accepted the Mission's confederation scheme. "Now happened one of those unfortunate events which changed the course of history," Azad writes. The event was a Nehru press interview in Bombay. I attended that fateful question-and-answer period and when it ended I said to Nehru in the presence of Mrs. Vijayalakshmi Pandit, his sister, "You have changed the entire basis of the agreement with England."

He smiled and replied, "I am fully aware of that."

Nehru had told the assembled journalists that the Congress party, of which he, Gandhi, Azad and Patel were the leaders, would not be bound by the Cabinet Mission's confederation plan. Actually the All-India Congress Committee had met in the same city of Bombay only two days earlier under Nehru's chairmanship and in Gandhi's presence and voted for the plan. This is fully documented in the minutes; Azad, who participated in the discussions, bears witness to it.

Jinnah read Nehru's press conference statement as the Congress party's withdrawal from the Cabinet Mission's scheme. He accordingly withdrew his approval too. There followed most cruel, widespread violence, Muslim League intransigence, Congress party despair, and, finally, the British Labour government decision to partition India while unshackling her.

dedicated, with permission, "For Jawaharlal Nehru, Friend and Comrade". Azad wrote it while Minister of Education in Nehru's Cabinet. He could not have known at the time that he would die before the day of publication. It took courage to blame Nehru, in considerable part, for the partition which Azad opposed from first to last. Courage and honesty are the outstanding characteristics of this book as they were of the man.

An Arabic scholar renowned throughout the Islamic world, Azad was an Indian nationalist eager to found a free India undiminished by a Muslim state of Pakistan. For him the vivisection of India was a public calamity and a personal tragedy. It shattered his entire lifework for an independent country whose unifying nationhood would bridge the religious differences between Hindu and Muslim communities. His heartache was understandable and so, too, the bitterness against those he holds responsible. He waited ten years to let his emotion cool and then dictated these memoirs.

It is the irony of fickle politics that Nehru, least Hindu of Hindus, the westernized agnostic born in the United Provinces (now Uttar Pradesh), where Muslims and Hindus always coexisted in friendly affinity, should have acquiesced in the bisection of his beloved India on religious lines. He did so because he came to the conclusion, as the very Hindu Patel had a bit earlier in 1947, that it would be impossible to govern free India if the obstructionist Muslim Leaguers, under Mohammed Ali Jinnah's vengeful inspiration, refused to collaborate. Better to stand divided than fall united.

Nehru oday regrets the mistake. "Twenty years ago," he told C. L. Sulzberger in an interview published by the *New York Times* on March 2, 1957, "I would have said that certainly we should have some kind of confederation—not federation—independendent states with common defence and economic politics. The difficulty now is if we talk about it. This upsets our neighbours (Pakistan) because we are so much bigger. Nevertheless, of course this remains the logical future path—confederation with each member nation maintaining its independence intact."

Such, roughly, was the plan—a confederation consisting of three regional groupings of autonomous provinces: two Muslim regions in West and East India, a predominantly Hindu region

Giants and Men

by

LOUIS FISCHER*

آج صبح آپ سے ٹیلفون پر کیے گئے وعدے کے مطابق "انڈیا ونس
فریڈم" کے ۱۹۶۰ء میں شائع شدہ امریکن ایڈیشن میں شامل لوئی فشر کا دیباچہ
بعنوان GIANTS AND MEN کی فوٹو کاپی منسلک کر رہا ہوں۔ یہ "انڈیا
ونس فریڈم" کے جولائی ۱۹۷۸ء کے ایڈیشن میں شامل تھا۔ اب جو مکمل
ایڈیشن ۱۹۸۸ء سے آرہا ہے اس میں یہ شامل نہیں ہے۔ شاید پسند آئے۔

محمد امین مسعود صدیقی

۱۰ دسمبر ۱۹۹۴ء

Unlike the thirteen American colonies, India won national independence not in a revolutionary war but through negotiation. The way to the conference table was prepared by three decades of the Gandhi-led, nonviolent struggle for freedom, and by the five and a half years of Britain's valiant and victorious battle with Hitler, Italy and Japan. The fighting finished, England faced pressing business at home: tending her wounds and mending her economic fences. She had neither the mood nor the might to frustrate India's will to liberty. Within nine months—a very short time—after the end of the global war, therefore, an influential Cabinet Mission, sent by the Attlee Labour government, was in India deliberating with Mahatma Gandhi, Jawaharlal Nehru, Vallabhbhai Patel and Maulana Azad on the terms of Britain's departure. How independence was negotiated and who was responsible for the simultaneous disaster of partition is told in this autobiography of one of the Big Four: Maulana Azad.

Rarely has an insider written with such frankness about events hitherto unrevealed or merely rumoured. Nehru and Azad were personally close and politically kin. This book is

*Reproduced from *India Wins Freedom* (New York : Longmans, Green & Co., Inc., 1960).

representatives and one Sikh to London. Jinnah immediately accepted the invitation but Congress had at first refused it. It was only on a personal call from Attlee that Nehru agreed to go to London.

Wavell, Jinnah, Liaquat Ali, Nehru and Baldeo Singh, the Sikh representative, flew to London. The Conference did not, however, produce any helpful positive results. Nehru did not accept the grouping of Provinces. The Conference thus broke down, and Nehru and Baldeo Singh left London on the morning of 7th December to arrive in India in time for the opening of the Constituent Assembly on 9th December. The Assembly met with all the Muslim League representatives absent.

"The Congress does not challenge and accepts that the Muslim League now is the authoritative representative body of an overwhelming majority of the Muslims of India. As such and in accordance with democratic principles, they alone have today an unquestionable right to represent the Muslims of India. But the Congress cannot agree that any restriction or limitation should be put upon the Congress to choose such representatives as they think proper from among the members of the Congress as their representatives".

To Congress leaders it represented such a dramatic departure from their long held position, that they could not accept it. They repudiated Gandhiji.

Nehru wrote to Jinnah on 6th October: "We feel that the formula is not happily worded. We are willing, as a result of the elections, to accept the Muslim League as the authoritative organisation of an overwhelming majority of Muslims of India and that as such and in accordance with democratic principles, they have today the unquestionable right to represent the Muslims of India, provided that for identical reasons the League recognises the Congress as an authoritative organisation representing all non-Muslims and such Muslims as have thrown in their lot with the Congress. The Congress cannot agree to any restriction or limitations to be put upon it in choosing such representatives as they think proper amongst the members of the Congress. We would suggest, therefore, that no formula is necessary and each organisation may stand on its merits".

Gandhiji accepted this repudiation without protest as later at a prayer meeting he said he had been guilty of acting without closely .ading it.

The correspondence further disclosed Jinnah's determination to prevent anything arising which would prejudice his intention of achieving Pakistan.

To make matters worse, Dr. Bardoloi, Chief Minister of Assam, was opposed to the grouping of Bengal with Assam. Nehru and Azad did not approve of this as these groupings were a cardinal point with Jinnah. But, Gandhiji sided with Dr. Bardoloi and Nehru was helpless.

This gave Jinnah the opportunity finally to decide on the boycott of the Constituent Assembly.

It was at this stage that Attlee stepped into the breach to prevent the final break-down. On 26th November, the British Cabinet invited the Viceroy and five Members of the Interim Government — two Congress representatives, two Muslim League

of the Muslim League members in the Interim Government and reiterated the fact that the only solution of the Indian problem was Pakistan, which, until absolutely achieved, there was no possibility of an end to India's civil strife.

Nehru, in an outspoken declaration at the Congress Subjects Committee at Meerut stated on 21st November 1946 that the atmosphere in the new Central Government after the League's entry, had become so strained that Congress members had twice threatened to resign. "Our patience is fast reaching the limit", and added, "If these things continue, a struggle on a large scale was inevitable". He also charged the Viceroy with failure to carry on Government in the spirit in which it had started.

Jinnah, in a statement, on 21st November declared that no representative of the Muslim League would participate in the Constituent Assembly and the Bombay Resolution of the Muslim League Council stood. He further accused the Viceroy and His Majesty's Government of "playing into the hands of the Congress" and maintained that "by forcing this meeting of the Constituent Assembly, a situation had been created which would lead to serious consequences".

During the last six months of 1946, correspondence between Nehru, Jinnah, Wavell and Gandhiji was carried on vehemently. It is neither necessary nor possible to quote from or summarise all the correspondence which created bitterness and confusion and which was responsible for further antagonism between the Congress and the Muslim League.

It is pertinent, however, to give a short account of the developments which led to this bitterness and confusion.

Disclosure in formal correspondence that Gandhiji agreed to a formula which permitted the Muslim League to claim that it was the sole representative of Muslims in India was made by Jinnah. The correspondence disclosed also that Nehru and other members of the Interim Cabinet refused to consider this proposition as binding upon them because it restricted the right of the Congress to speak for those Indian Muslims who did not follow the Muslim League leadership.

Release of the correspondence came as an anti-climax to the days of negotiations which ended with the League's announcement that it was coming into the Government without any agreement with the Congress on how to proceed after the new Government was formed. There was little in the correspondence that had not become known to the public during the negotiations. First, Jinnah and Gandhiji had their conversation at which they agreed on the following formula:

Chouduari Mohamed Ali then an official working in the Government of India, privately told Jinnah that Finance was the most important Department which could control the working of the whole Government. Jinnah and Liaquat Ali accepted this point of view and Liaquat Ali became the Finance Minister. The procedure to hold the informal meetings of the Cabinet before the formal meeting with the Viceroy as President, was given up as Liaquat and his colleagues refused to attend the informal meetings. This led to trouble as no joint action was possible.

Nehru, Patel, Liaquat and Nishtar went to Calcutta for a peace effort and issued a joint appeal for the cessation of violence and a return to the methods of peace. Just then, Bihar retaliated against the Muslims. Terrible violence followed. Nehru and Nishtar, accompanied by Anugraha Narayan Sinha, the Finance Minister, and Abdul Bari, President of the Bihar Provincial Congress Committee and certain Muslim League Leaders, visited Bihar.

Nehru addressing a public meeting said: "If you want to kill a Muslim, you must kill me first and proceed to do whatever you choose after marching over my dead body".

Nehru chastised the people for resorting to acts of lawlessness and told them they were seriously mistaken if they had thought that Swaraj meant the freedom to cut the throats of the people with whom they disagreed. He made pointed reference to the Majority (Hindu) community in the Province and said that shouts of Mahatma Gandhi Ki Jai or Pandit Jawaharlal Ki Jai did not sound pleasing to his ears when he knew that they had indulged in acts of violence instead of sacrificing their lives to protect their Muslim brethren. By these acts they had proved traitors to the country and placed serious obstacles on the path of Swaraj.

Gandhiji on 5th November threatened to go on a fast unto death unless the communal riots in Bihar stopped within 24 hours, but the disturbances flared up and hundreds were killed. The reason for this retaliation was that in Calcutta, Hindus including Biharees, were victims of Muslim brutalities including murder. The Biharees had to leave Calcutta and escaped to Patna, Bhagalpur and other places in Bihar, where Muslims were in a minority. Jinnah told me in London on 12th December that 30,000 Muslims were killed in Bihar. This was an exaggeration but there is no doubt that events in Bihar made Jinnah sad, bitter and unforgiving. He became more obstinate.

Gandhiji started on his peace mission to Noakhali on 9th November.

Jinnah, in a statement on 14th November, explained the role

followed it up by seeing Jinnah in Bombay. But Jinnah once again rejected the proposal as he did not agree to the appointment of a non-League Muslim in the Government even out of the Congress quota.

A pertinent question may be asked: If Nehru had not in his Press Statement early in July expressed himself so strongly, which put Jinnah's back up, would Jinnah have taken a less truculent attitude towards Nehru's offer of co-operation with the new Interim Government? Was this not one of the last opportunities which Congress let slip out of its hands to win Jinnah's co-operation?

The "Direct Action Day" was fixed for August 16. Constitutional agitation was to be given up. In Bengal, the results were disastrous. "Direct Action" in Calcutta and other places was merely a camouflage for an organised anti-Hindu campaign of loot, arson and indiscriminate murder of men, women and children in broad daylight with impunity. In Calcutta, the "Direct Action Day" was declared a public holiday. The Police were conspicuous by their absence owing to the deliberate inaction of the Government. The estimate is that between 5,000 to 10,000 people were killed during the four days of indiscriminate looting of shops and murders. It has now been proved beyond all doubt that this great killing and outrage were deliberately organised beforehand with the active support of the League Government.

Azad writes: "Throughout Calcutta, the Military and the Police were standing by, but remained inactive while innocent men and women were being killed".

The Hindus not getting any protection from Government, organised themselves and retaliated. A civil war for the next few days followed. Then only did the Government intervene.

On 2nd September, Nehru formed the Provisional Interim Government but as Jinnah had refused co-operation, there were no representatives of the Muslim League. Neither the Viceroy nor Nehru and his colleagues were happy about this. The Viceroy saw Jinnah and eventually Jinnah agreed to nominate Muslim League representatives to the Interim Government. The immediate problem was about the allocation of portfolios. The Finance Ministership and the Home Ministership were to be shared between the Congress and the Muslim League. As Patel refused to give up the Home Ministership, Liaquat became the Finance Minister. It was considered that the Home Ministership was the most important portfolio. When Wavell first offered Finance to the Muslim League, Jinnah had hesitated. But then,

Azad, the retiring Congress President referred with perfect justification to Nehru's Press Conference as "one of those unfortunate events which change the course of history" and categorically stated that "it was not correct to say (as Nehru did) that Congress was free to modify the (Cabinet Mission) Plan as it pleased".

Azad further said:

"Jinnah had accepted the Cabinet Missic Plan as there was no alternative. Jawaharlal's statement came to him as a bombshell. Jinnah issued a statement that the Muslim League had accepted the Plan as it was assured that the Congress had also accepted the scheme and that the Plan would be the basis of the future constitution of India. Now that the Congress President had declared that the Congress could change the scheme through its majority in the Constituent Assembly, this would mean that the minorities were placed at the mercy of the majority".

The Working Committee at its meeting held on 8th August made no reference to Nehru's unhelpful Press Conference as it would have been awkward to criticise the new President. It, therefore, re-affirmed the decision of the A. I. C. C. accepting the scheme in its entirety thus indirectly repudiating Nehru's statement.

On 18th July, Pethick-Lawrence and Cripps in Parliament unequivocally assured Jinnah that the Government would stick to the Cabinet Mission Plan of 16th May as it stood.

Jinnah, however, remained unreconciled and was not willing to accept Pethick-Lawrence's and Cripps' pacifying statements and asked what assurance could the minorities have that once the British left, Congress would not again change and go back to the position taken up in Jawaharlal's statement. Jinnah was furious and bitter and in his opening speech at the meeting of the Muslim League Council in Bombay held on 27th July, he reiterated the demand for Pakistan. The Council rejected the Cabinet Mission Plan and decided to resort to "Direct Action" for the achievement of Pakistan.

The Council called upon the Working Committee to prepare a programme of direct action.

The Viceroy renewed his offer for the appointment of an Interim Government. Jinnah immediately rejected it.

The British Government refused to allow Jinnah to exercise his power of veto.

Nehru who was asked by the Viceroy to submit proposals for the new Government, was authorised by the Working Committee to do so. Nehru wrote to Jinnah offering five seats out of fourteen, in the Interim Government, to nominees of Jinnah and

in appointing a Caretaker Government of officials was that in view of the fact that the second part of the Mission's proposals viz. the election to the Constituent Assembly was to be taken in hand, it was considered necessary to postpone the appointment of a political Interim Government. In his letter to the Viceroy, dated 27th June, Jinnah said that in view of this new development, the elections to the Constituent Assembly should also be postponed......"the long-term plan and the formation of the Interim Government formed one whole, each constituting an integral part of the whole scheme. It is, therefore, undesirable to proceed with one part i.e. elections to the Constituent Assembly and to postpone the other".

Nehru took over as Congress President from Azad and at the first Press Conference he held then, he made a tactless and harmful statement, further antagonising Jinnah. He said that he would have no treaty with the British Government, if they sought to impose anything upon India; as for the minorities, it was a domestic problem and "we shall no doubt succeed in solving it. We accept no outsider's interference in it, certainly not the British Government's interference, and, therefore, these two limiting factors to the sovereignty of the Constituent Assembly are not accepted by us". He also opposed the grouping of Provinces. Nehru further enlarged the scope of the three Central subjects. He said that Defence and Communications would embrace a large number of industries necessary for their support. "Foreign Affairs" would include foreign trade policy. The Union must also provide itself with the necessary finances by taxation and not from any contribution by Provinces. Currency and Credit must also be included in the Central subjects and the Centre must have an over-all authority to settle inter-provincial disputes and to deal with administrative or economic breakdowns.

These statements made Jinnah more suspicious of Congress intentions and more obstinate in his opposition to any effort for co-operation with Congress.

Jinnah had supported a weak centre and the grouping of Provinces with residuary powers. He had accepted the British plans on these points: Nehru's statements went directly against the spirit of the British Mission's plan.

Nehru did not realise that there was much to be gained by silence and this false move upset any prospects of rapproachment with Jinnah. This was one of the most fiery, provocative and uncalled for statements in his long public life.

It was not for Nehru to alter an agreed plan unilaterally at a later stage.

Moghal Empire might have survived even though there had been Aurangzebs on the throne but for the folly of weakening the Centre. Similarly, the Marathas lost their Empire because the Peshwa created three hereditary Viceroys — Gwalior, Baroda and Holkar — and the Centre was thus weakened. I do not approach the question at all from a communal point of view. Indeed left to myself I should be glad if some Ministers were Muslims. I have no horror of Mohamedans or Islam and indeed my Hindu friends look upon me more as a Muslim than as a Hindu; but I am definitely of the opinion that the division of India will mean disaster to India.

"I very well remember 1916 and 1917 when you and I were working hand in hand with Mrs. Besant and I know what keen interest you took in the Indian Home Rule".

On 15th March, Prime Minister Attlee said in the House of Commons:

"It is not good applying the formula of the past to the present position. The temperature of 1946 is not the temperature of 1920, 1930 or even 1942. The slogans of earlier days have been discarded. Sometimes, words that seemed at that time to Indians to express the height of their aspiration are now set aside and other words and ideas thrust forward.... We cannot allow a minority to place their veto on the advance of a majority".

On 16th March, Nehru welcomed the "Change in tone and approach" in Attlee's Speech.

On 24th March the Cabinet Mission arrived in New Delhi and immediately started talks with the Viceroy and the officials.

The Cabinet Mission and the Viceroy announced that a temporary care-taker Government of officials would be set up and the negotiations to form a representative Government would be adjourned for a short interval while the elections to the Constituent Assembly took place. The statement said: "The Cabinet Mission and the Viceroy are glad that Constitution-making could now proceed with the consent of the two major parties and of the States".

Jinnah objected to the formation of this Caretaker Government which he thought was contrary to what the Viceroy had promised him. The Viceroy had said that he would go ahead with the formation of the provisional Government consisting of representatives of political parties. The Viceroy's point of view

to judge him by his speeches on public platforms or by constant references to the favourite phrase "Quit India" or to his attacks on the bureaucracy. To know his real views you must discuss things across the table with him. He is an ardent believer in unqualified freedom, but he is the one man who can influence thought among the rank and file and I should like this Mission to tackle him tactfully. He happens to be a friend of Cripps and I think the two can get on with each other. Gandhiji too should prove a moderating influence. He should on no account be ignored. It is true that at times he uses language which is too metaphysical for the Western mind. Indeed at times it is too metaphysical for me also, but with all these peculiarities I shall say that he is essentially a man of peace and can think on a higher level than many others. The problem before this Mission will be mainly psychological and they can succeed only if they can create a feeling of confidence amongst those who will come into touch with them. I think we may then look forward to happy results. They will have difficulties with the Sikhs, the Depressed Classes and particularly with Jinnah. As you know Jinnah and I worked hand in hand for nearly 35 years of our life but he is a different man altogether now. Whatever else I may swallow, I cannot as a U. P. and a Delhiman, swallow Jinnah's theory of two nations. I am opposed to Pakistan mainly because from an international point of view it would be most unfortunate to divide India. A divided India will be an easier morsel for Russia to swallow and I confess that I am not free from considerable doubts as to the attitude and bonafides of Russia. Further, you may be sure that Pakistan in the sense in which Jinnah wants it established, a reunion movement will spring up within 24 hours. Instead of doing constructive work for the benefit of the country we shall be wasting our time in fomenting intrigues against each other. If, therefore, the Mission can do anything to solve this problem it will be doing a lasting service to the country. I am all for the protection of the ministries but the one condition which I consider to be absolutely indispensable is that there should be one Centre even though it may be of a limited scope. The history of India of the 18th Century should be a warning to every one. The Moghal Emperor created three hereditary Viceroys in Hyderabad, Bengal and Oudh, which weakened the Centre and ultimately led to the disappearance of the Moghal Empire. The

STRUGGLE TO AVOID PARTITION

Sir Tej Bahadur Sapru wrote to Graham Pole on 25th February, 1946:

February, 1946:

"I am glad that Lord Pethick Lawrence, Sir Stafford Cripps and Mr. Alexander are coming out as a Mission on behalf of the Cabinet to help us in the solution of constitutional questions. Why don't they bring you out with them? You can be a very effective liaison between them and Indian politicians. It would be a great mistake on their part to depend upon the bureaucracy at Delhi to serve as a bridge between them and Indian politicians.... In my opinion a Mission like this should have come out long ago but it was idle to expect anything like this in the time of Lord Linlithgow or Mr. Amery. They were adamant. They considered it a heresy to depart by a hair's breadth from their favourite formula about agreement between the principal elements of Indian public life.... I am not opposed to giving the amplest and most effective guarantees and securities to the ministries in respect of their cultural, religious and economic rights. On the contrary I have always been an advocate of such protection; but to tell any section of community in India that nothing will be done without their consent means inviting trouble. I personally think that on the constitutional side the Mission should not experience much difficulty. There will be some controversy as to whether the Constitution should be one based on Dominion Status or Independence. Personally, I am not attracted by mere phrases and as you know, I should like in some shape or other the Indo-British connection to continue as in spite of our political grievances, and they are genuine — I feel that within the social and cultural sphere our contact with England has been to our advantage.

"Ever since the release of Jawaharlal Nehru from his internment at Ahmednagar he has met and dined with me several times. To my agreeable surprise, I find that he has developed a very constructive and thoughtful mentality. He is very much less aggressive than he was before and socially he has become really charming. It would be a great mistake

solution for the formation of an Interim Ministry, consisting of the representatives of both the Congress and the Muslim League. Vallabhbhai Patel was optimistic and he told me in reply to my anxious enquiries that before I left India on my long sea-voyage to the United States, the problem of India would be satisfactorily settled. Patel added that after the return of the Cabinet Mission from Simla the Mission would ask the Congress and the Muslim League to form an Interim National Government at the Centre. The Congress would agree to do so but if Jinnah refused, even then the Government would go ahead with their intention without getting Jinnah's help and co-operation. I asked Patel on what terms he would settle with Jinnah, and I would go to Jinnah and meet him without any previous appointment just as I had gone to meet Patel that morning. He said there was nothing more to settle with Jinnah. He added: "Go and tell Jinnah that the British and the Congress having come to terms, there was no place for Jinnah in India and ask him to go to America with you". This was said of course as a joke but it indicated the Patel's mentality that once the Congress came to terms with the British, we need not worry about getting Jinnah's and the Muslim League's co-operation.

dressed at Chowpatty a public meeting on the lines suggested by Patel, he left for Allahabad the same night. Thereupon, the R. I. N. revolt collapsed.

Colville had felt most uncomfortable over this revolt and he admitted privately that but for Patel, the Government would have found themselves in a much more difficult situation.

This revolt was a matter of touch and go for India. The slightest indiscretion or hasty unguarded words on the part of Nehru or Patel would have resulted in wholesale bloodshed and terrible catastrophe. This was one of the Sardar's great acts of wisdom. Even before a settlement with the British was in sight, he foresaw that any disruptive tendency would spoil all chances for victory and peace.

The Cabinet Mission arrived in New Delhi on 24th March, 1946. The Congress asked for Independence and a Constitution making body to determine the future Constitution. In the intervening period, there should be an Interim Government at the Centre which would be responsible for all subsequent stages including the setting up of the Constitution making body.

On 4th April, 1946, a great opportunity for study and service came to me. I received a letter from my good friend, Howard Donovan, Consul-General for U. S in Bombay, intimating to me that the U. S. Government had invited me for a stay of six months as their guest for the purpose of studying labour problems, and further saying that this would mean my touring round different States in the U. S. I was asked to keep ready as early as possible as the transport facilities soon after the end of the war had not returned to normal and that arrangements would be made for my voyage by an American cargo freighter. This invitation extended to me was in my personal capacity.

Things had to move fast and, luckily for me, they did. In a few days, I was in New Delhi and met the Secretaries of the Labour and Finance Ministries. They helped me tremendously. The Labour Ministry gave me all the labour literature that had not yet been published in regard to the Rege Labour Investigation Committee and the 37 Reports made by the Sub-Committee of the Rege Committee in regard to the different industries in India. The Finance Ministry gave me all the dollar exchange they thought I would need. As a matter of fact they gave me more dollars than I had asked for. I went to Patel on 18th April in the morning at six to say good-bye, just a day before the Cabinet Mission consisting of Lord Pethick-Lawrence, A. V. Alexander and Sir Stafford Cripps went to Simla to spend the Easter holidays there with a view to put their heads together to suggest a

are not with him are against him. That is his attitude. He is too impassioned and shoots at random. To make matters worse, he is conceited and fond of popular demonstrations. He has often given way to Gandhiji and Vallabhbhai. He gave way to Gandhiji and Vallabhbhai in July/August, 1942 with disastrous results, but he and Vallabhbhai will work together. Jawaharlal is a great gentleman, a loveable personality, liked and respected by those who come into contact with him and by millions in this country. The British Government should make friends with him and Vallabhbhai. Jawaharlal could have made himself much more useful to the country by taking up a non-party line.

"Jinnah — I found Jinnah on the 5th November better in health and in spirit than I found him during the last six years. In October, 1944, I found him peevish, sick and depressed. This month I found him healthy and cheerful. The Congress treated him very badly. Linlithgow and the British Government pampered him too much. In July, the British Government made the mistake of letting him decide what they were to do for India. This success has made him still more obstinate.

"Now Wavell—In 1942 when Wavell was Commander-in-Chief, an American Journalist who saw him found that he had already passed the best time of his life so far as his intelligence was concerned. Wavell was then a defeated and disappointed General. Wavell admitted that he was caught napping in Lybia and in Singapore and other places and thus brought down the British prestige to less than zero.

... .

Sardar Patel stepped into the breach to stop the riot. He told the Socialist leaders that at a time when there were prospects of a friendly settlement with the British, he would not tolerate any disruptive activities and that he would not let them succeed, through this strike of the R. I. N., in creating panic and confusion in the country. Mrs. Aruna Asaf Ali wired to Nehru to come to Bombay to help the revolt. Nehru took the first train to Bombay. Vallabhbhai sent a special messenger to Dadar and asked Nehru to see him at once and not proceed to the Victoria Terminus where a huge crowd was waiting to receive him. Patel spoke strongly to Nehru and told him of the folly of helping the rioters. Nehru persuaded himself to be converted to Patel's point of view, and after a tame press conference, ad-

I ended the Memorandum by referring to the five men who counted most in India and could help or hinder a settlement:

Gandhiji
Wavell
Vallabhbhai Patel
Jawaharlal Nehru
Jinnah

I wrote: "Gandhiji, I think, will not take any active part in shaping in detail the policy of the Congress; but my feeling is that he would be for avoiding trouble and for peace. So long as he is alive, he would exert some influence on the policy of the Congress.

"The two most active members of the Congress Working Committee who count and who will count most in the near and distant future are Vallabhbhai and Nehru. No secret is made of the fact that they do not like each other and that their policies differ. But they have a common ground to work on—to win freedom and a senior friend to protect and keep them together—Gandhiji. It will be wrong to imagine that Vallabhbhai and Nehru will split—either before or after Gandhiji's death. Whatever their personal differences, they will stick to each other and the Congress policy will be decided by these two working together. These are the two men in India who can deliver the goods and the British Government should make the earliest possible efforts to make contacts with them and come to terms with them. Both, as I have said, have become anti-Jinnah and have given up non-violence.

"Vallabhbhai is a sick man and will have to undergo an operation at an early date. He is postponing it because of the heavy political work.. He is the one man who knows his mind and who can get things done. He is strong, well-informed and exerts the most powerful influence on the country next to Gandhiji. Knowing him as I do, I am confident that if the British Government left aside a bit of their unjustifiable prestige and contacted him, they would not be wasting their time. He belongs to the right-wing of the Congress and is practical minded. He is a bitter enemy of the Communists. He will come to terms with the British if the British are in a mood to settle.

"Unfortunately, Nehru has taken up a strong party line instead of assuming the leadership of all-India. Those who

undisputed leader of the Muslim League and that he represented the Muslims and that Congress had no hold over them.

On the other hand, the Congress secured all the open seats, other than Muslim; the Hindu Maha Sabha and the Independents were wiped off.

The Provincial elections took place between December, 1945 and February, 1946.

The Congress election propaganda and tactics made further estrangement between the Congress and the Muslim League. Nehru and Vallabhbhai said that the Congress would not take any initiative in negotiating a settlement with the Muslim League and that if the Muslim League wanted a settlement, it would have to come to the Congress! Jinnah told me that the Congress would go to him after six months when the election results were known and Jinnah had succeeded in the Muslim provinces.

I told Vallabhbhai in October that the speeches made by the Congress leaders were inciting violence and the Congressmen were talking of blood and thunder. I pointed out that Vallabhbhai also spoke in the same vein! Vallabhbhai replied to me: "Don't worry about the speeches. You just wait. As soon as I form my ministries, I shall put everything in order and you will have no reason to grumble". He knew my opinion and he knew my politics. He knew I was opposed to all kinds of fireworks and that I was in favour of making the best possible use of the opportunities. Vallabhbhai asked me not to worry. This meant that he would follow the policy of the Congress Ministries of 1937.

On the very morning of the day I saw Vallabhbhai, I had a forty-five minute talk with the Bombay Governor—Colville. I discussed with him politics. I put it to Colville that Wavell and the Government of India and the Governor were making a serious mistake in not contacting and coming to terms with the Congress. I told him that the good work done at Simla in July was discontinued and forgotten by the water-tight compartments in which Wavell, Colville and others on one side and the Congress leaders on the other, had put themselves.

At the Simla Conference, Congress had decided to nominate Azad, Nehru and Patel as its representatives on the Executive Council. But for the general elections later in the year, the Congress put up its second rank of leaders and even more junior workers as its candidates. The Congress had approached some prominent non-party men to stand for the Assembly but insisted on their signing the Congress pledge of complete obedience etc.

On Diwali day 1945 (5th November) my son and I called on Jinnah—without appointment—to give him our Diwali Greetings. He immediately called us to the first floor of his newly built house. I wanted to ask if Jinnah wanted Pakistan and if he thought he would win it, how was it that he spent lakhs and lakhs of rupees to re-build completely his old house during the early forties. In March, 1934, just before he fell seriously ill, he told me that he wanted to sell his bunglow. He did not do so because he did not get the price he required. But this rebuilding of the big house was a pointer that he could never have thought that his demand for Pakistan would be conceded. In November, 1945, he had no idea whatsoever of giving up his Bombay home and settling down in Karachi.

I had an interesting talk with Jinnah that day. I asked him if he had heard that Motilal Setalvad, (till recently Attorney General of India), had accepted the Congress invitation to stand for one of the two seats from Bombay for the Legislative Assembly, but that his name was dropped because Motilal was not agreeable to sign the Congress membership pledge. Jinnah said he knew about this and added: "It would have been a pleasure to work with Motilal". Once again, did this mean that Jinnah was keen on Pakistan?

Then he complained that he knew that the Congress was spending lakhs of rupees to get elected to the Central and Provincial Legislatures those who styled themselves as Nationalist Muslims but who were not genuine. The Congress would not get a single Nationalist Muslim returned to the Legislatures, Jinnah told me, and that every seat would go to the Muslim League and this was what happened. Jinnah further complained that in all their election speeches, Jawaharlal Nehru and Vallabhbhai Patel were using foul and insulting language about him. This general election proved once for all that Jinnah was the

Government's position in the international world would be weakened after the war and that they would not be in a position to hold India.

I again asked: "What next?". He said: "Educate, educate". I asked: "Educate whom?" He replied: "Educate first the Hindus and then the British". So I said: "Oh you mean you want to get world opinion in your favour. You want the world including America to see the justness of your Pakistan cause". Jinnah replied he did not care for America. It was enough for him if he got the Hindus and the British to understand his point of view.

I put it to him that sooner or later this problem would be solved to the satisfaction of both parties and asked him whether he did not agree. Jinnah said: "Yes, but you do not realise the factor of time. In between you do not realise how much bitterness is being created. Reconciliation may come sooner or later, but if it does not come in good time, bitterness will remain and the Hindus and the Musalmans even though working together would not be good friends if the settlement is not brought about quickly". He added: "Look at U.S.A. The Americans still dislike and distrust the British and there is all the time friction and criticism between the two, the reason being that the British did not give way in good time to America's demand for independence and America had to fight for it and in spite of the lapse of time the Americans do not like and will never like the British".

Jinnah said that the Congress August 1942 Resolution gave the Musalmans more than what Gandhiji was offering now. I said that the August, 1942 Resolution was giving the Musalmans as much as they wanted and if instead of merely passing the resolution, Jawaharlal had gone to Jinnah with that offer, with slight modifications, the offer would have been accepted by Jinnah and his friends, who knows? It will be remembered that in the Congress 1942 Resolution, the Congress was giving the provinces all the residuary powers. This was one of the demands of the late Sir Fazle Hussein, leader of the Punjab Muslims and Member of the Viceroy's Executive Council. He wanted the provinces to be strong and the Congress, Sapru and other Hindus thought that this was an attempt on the part of the Musalmans to weaken the Centre".

were discussed. I wanted to know what the reaction on Jinnah was, how he was taking the failure of the talks, what his next step was likely to be and what his attitude towards the British Government was.

Jinnah started talking. He had now developed a new habit of twisting and pinching his lower lip, a sign of loneliness and nervousness. I was sitting about two feet away from him and I had to strain my ears to follow what he was saying. He was speaking very low, almost to himself, just whispering, looking not at me whilst talking, but starting in front of him.

That Jinnah had gained nothing by the failure of the talks, was clear from the atmosphere of gloom and depression round about him and the anxious strain that one saw on his face. He had recovered from his recent illness of influenza and he looked well but he told me that he was extremely weak. He had gone very thin. As he was talking, I went on butting in, which he did not mind, to ask him questions carefully worded, as I did not want to make him feel that I was trying to cross-examine him or to hurt his feelings. I think I am one of the very few people who can still make friendly contacts with Jinnah on equal terms. Other friends have fallen off, given him offence by their attitude or are too angry with him to see him any more.

Jinnah went on whispering, "Why did Gandhi come to see me if he had nothing to offer me?" He repeated this question to himself at least ten times. I asked him: "Tell me, do you think Gandhiji was practising cunning on you? Did he come with the intention of not arriving at a settlement? Did he come with a view to put you in the wrong and with a view to create public opinion against you?" Jinnah replied quietly and in a deliberate manner: "No, no, no. I would not say that. Gandhi talked frankly and I have nothing so far as that is concerned against him".

I asked Jinnah, "What next" and I said that before he would answer my question, I wanted to put it to him that the British Government would take the utmost possible advantage of the failure of the talks, would gloat over them, would misrepresent India in foreign countries and would use the failure of the talks as an excuse for continuing their maladministration of India. I asked Jinnah if he did not agree. He said: "Yes, I do; what did you expect me to do? Because the British Government were going to take advantage of the situation did you expect me to commit suicide? I should rather die fighting than commit suicide". I put it gently to him that there was no suggestion of his committing suicide but of making adjustments. I added that the British

telling me that what you wanted mainly was a gesture on the part of the Hindus and you told me that the rest was easy; the details could be filled up. That gesture has now been made by Gandhiji and I feel confident that in spite of the grumblings of Malaviya, Sastri and others and the angry protests of the Congress Socialists supported by the *"Free Press Journal"*, Gandhiji will stick to his word. It is more than possible that you will have to carry him through, as the present opportunity should not be lost. I am not saying anything new when I suggest that you are as big a freedom-loving patriot in India's cause as the staunchest of the Congressmen presumes to be. You also realise, as you have said it in so many words, that the Britishers are taking advantage of the present impasse between Hindus and Muslims and they will not like any political alliance between the two great communities. The point is this: that before the war ends in Europe, we must be in a position to assert ourselves; otherwise England will again be able to take advantage of our weakness and disunity. My best wishes are with you.

"There is another matter to which I would like to draw your attention. Some days back I read in the *"Hindu"* a review of your biography in which it is suggested that as a result of your marriage in 1918 with Ruttie, you got a dowry of Rs. 30 lakhs. This is an absurd and incorrect statement and I think a contradiction may be sent to the *"Hindu"* and to the author."

Gandhiji and Jinnah met for talks in the last week of September and the first week of October. The correspondence published between Gandhiji and Jinnah clearly showed that there was no justification for Gandhiji to carry on these talks for three weeks and raise false hopes in the minds of the country. The very first day's talk should have made Gandhiji realise that there was no chance of succeeding and coming to a settlement. And so, at last when the results were announced, a wave of depression set in, which spread over the whole country and lasted for several months. In this atmosphere of depression, caused by the failure of the talks over the communal problem, the political problem was forgotten. Gandhiji went back to Wardha and the reports of friends who visited him in November/December were alarming.

The following are extracts from my Note of my talk with Jinnah on 17th October, 1944:

Within a minute of my being with him, Jinnah-Gandhi talks

that Jinnah did not want a settlement of any kind and C.R. had to publish the correspondence in order to invite the public to decide on the issue. I felt then and I still feel that if Gandhiji and C. R. had not rushed into print about the C. R. Formula, the political proposals would have had some chance of fair discussions. The country's attention was diverted from the political demands to the communal question, which held the field right till the end of October, when the Jinnah-Gandhi conversations failed to bring about a settlement of the communal problem.

Jinnah had a bad time in May, 1944, over the Muslim League-Unions controversy in the Punjab. Shaukat, son of Sir Sikandar Hyat Khan, a Muslim League Minister, was dismissed by Glancy, the Punjab Governor; Khizar Hyat Khan, the Punjab Premier, under order from Glancy, refused to fall in line with Jinnah, and in the first round, Jinnah had to go under. Jinnah was perhaps smarting under this grievance, when Gandhiji and C. R. gave him an opportunity not only to stage a comeback but also made it possible for him to make a united front against the Congress. Though I have criticised C. R. for this untimely publication of his correspondence with Jinnah, I was a strong and enthusiastic supporter of his efforts at coming to terms with Jinnah, because I felt that he was working on the right lines.

I met Jinnah quite frequently. If the Congress had backed up C. R.'s efforts which, in its unwisdom it did not, C. R. would have succeeded in bringing about communal and political peace and harmony in India.

The Congress was perturbed at Gandhiji's having given way to C. R. and in private conversations, Congress leaders made their opposition to the C. R. Formula quite clear. They accused C. R. of having bamboozled Gandhiji but they could not speak openly against Gandhiji's accepting the C. R. Formula. They hoped, however, that the conversations between Gandhiji and Jinnah would fail.

The Gandhi-Jinnah talks were to be held late in August but they were postponed owing to Jinnah's illness. I wrote to Jinnah on 16th August :

> "On the eve of your meeting Gandhiji I should like to send you my very very best wishes for the success of the great mission of Hindu-Muslim unity and bringing freedom to this country.
>
> "I very well remember the talk I had with you last January and I have ever since been telling my friends that so far as you are concerned, you will not obstruct a settlement on honourable lines. I particularly remember your

indifference to Gandhiji's move.

"Now when I am writing in 1957 and looking at events in retrospect, I cannot refrain from saying that there was an astonishing transformation in the attitude of some of his closest followers on the question of violence *versus* non-violence. Sardar Patel, Dr. Rajendra Prasad, Acharya Kripalani and Dr. Prafulla Ghosh had wanted to resign from the Working Committee when the Congress passed a resolution that it would support the war effort if the British declared India free. They then wrote to me that for them non-violence was a creed and even more important than Indian independence. When, however, India did become free in 1947 not one of them said that the Indian army should be disbanded. On the contrary, they insisted that the Indian army should be partitioned and brought under the immediate control of the Government of India. This was contrary to the proposal made by the Commander-in-Chief of the time. The Commander-in-Chief had suggested that for three years there should be a joint army and a joint command but they would not agree. If non-violence was really their creed, how was it possible for them to take responsibility in a Government, which spent over a hundred crores a year on the army? In fact some of them wanted to increase.

"Jawaharlal was the only member of the Working Committee who fully shared my views."

On 27th July, Gandhiji wrote to Wavell to the effect that he was prepared to advise the Working Committee to renounce mass civil disobedience and to give full co-operation in the war effort, if a declaration of immediate Indian independence were made and a national government responsible to the Central Assembly were formed, subject to the proviso that during the pendency of the war, military operations should continue as at present, but without financial burden upon India. Wavell turned down Gandhiji's request for an interview. Amery said in the House of Commons that Gandhiji's proposals did not form even the starting-point for a profitable discussion. What little chance Gandhiji's proposals had of being judged on their own merits disappeared by the mixing up of issues on the publication of the Jinnah-C.R. correspondence about Gandhiji accepting C.R.'s Pakistan Formula.

After a talk with H. V. R. Iengar, I met Rajaji on 12th July in Poona. I told him that it was a serious mistake to have published his correspondence with Jinnah at this stage. He felt

Gandhiji whittled down his demands. He gave up all talk of 'Quit India,' 'Non-Violence' and 'Civil Disobedience'. By this interview, Gandhiji conveyed his new policy to the Viceroy. It was his purpose, said he, not to hinder but to help the war effort! He had no intention of offering civil disobedience. History could never be repeated; he could not take the country back to 1942. The world had moved on during the last two years and the whole situation had to be reviewed *de novo*. Today he would be satisfied with a national Government in full control of civil administration and would advise the Congress to participate in such a government if formed. Gandhiji promised full co-operation in the war effort. He asked for an all-Indian Executive Council, and if his terms had been accepted, provincial governments would have been automatically restored which too would have been pledged to full co-operation in the war effort. Unfortunately, Gelder's ignorance of the Indian problem was responsible for Gandhiji's statement not being worded properly. Any sensible Government would have jumped at this offer of Gandhiji, but Churchill, Amery and Wavell turned a deaf ear to Gandhiji's proposals.

Maulana Abul Kalam Azad's remarks are pertinent and should be fully reproduced :

> "It will be recalled that when hostilities began, I had tried hard to persuade the Congress to take a realistic and positive attitude towards the war. Gandhiji had at that time taken the stand that political independence of India was no doubt important but adherence to non-violence was even more important. His declared policy was that if the only way of achieving Indian independence was to participate in the war, he for one would not adopt it. Now he said that Congress would co-operate with the British if India was declared free. This was a complete reversal of his earlier views and caused misunderstanding in India and abroad. The Indians were confused, while the impression created in Britain was still more unhappy. Many Englishmen thought that Gandhiji had refrained from helping the British when the issue of war was in doubt. In this, however, they were wrong, for the issue of the war had no influence on Gandhiji's views. They, therefore, interpreted his present offer of support as an attempt to gain British sympathy now that the victory of the Allies was assured. In consequence they did not pay attention to his offer which he had expected. Besides, the British were no longer so much in need of Indian support as they had been in the earlier days of the war. This also contributed to their

GANDHI-JINNAH MEETING—September 1944.

ON 5TH JUNE, 1944, came the Second Front Day—the landing of the Allied troops in Normandy. A journalist friend told me on that day "My dear chap, you can now whistle for India. The Second Front news will hold the field for the next six months".

Gandhiji was obsessed by two things. He did not like the idea of being called a pro-Jap. He also resented the suggestion that he and the members of the Working Committee and the leaders of the Congress were in any way responsible, directly or indirectly, for the movement of violence and sabotage between August, 1942 and 1944. All his mind, energy and attention concentrated on these two topics.

In June 1944, Bhulabhai Desai told me very frankly that Gandhiji and Vallabhbhai had miscalculated in 194 the strength of the British and the Americans. Gandhiji thought England would not win the war, not realising how strong he Americans were. Now the Allies were winning the war with the help of the United States and India had to pay the penalty of wrong judgment on the part of Gandhiji and Vallabhbhai.

In June, in Poona, instead of a straightforward withdrawal of the civil disodedience part of the 1942 Resolution, Gandhiji quibbled about the legal position of the Resolution and said that he could not withdraw civil disobedience. He was unhappy about the non-release of his colleagues of the Working Committee. He was overwhelmed with grief over the stories of violence and sabotage during the two years of his incarceration in the Aga Khan Palace. Many underground workers of the sabotage movement wanted by the Police, saw Gandhiji in Poona. Gandhiji advised them to surrender to the Government. His advice was not accepted by them.

I was holidaying in Poona early in July. Steward Gelder of *The News Chronicle* came to meet me. He and I went to Panchgani. He wanted to interview Gandhiji but he had no appointment to meet him. However he was confident that Gandhiji would give him the interview. I told him that Gandhiji had definitely said that without prior consultation with his Ahmednagar colleagues, he would not make a policy statement.

Curiously enough, Gandhiji gave him an interview. With Gandhiji were staying Rajaji, Dr. Sushila Nayyar who was nursing Gandhiji during his convalescence and Shantikumar Morarji.

non-congress friends meant absolutely nothing. It appeared, therefore, that the good feeling created by the release of Gandhiji would evaporate because of inaction on both sides. Efforts had to be made to take full advantage of the situation as a result of Gandhiji's release.

I was hoping that the good atmosphere created by the release of Gandhiji would help in the solution of the difficult Indian problem and I wrote to the Governor of Bombay, Sir John Colville, suggesting that he should call on Gandhiji to inquire after his health. I received a formal ackowledgement but my suggestion was not carried out. Due to Gandhiji's weakness and bad health it would not be possible for him to make any move towards reconciliation and I was told that he would not do so without prior consultation with his colleagues who were still in the Ahmednagar Fort.

Mrs. Naidu kindly arranged a ten minute talk for me with Gandhiji on 10th June, 1944, the idea being that I should do all the talking. The following are extracts of my note dated the 20th June, 1944.

"Prior to seeing Gandhiji, I had sent to Mrs. Naidu my notes on my talks with Jinnah in January and Colville in February. When I met Gandhiji on Saturday, the 10th June at 4 p.m., he told me that he had his watch in his hand and he would throw me out as soon as my ten minutes were over. I told him that I had made a slip of the tongue in telling Mrs. Naidu that I wanted a ten-minute talk. I really meant ten hours. I added that I had two political nick-names, "encyclopaedia", given to me by the late Sir Ibrahim Rahimtoola, and "Narad" given to me by my mother. I said that it would be an exaggerated claim if I called myself "encyclopaedia", but I accepted the name of "Narad" in its true and real sense, meaning thereby—possession of a sense of humour and an intense desire to put matters right, but not the popular interpretation of "Naradism" namely making people fight and enjoying their quarrels.

ful music, sung by two girls from Gandhiji's Ashram. At a particular part of the song, Gandhiji jerked his head. The words beautifully set to music, which thus affected him were:

"May God protect the faith and reputation of the blind". The music stopped. The prayers were over. Bowls were then taken round for collection of money for Gandhiji's Harijan Fund.

I went near Gandhiji. He greeted me in a friendly way. He was observing his silence imposed on him by his doctors for a fortnight, and he talked to me by gestures, enquiring after Sir C. P.

In January, 1937, I had a long talk with Gandhiji in Trivandrum on the futility of the prayers for crowds, in which he was indulging and told him that they did more harm than good, as they set a premium on laziness and hypocrisy, and made superstition, bad as it was in this country, much worse because of the support he gave to such prayers. I told him then that his idea of prayers and the crowd's idea of prayers were two different things and he was rendering a disservice to humanity by strengthening superstition. He said he did not agree with me.

Gandhiji was very very ill, Mrs. Naidu told me. She told me that Gandhiji was not getting enough rest. There were too many people to harass him for interviews in spite of her best efforts and Gandhiji was no better today than he was when he arrived in Bombay ten days ago. She was feeling anxious about Gandhiji. It was in spite of her very strong protest that Gandhiji toured the explosion area in the Bombay Docks and later saw in Juhu the film "Mission To Moscow". Gandhiji sat through the two hours of the picture. The film distressed him very much because of the pathos and the scenes of drudgery and slavery that depicted the lives of the common Russian.

Soon after the prayers I asked Mrs. Pandit what place this kind of prayers would have in the Kingdom of Jawaharlal. First she gave a vague and evasive reply but when I persisted she said: "This prayer is a farce and I do not believe in it. I only attend it out of my respect for Gandhiji".

The Press had not rendered any service to Gandhiji by indulging in the luxury of kite-flying as regards his intentions and movements. He had not said anything to anybody. He had not disclosed his plans, if he had any. I was afraid he was too ill to have any definite plans in his mind for the moment.

All this meant that the next step, the first step being Government's release of Gandhiji on medical grounds, was not with Gandhiji. For three months atleast he could say or do nothing. The newspaper reports that he wanted to consult Congress and

with Gandhiji and Nehru, tell them how the situation had developed during the last 18 months and between them they could make further suggestions. I thought this would help in easing the political situation.

The Governor told me that he found my talk interesting. He said he was not accustomed to getting such views as I had frankly expressed and they helped him as they brought a fresh point of view and stimulated his mind. He then discussed the Tata Plan for economic development.

Colville said that he had received fullest co-operation from the people of Bombay Presidency and because of this co-operation the rationing scheme had proved successful. I told him that the rationing scheme was successful not only because the people co-operated, but also because such co-operation was made possible by the Bombay Secretariat. I mentioned particularly Iengar, Barve, Bakhle, M. J. Desai and Gorwalla.

Colville asked me why Jawaharlal had yielded to Gandhiji. I said firstly personal affection and respect for Gandhiji. Secondly, Jawaharlal was the weaker and younger man of the two and Gandhiji was, therefore, able to control him. Further Jawaharlal knew that he would lose his popularity and political position if he opposed Gandhiji.

It was fortunate for Bombay that Colville was, like his predecessor, Sir Roger Lumley (later Lord Scarborough) a man of understanding and sympathy.

Gandhiji was released from the Aga Khan Palace on account of his serious illness in the second week of May, 1944. Dr. Sushila Nayyar writes in her story of the Aga Khan Palace that she had been watching Gandhiji from the time the Inspector-General of Prisons informed Gandhiji that he was to be released the next day. Gandhiji felt more and more depressed. In the evening, Sushila Nayyar asked him why he was feeling so depressed. Gandhiji said he was scared to death; what would he do after he was released! Gandhiji had gone to stay at Juhu to recoup his health. I met him at Juhu on 17th May, 1944, after the evening prayers. I recorded:

"I sat through the prayer quietly, next to Mrs. Pandit. Gandhiji walked up to his dias, looked very ill and thoroughly exhausted. As soon as he took his seat, the three or four minutes silent meditation began. Gandhiji went straight into deep meditation. His mind was all alert and during the meditation, he was completely immersed in it. The 'slokas' from the Gita were then chanted; Gandhiji listened to them attentively. Then music started, beauti-

I had one more complaint — it was about the snobbish and rrogant attitude and behaviour of the British Community in India particularly their women-folk.

I asked the Governor if he knew the number of advisers appointed by the Government of India under the guise of experts. I objected to British experts because we distrusted British bona-fides and, therefore, our suspicions got still worse when Britain forced her experts on us. The British Government had floated and financed the U. K. C. C. (The United Kingdom Commercial Corporation) which was to control and monopolise in British hands the imports and exports from and to India, during and after the war. This was thus no indication that British wanted to transfer political power to India after the war was won.

I told Colville that I considered it a mistake on the part of the Congress not to have come to terms with Cripps. Cripp's proposals — (a) the transitional period to end with the hostilities, (b) Dominion Status or Independence after the war.

Our people thought that they could safely ignore (a) as they had done so far and when the war ended, they could cash on (b) that is, take up Dominion Status or Independence. That attitude, I thought, was wrong.

Colville asked me for more suggestions. I replied: "Release Gandhiji and his friends unconditionally. Put them out of jail". I said I was afraid that Government would not follow this advice. I, therefore, made another suggestion. "Take Gandhiji to Ahmednagar and let him meet his friends of the Working Committee. Let them consult together". I told Colville how difficult it was for a man to know through the papers what was really happening in the country when he was deprived of all opportunities of human contact and consultation and discussion with his colleagues. I put it to Colville that it was impossible for Gandhiji to visualise the events in India of the last 18 months because of his lack of contact. Government's remaining stubborn on this matter made one feel that Government gloated over the continuation of the present deadlock and that they did not want any way out. So my first suggestion was that Gandhiji and Nehru and the other members of the Working Committee should meet at Ahmednagar.

I further suggested that Gandhiji's meeting with his friends at Ahmednagar should be followed by Government selecting a few men, among them, Rajaji, Liaquat Ali, C. P. Ramaswamy Aiyer, G. D. Birla and Sir Francis Low, to meet the detained Congress leaders. All these men were known to the Government and could be trusted. They could be trusted to have a free and frank talk

friends.

"You will have by this time seen the plan for the economic development of India published by Tatas. I am sending you herewith Sir M. Vishweshwaraiya's two pamphlets "Prosperity Through Industry" and "District Industrialisation Drive".

I sent to Sir John Colville (then Governor of Bombay) my notes of my talks with Jinnah on 14th January and met him on 4th February. Colville said that he found my note on Jinnah interesting and was glad to find that I thought that a settlement with Jinnah was possible.

Colville asked me many questions. He said — I am quoting from note — "So far as the Hindu-Muslim trouble was concerned, he knew that some of his own people were anxious that the trouble should continue and that no settlement should be arrived at because then they thought they would be free from any responsibility and could let the present dead-lock continue". Colville added: "But I am not one of those people who want the trouble to continue. I want a settlement and I think that the responsibility of the continuance of the impass is on us. It is one against us that no settlement has so far been arrived at".

Colville asked me what I thought of the present situation and how I thought the solution should be brought about and he asked me to make constructive suggestions.

I told him that it was not correct to say that Wavell was not interested in politics. It was alright in the first two or three months of his coming to India to say that he wanted to win the war and to solve the food problem. Wavell, and the British Government, not doing anything helpful exasperated us, and we, non-Congress people, more than distrusted the bonafides of the British.

I told Colville that Churchill was a sick man and he had no fresh mind to bring on the Indian problem. He had made up his mind long before 1935 and whilst he was a great War Minister, on the problem of India, he had a closed mind. Colville thought that as soon as the War ended, Churchill would give up. Churchill, being the stronger of the two, had a hold on Roosevelt. But at the Peace Conference, I felt Russia would give trouble to England and England's difficulties would be India's opportunity. It was in England's interest to settle the political problem with India before the Peace Conference.

I told Colville that I had met at least six people who had talks with Wavell recently in Bombay and Delhi. They told me that Wavell just listened but did not disclose his own mind. Apparently, he had not made up his mind.

Pakistan. N. P. A. Smith, Inspector-General of Police, formerly in the Intelligence Department of the Government of India and in 1939 when the War started Dy. Commissioner of Police, told me soon after the Congress gave up the Ministries in the Provinces that Congress would make a great mistake in not coming to terms immediately with Jinnah, as in six months' time, it would be too late to come to an agreement. I did not realise then that he was anticipating what he must have known was coming — the Pakistan Resolution of Lahore, 1940.

Jinnah told me that Rajaji was decent, genuine, well-meaning and honest, but he wanted Rajaji to be a little stronger to fight it out with Gandhiji. Jinnah added: "Rajaji is a dear fellow. I like him very much and I am sorry for him". Jinnah felt that it would be less difficult to come to terms with Nehru than with Gandhiji.

I then mentioned to Jinnah the other point made by the personal opponents of Jinnah, viz. that a conflict had already arisen in the Muslim League between the Muslim Zamindars and the other less fortunately placed younger generation of the Muslims, the peasant class. I referred Jinnah to the Punjab and Karachi. Jinnah replied: "You have known me for so many years. Have I ever cared for vested interests? Did you think I cared the slightest bit for these wretched Zamindars? Take it from me, there is no conflict in the Muslim League and the Muslim youth is not going to revolt against me. This was more than wishful thinking. Our opponents want to weaken the League by spreading such rumours but you can take it from me that they would not succeed. They were only making themselves ridiculous by spreading such false rumours which would not help them at all".

Jinnah said that many prominent Hindus were going to him day after day and they were telling him that they agreed that the Congress was all in the wrong, but that they had no courage to come out publicly to say so. Jinnah further said that it was not too late yet to come to a settlement and that there were enough Hindu Congress leaders left outside the jail who should take the lead in coming to terms with the Muslim League. All that was needed was courage to oppose Gandhiji with whom in their heart of hearts they did not agree.

Jinnah then came back to where I started and asked me to send him as much information as I could get together regarding the industrialisation schemes that were being prepared".

I wrote to Jinnah on 4th February, 1944:

"I am grateful to you for the talk I had with you on the 14th January. My reactions are that if Gandhiji and Nehru want a settlement with you, they can have it. I am saying this to my

to agitate and work for Gandhiji's release. But Gandhiji wanted to take advantage of my honest offer and I refused to get caught by him". Jinnah said that he was mainly responsible for getting Gandhiji released in 1924. I added to this that he was also responsible for the release from internment of Mrs. Besant in September, 1917. "But, of course", Jinnah stated, "Mrs. Besant was my leader and I was only her lieutenant and it was my duty as her lieutenant to get her back in our midst and to continue the work under her leadership. She was a great leader and it was a pleasure and a privilege to work under her."

Jinnah was still proud of his work with Mrs. Besant and other colleagues and nobody worked more for the political, economical and spiritual unity of India than Mrs. Besant. Jinnah looked back to the past with pride and pleasure and he had not forgotten her work for India.

To get back to Jinnah's questions: "What did I want? What was it in my demand that was unreasonable? I was asking for Pakistan, mind you, it was only the *principle* that I was asking for, *principle* of Pakistan. What wrong had I done? Did not the Hindus and the Hindu Congress realise that if we and they joined hands together we should get rid of our common enemy? Once we agreed on this point and working together we were able to throw out the British we could adjust our details and bring about an arrangement for fullest possible co-operation".

Jinnah then referred to his talks with Bhulabhai Desai, Satyamurti and Gobind Ballabh Pant in 1936 who were then prominent members of the Congress Party in the Central Legislature. In 1936, Jinnah said that he came to terms with these three Hindu leaders on the lines that whilst they all disliked the Communal Award and were, therefore, making efforts to improve upon it and make an agreed settlement which would be more fair to the Hindus and the Muslims and would bring about more unity in future action amongst the two major communities, they were prepared to work together till such an agreement was arrived at on the basis of the already existing Communal Award. Bhulabhai, Satyamurti and Pant went to the Working Committee for the endorsement of this arrangement, but Gandhiji and Nehru would not hear of it.

In passing it must be mentioned that in March 1937 when Kher refused to form the Congress Ministry and in July when a Congress Ministry was formed, Jinnah played the game and was willing to co-operate with the Congress on honourable lines.

Even in 1939 after the War started, the Congress could have come to terms with the Muslim League without any talk of

where there was no question of a dividing line between Pakistan and India. Jinnah agreed with this point of view but he did not know anything about these plans. He knew nothing of the Conference that Tatas held six months ago. He told me that he would be grateful if I could send him some literature and some information and he would study it. I suggested his getting in touch with J. R. D. Tata. He said he would".

Jinnah saw clearly what I meant to convey to him without saying it in so many words that his talk of partitioning India would turn into empty nothings the moment one thought of working out the details of such a partition. This oneness of the whole country from the economic and individual point of view put me on the next important point which has been debated every time Pakistan was discussed. I threw it at Jinnah. What would the foreign policy of Pakistan be in matter of defence or outside attack? He repeated to me what he told me six months ago. There would be one common policy for India and Pakistan.

Jinnah asked me in agonised tones: "My dear Kanji, what has Jinnah done to deserve all this vituperation, misinterpretation and this misunderstanding? Why is the Hindu Press after me? Why are your Hindu friends attributing motives to me and calling me a traitor? Why were they forgetting my past record of work? Why were they thinking that I was such a fool as to play into the hands of the British Government and be their tool to keep freedom away from this sub-continent?"

Jinnah then referred in detail to Gandhiji's letter to him of last year. He said that the Government of India had written to him long before their communique was published telling him of Gandhiji's letter to him and their decision not to forward it to Jinnah. Jinnah said: 'Government of India showed me this courtesy of informing me beforehand, not because they had any love for me which they have never shown in the past, but they wanted to make sure that I would not be caught in the trap and I would not rush into print without due thought if I read for the first time in the papers that Gandhiji had written some letter to me and Government had refused to forward it to me. Naturally, therefore, I had more time to think carefully of the implications of Gandhiji's letter".

Jinnah then read extracts from his Presidential Address to the Muslim League Conference of April, 1943. "Yes", he said "I did want a letter from Gandhiji and I had asked for it in my speech, but not the kind of letter that Gandhiji wrote. You see, I was really working for Gandhiji's release when I made that speech. If only Gandhiji had written a more detailed letter on the lines indicated by me in my speech, it would have given me a handle

put in writing. Besides it was not possible to give practical shape to this direct approach because the Congress leaders including Gandhiji were in jail and, therefore, no discussions could be held with them.

At the end of 1943, the whole political horizon was dark. There was not even the proverbial silver lining. Churchill had stood against all reforms. The communal problem could not be solved because the Congress leaders were in jail. It was at this time (27th November, 1943), that Sir B. Narsing Rau told me in New Delhi that to overcome British opposition the Congress would do well to concede to Jinnah the principle of Pakistan and agree to have a ten year interim Government consisting of the Congress and the Muslim League. This ten year period would be utilised to set up commissions to fix boundaries between India and Pakistan and for the friendly exchange of population. Foreign policy, defence and communications would be common subjects of the two countries. Ten years of working together in an Interim Government would make the parting at the end friendly and peace would prevail between the two parts of India.

Could politics ever be discussed in such an objective, dispassionate manner as to have made Narsing Rau's suggestion feasible?

In my long letter to the Indian Social Reformer (8th January, 1944) I *inter alia* wrote :

"Politically we are back in the 1860s and our leaders are still indulging in the luxury of quiet jail life and the rest of them who are out, go on making speeches, making the situation worse every time they open their mouths".

The following are extracts of the records of my talk with Jinnah:

"I had an hour and forty-five minutes' friendly and cordial talk with Jinnah on Friday, the 14th January, 1944. I set the ball rolling by referring to the Tata Plan for the economic development for India. I gave Jinnah some idea of Sir M. Vishweshwaraiya's plan and of Dr. John Mathai's "Astronomical Figure Schemes" for the whole country.

"I told Jinnah that I had read his recent speeches in Karachi and other places where he talked of making schemes and programmes for the economic uplift of the Muslims and of his appointing a Committee of Action. I mentioned the two pamphlets by Sir M. Vishweshwaraiya on "Prosperity Through Industry" and "District Industrialization Drive". I asked Jinnah how and where he would fit in with these new schemes of industrialisation. I told him that he would be interested in the schemes as he would be able to find employment for Muslims in all the provinces. I emphasized the fact that here was our programme for all India

Gandhiji's passing away. They had even arranged for sandalwood for his cremation inside the Aga Khan Palace!

Government permitted Dr. B. C. Roy and other physicians to stay with Gandhiji. Dr. Gilder was already there. Other friends, including Rajaji, hurried up to Gandhiji's bed-side. One afternoon, I telephoned to H. V. R. Iengar, the Home Secretary, for permission to go and meet Gandhiji. He said it was too late. Gandhiji was in a state of coma and was not expected to live for more than a few hours. The miracle happened and Gandhiji survived the fast.

During his period of convalascence, Rajaji discussed with Gandhiji the question of a fresh approach to Jinnah to settle the communal problem. Gandhiji was agreeable to this on the basis of Rajaji's formula.

Jinnah in his Presidential Address at the Annual Session of the Muslim League at New Delhi on 24th April, 1943, said that he would welcome it if Gandhiji was now really willing to come to a settlement with the Muslim League; and he suggested that just as Gandhiji was writing to the Viceroy, he could as well write to Jinnah. In response to this, Gandhiji wrote to Jinnah and asked Government to re-direct the letter to him. Government informed Jinnah about this but did not forward the letter to him.

In the autumn of 1943, I met Jinnah after he returned from New Delhi: I told him that the Congress had gone completely negative and the country's interests were suffering for want of any strong effort to win Swaraj and he should resume his all India leadership not only of the Muslims but all the other communities as well. I added that he was an all-India leader of the Home Rule League days and he would be able to gather together a big non-Congress political party of Hindus, Muslims and other communities and I said that actually Hindus were looking up to him for such a leadership. He said he had noticed a change for the better in the Hindu feeling and it was friendly to him. And then he told me that Rajaji, G. D. Birla, Lala Sri Ram and Sir Purshottamdas Thakurdas had met him in New Delhi and suggested that all of them should work together and as a beginning they were willing to concede the principle of Pakistan. Jinnah said this was a welcome sign and if only these leaders would put down this proposal in writing he would welcome their co-operation and they would all work together and he would like something to this effect in writing so that he could act on the basis of their suggestions.

The next day I met Sir Purshottamdas and G. D. Birla separately. They were both surprised that I should know about their meeting Jinnah. They said that such matters could not be

TALKS WITH JINNAH AND COLVILLE, 1943
GANDHIJI'S RELEASE AND TALKS WITH GANDHIJI

THE COUNTRY-WIDE disturbances which followed the passing of the "Quit India" Resolution were interpreted by the bureaucracy for the benefit of the Allied Nations, particularly America, as a deliberate interference with the organisation of offensive operations against Japan, with India as its main base and source of supply. For four months this criticism went on to influence the world and to discredit Gandhiji. Gandhiji felt extremely grieved at this misinterpretation of his philosophy of non-violence. He wrote to Lord Linlithgow protesting against this official propaganda, asking to be convinced by proofs of the complicity of the Congress with the violence that the arrest of Congress leaders had precipitated. He assured the Viceroy that he would make 'ample amends' if the official charge-sheet could be brought home to him. This letter made no impression on the Viceroy.

On 29th January, 1943, Gandhiji, from the Aga Khan Palace, wrote to the Viceroy that he would undertake a fast for twenty-one days, beginning from 9th February, describing it as a fast for self-purification. Maulana Azad in his *India Wins Freedom* wrote:

> "I was convinced that Gandhiji was prompted to take this step for two main reasons. He had not expected that Government would arrest the Congress leaders so suddenly on 9th August, 1942. He had also hoped to develop the movement on non-violent lines according to his own ideas. Both his hopes had been shattered. He accepted the responsibility for what had happened and as was usual with him, he was planning to undergo the fast as an expiation for the situation. I could not see any sense in his fast or any other hypothesis".

The Government, however, took a different point of view. Government thought that Gandhiji could not at 73 with his bad health stand a three-week fast. They further felt that to go on fast under these circumstances was courting certain death. They thought that this was Gandhiji's intention and Gandhiji wanted the Government to be held responsible for his death. It was later learnt that Government had made all the arrangements in the event of

I put more questions to Jinnah asking for details about his Pakistan. He answered by pleading: "My dear Kanji, one gesture, one friendly gesture was all that I was asking for and it was not forthcoming from the Congress. If the Congress would make this gesture, the whole problem would not be difficult to solve."

Jinnah was feeling extremely weak and shaky and was, I felt, in a mood to settle with the Congress on reasonable terms. But the Congress leaders were in jail and there was nobody from the Congress for the next three years to initiate helpful discussions. This period gave Jinnah time to organise his strength. The imprisonment of the Congress leaders left the field open to Jinnah and gave him a welcome opportunity to dominate the political scene and to make good use of and exploit the official exasperation with the Congress, for consolidating the position of his party in the Provinces.

The Congress had gone far deep into a blind alley and it could not extricate itself. The Government had also gone into a blind alley. They held that unless the Congress categorically withdrew the "Quit India" Movement, the Government could not release the leaders nor could it take the initiative for talks on further reforms. The situation created by the underground Congress Socialists, with their violent and sabotage movements, was mainly responsible for the continuation of the impasse. And so, 1942 rolled on to its disastrous end.

Jinnah spurned down the offer. He wanted executive action from the Governors on his one-sided attack.

Gandhiji's idea was to meet and negotiate with the Viceroy after the passing of the 8th August Resolution! And Nehru was to have met Jinnah.

On 28th August, I had a 90 minutes' friendly and frank talk with Jinnah. I asked him what justification he had for taking up a recalcitrant attitude, simply because he thought the Congress was in the wrong. I told him that friends like me expected Jinnah to take up a helpful attitude. Jinnah complained that the Congress had sent a political nonentity to negotiate with him, with Gandhiji's authorisation. Jinnah further complained that the mentality of the Congress was all wrong. By not understanding the realities of the situation, the Congress made it possible for the common enemy, the British, to continue its rule over India. Jinnah emphasised that he was as much for Independence as anybody else and he blamed the Congress for keeping the country under British rule. Jinnah said that the present attitude of the Congress would either keep the British or bring the Japanese here.

Jinnah told me that Rajaji had met him in New Delhi about three months ago. He said Rajaji was one of the best men of the Congress — A man with brains, capacity and service behind him who did his utmost to bring about a settlement. What did the Congress do for him, asked Jinnah — it threw him out.

Rajaji went to Wardha feeling hopeful that Gandhiji would accept Jinnah's terms, but Gandhiji turned them down.

Jinnah asserted that Pakistan did not mean a Pan-Islam movement. It would be confined within the geographical limits of India. As regards foreign policy, India and Pakistan would work together.

Jinnah said that he would be in a minority in the Bombay Presidency and would have no place in the government unless the Hindus who wanted to take advantage of his knowledge, experience and study invited him to join them in government. Jinnah was not thinking in terms of Pakistan nor did he think of becoming the Head of a new State of Pakistan. In fact Jinnah never imagined that Pakistan would ever come into being.

I found Jinnah depressed and with a feeling of terrible loneliness. I appreciated Jinnah's frank talk with me and asked him if he met other friends like the non-official British community in Bombay. Jinnah replied that nobody came to meet him; he was not in touch with non-official Europeans nor Government members. I could detect that he was unhappy at being so lonely and forsaken.

gress regime. I trust that all public meetings will be conducted in an orderly manner and with all due sense of humility, and nothing should be done which will cause offence to any other community, because it is the High Command of the Congress that is primarily responsible for the wrongs that have been done to the Mussalmans and other minorities.

"Resolution: This public meeting of the Mussalmans records its opinion that the Congress Ministry has conclusively demonstrated and provided the falsehood of the Congress claim that it represents all interests justly and fairly by its decidedly anti-Muslim policy. It is considered opinion of this meeting that the Congress Ministry has failed to safeguard the rights and interests of the Mussalmans and other minorities and interests.

"That the Congress Ministry both in the discharge of their duties of the administration and in the Legislature have done their best to flout the Muslim opinion, to destroy Muslim culture, and have interfered with their religious and social life, and trampled upon their economic and political rights, that in matters of differences and disputes, the Congress Ministry invariably have sided with, supported and advanced the cause of the Hindus in total disregard and to the prejudice of the Muslim interests.

"The Congress Government constantly interfered with the legitimate and routine duties of District Officers even in petty matters to the serious detriment of the Mussalmans, and thereby created an atmosphere which spread the belief amongst the Hindu public that there was established a Hindu Raj, and emboldened the Hindus, mostly Congressmen, to ill-treat Muslims at various places and interfere with their elementary rights of freedom. This meeting, therefore, expresses its deep sense of relief at the termination of the Congress regime in various Provinces and rejoices in observing this day as the 'Day of Deliverance' from tyranny, oppression and injustice during the last two-and-a-half years, and prays to God to grant such strength, discipline and organisation to Muslim India as to successfully prevent the advent of such a Ministry again and to establish a truly popular ministry which would do even justice to all communities and interests".

These were wild and dangerous charges and there was no element of truth in them. The Governors under Section 93 who were directly responsible for the maintenance of the rights of minorities, took no notice of these charges. Babu Rajendra Prasad [illegible] the arbitration of Sir Maurice Gwyer, Chief Justice, but

The Viceroy made a broadcast talk expressing his disappointment over the rejection of his proposals but hoped that those differences would be resolved "only by negotiations, carried out in a spirit of mutual accommodation and trust and with a firm resolve to succeed." He promised to continue his efforts at a settlement.

In spite of the failure of the talks with the Viceroy, Jinnah broadcast the following Id message on 13th November, 1939. Jinnah after preaching love and harmony with the other communities, said:

"It is not great speeches and big conferences that make politics. Several young men have been coming to me to know how they could serve their country.

"Well, young friends, if I touch upon politics to-night, it is only to tell you, as a word of advice that we have our rights and our claims in a future India. But we shall not be obstinate about them, for obstinacy will be the negation of that spirit of love and toleration which should fall upon us on Id day and whose blessings the Prophet commands us to communicate to others. But each one of us can serve our country by disciplining himself and discipline is the essence of this holy period.

"Is one regular in one's habits?, Does one sleep at the proper time? Does one keep to the left of the road or abstain from throwing litter on the road? Is one honest and sincere in one's work? Does one render such help as one can to others? Is one tolerant? These may seem small matters but in them is the nucleus of a self-discipline which will be of immense value in the combined efforts of all communities and all creeds towards greater India. This will be a service to our country which may not bring you into the limelight of policies but it will assure you a lasting peace in your heart in the knowledge that you have contributed your share to making the politicians' task easier."

Jinnah, however, did not translate his Id message into practice. He followed this up on 2nd December with his announcement to observe the exit of the Bombay Congress Government by observing the "Day of Deliverance" on 22nd December:

"I wish the Mussalmans all over India to observe Friday the 22nd December as 'the Day of Deliverance' and thanksgiving as a mark of relief that the Congress regime has at last ceased to function. I hope that the Provincial, District and Primary Muslim League all over India will hold public meetings and pass the following resolution and after Jumma prayers offer prayers by way of thanksgiving for being delivered from the unjust Con-

was required as was remarked in the course of the discussion was a degree of agreement in respect of the provinces, such as to make it possible for my visitors and the organisations which they represented to put forward a scheme which could be considered for the Centre.

"I added, in regard to any arrangement at the Centre:— Firstly, that one would hope that it might be found practicable to include also one or possibly more representatives of other important groups, and that was a question on which I should value your advice when we came to grapple with details. Secondly, that the arrangement which I invited you to consider for the Centre would be an *ad hoc* arrangement for the period of war and would be quite distinct from the much wider question of constitutional reform at the end of the war.

"This would be a make-shift arrangement under the existing law."

In his statement, on 17th October, 1939, Viceroy had said:
"I have in what I have just said, made clear that the inten-
tion and the anxiety of His Majesty's Government is, as is
stated in the Instrument of Instructions to the Governor-General
to further the partnership between India and the United King-
dom within the Empire, to the end that India may attain her
due place among the great Dominions".

Gandhiji and Rajendra Prasad met Jinnah. They could not
come to any agreement. Rajendra Prasad replied to the Viceroy
on 3rd November, rejecting the Viceroy's offer as both Gandhiji
and he missed at the interview any reference to the main and
moral issue raised by the Congress about the clarification of the
war aims without which it was impossible for the Congress to
consider any subsidiary proposal. Rajendra Prasad objected to
India being declared a belligerent country without the consent of
the Indian people. Rajendra Prasad further said:

"The Congress Working Committee, as you are aware, issued
a lengthy statement on September 14, in which they invited the
British Government to declare their war aims and in particular
how these aims were going to apply to India and to be given
effect to in the present. It was further stated that the Indian
people must have the right of self-determination by framing
their own constitution through a Constituent Assembly without
external interference and should guide their own policy".

Rajendra Prasad resented the "communal questions being
dragged in this connection".

Jinnah wrote to the Viceroy on 11th November turning down the Viceroy's proposals.

me that this chastened attitude of those mischief-makers would give the right-wing Congress Government a good innings of ten years to consolidate its position and then it would be too strong for anybody to shake!

The next three or four months saw nothing but a policy of drift both among the Congress and the Government. No definite action was taken by either to contact each other in spite of the probability of a war breaking out in Europe. On September 3rd, England and France declared war against Germany. This was followed by an immediate action unilaterally taken by the Government of India to join the war against Hitler. This was the first wrong step taken by the British Government and the Viceroy. The Viceroy could have, instead sent for and consulted Jinnah, the leader of the Muslim League, and Rajendra Prasad, the President of the Congress and Bhulabhai Desai, the leader of the Opposition in the Legislative Assembly. This omission on the part of the Viceroy was resented by the whole country. The Viceroy saw Gandhiji on 5th September. Gandhiji said he could not speak for the Congress but on his own behalf, he would offer unconditional co-operation to the Government of India. Within the next five or six weeks, the Viceroy met as many as 52 'leaders' of the majority and minority communities, including the Congress leaders Gandhiji, President Rajendra Prasad, Vallabhbhai and Abul Kalam Azad and Jinnah. This was followed by the Viceroy's statement issued on 17th October, 1939. The statement was most disappointing and unsatisfactory. Federation was scrapped and no definite promise for the future was given. The Congress strongly protested and called upon the Provincial Congress Ministers to resign with implied threats that civil disobedience might be started. The Viceroy once again jointly met Gandhiji, Rajendra Prasad and Jinnah and followed it up with a letter to them on 2nd November:

> "The proposition which I invited you and the other gentlemen present to consider as leaders of the Congress and Muslim League was that, given the great importance of ensuring harmonious working at the Centre, you should enter upon discussions between yourselves with a view to discovering whether you could reach a basis of agreement between yourselves in the provincial field, consequent on which you could let me have proposals which would result in representatives of your two organisations immediately participating in the Central Government as members of my Executive Council. I brought out too that in my judgement it ought not to be necessary absolutely to resolve every detail of such differences as may exist in the provinces. What

where everyone has the feeling that he is living in a transitional phase and where no one knows who will be his next master. There is a good deal of sitting on the fence and playing for time. The files move through the offices more slowly than ever. Meanwhile the Congress appears to be steadily increasing its hold in the provinces, and may eventually arrive at a position when it can dictate to the British Government terms much more favourable to itself than those it would be willing to accept today. Mahatma Gandhi, while he lives, has tremendous power, and is exerting that power in favour of moderation. It is possible to seek through him a kind of compromise solution that would be spurned by Jawaharlal Nehru or Vallabhbhai Patel or Subhas Bose or Abul Kalam Azad or any other political leader of the Congress. The moderate Congressmen all say privately, 'Gandhiji is your best friend; act while he is still alive and is still ready for compromise'.

"These are the arguments for rapid action. But they do not seem to be conclusive. Against the moderation of the Mahatma may be set the fact that his existence makes the all Indian politics unnatural. There is no figure to compare with him, and the scene may change radically after his disappearance. Why try to build on such insecure foundations? His personality more than anything else serves to maintain the unity of the Congress.

....

In Bengal, there was labour unrest due to left-wing Socialist and Communist activities, aided and abetted by Subhas because of Communist money coming from abroad. Further, the Fazlul Huq Government was weak, the reactionary and conservative employers — British and Indian — had no sympathetic understanding and imagination about the labour problems and the conditions of work in the labour world were inhuman.

On the other hand, in Bombay, the labour situation was quiet and the left-wing mischief-makers showed no fight. Munshi told

British point of view only if we insist on having, so to speak, a solid Tory bloc readymade in any federal constitution for India. If, on the other hand, that objective — so prominent in the Round Table Conference — has now been given up, then the refusal will amount to nothing; whereas they now have a chance of deciding the terms on which they will share its life. Provided the British Government is prepared to use the leverage of a possible B.itish Indian federation, resistance from the Princes' side is not likely to cause really serious trouble.

"One cannot be so sure about the Muslims. Both Jinnah and Sir Sikandar Hyat Khan told me that the Muslims would 'fight' rather than accept a 'Hindu Raj'. It is, however, difficult to see on what front and with what weapons they would fight, except it be by mutiny in the Army. That does not seem very probable. On the whole one is bound to conclude that the Muslims' bark is likely to prove worse than their bite. By setting up a 'Hindu Raj', however, have we not committed a breach of faith towards them? People talk about 'letting the Muslims down', or 'selling them down the river'. Surely there is no justification for such terms. We propose to set up a constitution by which, throughout India, Muslims will be more strongly represented than their members justify. On what better terms can they expect self-government for India? The Muslim leaders demand self-government just as loudly as the Congress. They promise us nothing in exchange for our support of their minority position. Apart from a certain amount of cupboard love (particularly in connection with the army), the Muslims are just as 'anti-British' as the Hindus. The idea of a community of loyal Muslims, contrasting with the seditious Hindus, is a pure myth. Nevertheless while the communal problem remains as bitter as it now is, we must take into account that the establishment of what the Muslims would regard as a Hindu Raj would be fraught with danger. We must also reckon with the possibility that in the long run the unity of India may prove impossible under domestic conditions and that a Muslim north-west may split off and seek its destiny in association with other Muslim countries rather than with South and Central India.

"The strong objection to any present proposed solution of the constitutional problem would seem to point to a policy of caution and delay. The great argument against this is the gradual deterioration of government at the centre. Provincial parliaments and governments, being responsible, attract more and more of the prestige, public interest, and political talent that should belong to the government and parliament of all-India. Initiative, decision and enterprise are sapped in the Civil Service

effort to see, as he is everywhere regarded as a light-weight, a useful man to put up to deny that the Congress will ever touch anything less than complete Independence with the end of a ten-foot pole, while the real strings are being pulled quite differently behind his back.

"I was disappointed to have only a few minutes with Jawaharlal Nehru; an appointment to have a longer talk with him fell through because he had 'flu'. All I can record is that I was constantly told that he had moved distinctly to the right of late. There are two opposing views of his future. Non-Congress conservatives like Sapru say that the mantle of Gandhi will surely fall on him, and that the Congress after the Mahatma's death will not so much split into left and right groups as become a revolutionary left-wing organisation. On the other hand, Congress conservatives like Munshi pooh-pooh the idea of Jawaharlal Nehru's becoming the dictatorial leader of the Congress. He can do nothing now but make speeches about Spain, they say.

"I did however, see other representatives of the Congress Left, like Masani and Purushottam Trikumdas, prominent members of the Congress Socialist Party; these are the Stafford Cripps of Indian politics, the well-to-do intellectual socialists, not men of the people. The strength of their movement appears to lie in Bihar and the U.P. a fact that illustrates its primarily agrarian nature. Those provinces are also the home of the Kisan Sabha (Peasant League), of whose leaders I saw only Professor Ranga, another of the intelligensia, full of words and enthusiasm. Dr. Ambedkar, the leader of the untouchables and of the Independent Labour Party, gave me a very different view, as he is strongly anti-Congress, regarding it as at heart an upper-class, caste Hindu organisation (in which he is of course quite right).

"Of the Muslim League, apart from provincial Ministers, I saw Jinnah, a conceited person afraid that events may lose him the power that he craves.

....

The resistance of the States would not, I believe, be a serious matter. Either they would acquiesce in the grant of those terms to the Congress — they might indeed be a party to them — or they would have the alternative of standing aside and refusing to come in. This refusal is dangerous from the

SIR HARRY HODGSON'S REPORT

Sir Harry Hodgson of the Round Table spent a month in India in December-January 1938-39, and he submitted his confidential report to the Round Table on 6th January, 1939. His report gave an excellent background and penetrating analysis of India and is worthwhile reproducing in full. His report is important because he later came to New Delhi as Special Official to the Viceroy and Governor-General on Reforms :

"After a month in India I cannot pose as an expert on its problems but I used that month to fairly good advantage in learning what I could from spokesmen of different groups and interests. I spent some days in each of the three provinces of Bengal, Punjab and Bombay, and over a week in Delhi and I had a day in Baroda State on my way from Delhi to Bombay. The Viceroy was inaccessible on a winter tour to Nepal and elsewhere, but I made a special journey to Wardha to see that other Governor-General of India, Mahatma Gandhiji in his Ashram at Shegaon.

"In each of the three provinces that I visited I saw several Ministers, of whom the most notable were Sir Sikandar Hyat Khan, the premier of the Punjab, probably the most powerful and certainly, by all my direct and indirect evidence, the most common-sensible of the Muslim leaders, head of the only steady and substantial anti-Congress provincial government in the country; and Mr. K. M. Munshi, Home Member in Bombay, a prime example of a thief set to catch a thief, since even Tory Europeans speak with admiring awe of his repressive handling of Communists and the like agitators. Of the National Congress leaders I saw, among others, Vallabhbhai Patel, who is generally regarded as driving his authority mainly from the influence he has with Gandhi; Bhulabhai Desai, another suggested candidate for the Federal Prime-ministership (he hinted enough for me to realise that he has allowed himself to conceive that ambition), Satyamurti, a good representative of the Right-wing Congressmen, anxious to see a competent job of Governmentdom, within the limits of his nationalism and his class outlook, and of course his caste and communal outlook also. Subhas Bose, the present President of the Congress, I made no special

correspondence with Jinnah. On April 6, 1938, he wrote to Jinnah:

"Obviously, the Muslim League is an important communal organisation and we deal with it as such." But Nehru was not prepared to treat the Muslim League as the sole representative of the Muslims.

A week later, Jinnah replied: "It seems to me that you cannot even accurately understand my letter ... Your tone and language again display the same arrogance and militant spirit, as if the Congress is the sovereign power ... I may add that, in my opinion, as I have publicly stated so often, unless the Congress recognises the Muslim League on a footing of complete equality and is prepared as such to negotiate for a Hindu-Muslim settlement, we shall have to wait and depend upon our 'inherent strength' which will 'determine the measure of importance or distinction' it possesses. Having regard to your mentality, it is really difficult for me to make you understand the position any further."

Thus Jinnah and Nehru carried on an acrimonious correspondence leading to nowhere and same can be said about the equally acrimonious correspondence between Gandhiji and Jinnah. It was all beating the air.

In order to find out exactly what was passing in Jinnah's mind I went to meet him and asked him what he thought of the political situation. His answer was amazing. He said "What do you mean? How can you ask me such a question? Do you mean to say that when the British Prime Minister is sitting in his room, a French man or a German or a Russian could just walk in and ask him, "What do you think of the political situation and do you mean to say the British Prime Minister would reply to that question?" I told Jinnah that I had not come as a leader or representative of the Hindus or even as a Hindu. I was just talking to him informally as an old friend and saw no harm in both of us thinking aloud. To this Jinnah said that he refused to discuss the political situation with any Hindu. I suggested his talking to Sir Purushottamdas. He said he would not, because Sir Purushottamdas had no influence on the Hindu opinion. He said that neither Jawaharlal nor Subhas Bose had any influence but that Gandhiji and Vallabhbhai had a negative influence in the sense that they could do harm and could not and would not do any good. Evidently all was not well with Jinnah and I told him that bitterness would not help anybody or any cause. The Congress had rubbed him the wrong way and he would never forgive them for this. I felt very sorry for Jinnah. He was a sick and unhappy man, completely isolated and friendless.

Kanji Dwarkadas

JINNAH

"The Congress has rejected the new constitution and declared that a constitution for India which can be accepted by the people, must be based on independence and can only be framed by the people themselves by means of a Consti-tuent Assembly, without interference by a foreign authority. Adhering to this policy of rejection, the Congress has, however, permitted the formation in provinces of Congress Ministries with a view to strengthen the nation in its struggle for independence. In regard to the proposed Federation, no such considerations apply even provisionally or for a period, and the imposition of this Fede-ration will do grave injury to India and tighten the bonds whic' hold her in subjection to imperialist domination. This scheme of Federation excludes from the sphere of responsibility vital func-tions of government.

The Congress is not opposed to the idea of Federation but a real Federation must, even apart from the question of responsi-bility, consist of free units enjoying more or less the same measure of freedom and civil liberty and representation by the democratic process of election. The Indian States participating in the Fede-ration should approximate to the provinces in the establishment of representative institutions and responsible government, civil liberties and method of election to the Federal Houses. Other-wise, the Federation as it is now contemplated, will instead of building up Indian unity, encourage separatist tendencies and involve the States in internal and external conflicts.

"The Congress, therefore, reiterates its condemnation of the proposed Federal scheme and calls upon the provincial and local Congress Committees and the people generally, as well as the Provincial Governments and Ministries to prevent its inaugu-ration. In the event of an attempt being made to impose it, despite the declared will of the people such an attempt must be combated in every way and the Provincial Governments and Ministries must refuse to co-operate with it. In case such a contingency arises, the All India Congress Committee is autho-rised and directed to determine the line of action to be pursued in this regard." (Congress Resolution)

After Haripura, Nehru carried on, on behalf of the Congress,

CONTENTS

1993

Price Rs. 75/-

Printed by Liberty Art Press (Proprieters Maktaba Jamia Ltd.) 1528 Pataudi House, Daryaganj, New Delhi and published by Khuda Bakhsh Oriental Public Library, Patna.

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

87 - 89

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna

KHUDA BAKHSH LIBRARY

JOURNAL

87 - 89

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
PATNA